



ڈاکٹر سلیم اختر

عجب سیر تھی!

سفرنامہ...

بھارت، ماریشس، ڈنمارک اور چین

عجب سیر تھی!

سفرنامہ...

بھارت، ماریشس، ڈنمارک اور چین

ڈاکٹر سلیم اختر

سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

انتساب

ڈاکٹر مظفر عباس کے نام

910.4 Saleem Akhtar, Dr.
Ajab Sair Thi!/ Dr. Saleem Akhtar.-
Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2014.
192pp.
1. Travelogue. I. Title.

2014ء
افضال احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2749-6
ISBN-13: 978-969-35-2749-0

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com



ترتیب

بھارت (1988ء)

دہلی

ریل گاڑی رینگتی ہوئی ریلوے سٹیشن میں داخل ہو رہی ہے، میں کھڑکی سے باہر سر نکال کر منظر کا جائزہ لیتا ہوں۔ سرخ لباس میں قلیوں کی قطاریں، خوانچے والے، دیواروں پر تاریخی مقامات اور قدرتی مناظر کے رنگین پوسٹر، گاڑی رکتی ہے اور میں ڈبے سے باہر آتا ہوں لیکن اترنے سے پہلے ڈبے پر الوداعی نظر ڈالنی نہیں بھولتا جہاں ایک کنواری کنیا سبز ساڑھی کے سنہری پلو سے بھیگی آنکھوں سے کاجل صاف کر رہی ہے۔ سانولی پیشانی پر بندی کی سرخی سرمئی افق کے پھیلتے سایوں میں ڈوبتے سورج کا منظر پیش کر رہی ہے۔ اس کے والدین، اُس کے پاس آزردہ بیٹھے ہیں۔ میں اسے الوداعی مسکراہٹ سے نوازتا ہوں، وہ کچھ کہنے کو منہ کھولتی ہے مگر ہونٹوں کے کونے کپکپا کر رہ جاتے ہیں اور آنکھوں سے آنسوؤں کا سوتہ پھوٹتا ہے۔ یہ لڑکی مجھ پر ہزار جان سے عاشق ہو گئی ہے اور میں حسبِ عادت اس کا دل توڑ کر جا رہا ہوں۔

ریل گاڑی سے اترتا ہوں تو سارا پلیٹ فارم بھارتی ناریوں سے بھرا نظر آتا ہے۔ اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے رنگوں کی ساڑھیوں میں ملبوس سانولے ماتھوں پر پنکھڑی اک گلاب کی سی بندیا دمک رہی ہیں، کلائیوں میں دھانی بانکیں، جُوڑوں میں پھول اور بالوں میں گجرے۔ سب مجھے دیکھ کر مستی کے عالم میں بھاگتی ہیں، خوشی کے نعرے لگاتی ہیں۔ اب میں ان کے نرغے میں ہوں۔ ان کے جسموں سے خس کے عطر اور جوانی کی مہک آ رہی ہے۔ وہ سب مجھے اپنے گھیرے میں لے لیتی ہیں۔ پُر شباب سینوں سے آنچل ڈھلک رہے ہیں، بازو کنول کے ڈنٹھلوں کی طرح لہرا رہے اور پیٹ میں ناف کا سیاہ موتی چمک رہا ہے۔ وہ سب رقص شروع کر دیتی ہیں۔ میں کنہیا ہوں اور وہ گوپیاں ہیں، میرے ہاتھ میں بانسری نہیں مگر پھر بھی دہلی کا سٹیشن گویا برندا بن میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ان کے ہاتھوں میں پیتل کی چمکتی تھالیاں ہیں جن میں دیپ جل رہے

ہیں، وہ سب میری آرتی اتار رہی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ!!

المیہ، مردِ شریف کا

پیارے قارئین! اگر آپ نے اس اسلوب کے رومانی جذباتی بلکہ ہیجانی سفرنامے کی توقع پر اس تحریر کا مطالعہ شروع کیا ہے تو براہ کرم اپنا قیمتی وقت ضائع مت کیجیے، کہیں اور دستک دیجیے۔ میں تو ایک بے ضرر قلم کار اور خشک مقالات قلم بند کرنے والا نقاد ہوں، لہٰذا میری بھارت یاترا میں آپ کو ایسا مصالحہ (یا پھر گرم مصالحہ) نہیں ملے گا بلکہ میں تو اس مخمصے میں بھی ہوں کہ یہ جو کچھ لکھ رہا ہوں، اسے سفرنامہ کہا بھی جا سکتا ہے یا نہیں۔ شاید یہ رپورتاژ ہو ورنہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ سرے سے کچھ بھی نہ ہو بجز یادوں پر مبنی ایک تاثراتی تحریر کے، لیکن ہوگی سچ۔ جو دیکھا وہی لکھوں گا اور جو محسوس کیا وہی ضبطِ تحریر میں لاؤں گا، تاہم اسے ملزم کا بیانِ حلفی نہ سمجھا جائے کہ سچ کا تو کنارا جھوٹ ہے مگر جھوٹ بحرِ زخار ہے۔

ہمارے شاعر دوست ہر چوتھے دن بھارت پہنچے ہوتے ہیں یا مشاعروں میں جا رہے ہوتے ہیں یا مشاعروں سے آ رہے ہوتے ہیں ورنہ جانے کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ ایک ہم تھے کہ جن کا یہ حال تھا:

منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم

بھئی کس کا منہ؟ شاعروں کا؟ جی نہیں! اپنا کہ شاعر کیوں نہ بنے، پہلے شاعر پیدا ہوتے تھے اب شاعر بنتے ہیں۔ ہم اگرچہ نقاد پیدا ہوئے تھے مگر ہم شاعر بن تو سکتے ہیں۔ ایک عزیز از جان دوست سے کہا ''یار! میں نے تمہاری ہر کتاب پر دیباچہ یا فلیپ لکھا، جن کتابوں پر یہ نہ لکھے ان کے بارے میں کتابوں کی تقریبات میں توصیفی مقالات لکھے للہ! میری خدمات کے صلے میں پانچ غزلیں مجھے بھی دے دو تاکہ یہ میرے لیے کھل جا سم سم قسم کی چیز ثابت ہوں۔'' یہ سن کر جان سے پیارا دوست سخت ناراض ہوا۔ کہنے لگا ان پانچ غزلوں پر تو میرا کاروبار چلتا ہے، تم اچھے یار مار ہو کہ میرے پیٹ پر لات مارتے ہو۔ لیجیے غزلوں کے ساتھ ساتھ دوست بھی ہاتھ سے گیا لیکن مجھے معلوم ہے کہ یہ دوست زیادہ دیر تک ہاتھ سے نہیں جا سکے گا۔ سنا ہے اس کی نئی کتاب زیرِ طبع ہے۔ نقاد اور شاعر کی دوستی بھی عجیب کاغذی پھول ہوتی ہے!

صاحب! قصہ مختصر! کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب سے پاکستان بنا تھا، ہم بھارت نہ جا سکے، حالانکہ بچپن انبالہ، بمبئی اور پونا میں گزرا تھا مگر کبھی بھارت جانے کی صورت نہ بنی، لہٰذا جب پروفیسر

نذیر احمد صاحب کی طرف سے غالب انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) کے بین الاقوامی غالب سیمینار میں شرکت کا دعوت نامہ ملا تو دلی مسرت ہوئی۔ یہ سیمینار دسمبر میں ہونا تھا اور دعوت نامہ دو تین ماہ پہلے ملا تھا اس لیے اس دوران میں رخصت سے وابستہ دفتری امور نمٹانے میں خاصہ وقت تھا۔ ہم کیونکہ پاکستان کے پرامن شہری ہیں، اتنے پرامن کہ پولیس کے ہاتھوں چالان کے خوف سے گاڑی چلانی نہ سیکھی، تعلیم کے معزز پیشے سے وابستہ ہیں۔ ملک کے مشہور ترین کالج میں پڑھاتے ہیں۔ شرفاء میں اُٹھتے بیٹھتے ہیں اور تحریر کی وجہ سے چار آدمی نام آشنا بھی ہیں، اس لیے ہمارے لیے باہر جانا ہفت خواں طے کرنے سے کم نہیں۔ ہاں اگر ہم سمگلر ہوتے، بلیک مارکیٹیئر ہوتے، ذخیرہ اندوز ہوتے یا مجرم ہوتے تو بارڈر کراس کرنے کے لیے ہمیں ہر طرح کی سہولت حاصل ہوتی بلکہ پولیس، کسٹم اور دیگر حکام خوشدلی سے ہر طرح کا تعاون کرتے لیکن اس کے برعکس معاملہ تھا ڈاکٹر پروفیسر سلیم اختر کا۔ ان تین ماہ میں ہم پر جو بیتی اس الم نامے کو سفرنامہ کا حصہ بنانے کا کیا فائدہ؟ لیکن یہ بھی ہے کہ بعض پرخلوص احباب کی مدد سے کٹھن مراحل بخیر وخوبی طے بھی ہو گئے جیسے امجد اسلام امجد، محترم تقی الدین پال (ہوم ڈیپارٹمنٹ) کے پاس لے گیا تو انہیں علم دوست پایا۔ وہ میرے نام اور کام سے بھی واقف نکلے اور وہ! این او سی جو چاند کے غاروں میں بند نظر آتا تھا، انہوں نے پانچ منٹ کے اندر اندر مجھے تھما دیا۔ کتنی کتنی مالیت کے اسٹامپ پیپرز پر کیسے کیسے بیان حلفی دیئے، کیسے کیسے فارم اور پروفارمے پُر کیے، کتنی عرضیاں، کتنی تصاویر، تصدیق نامے اور مجسٹریٹوں کے کتنے قواعد وضوابط۔ میں اب حیرت سے سوچتا ہوں کہ یہ سب کیسے ہو گیا اور یار لوگ کیسے تین دن کے نوٹس پر چلے جاتے ہیں یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں پہلی مرتبہ زیرِ دام آیا تھا، اس لیے مجھے یہ سب اعصاب شکن محسوس ہوا۔

ویزے کا ہفت خواں

بھارت کا ویزا لینا بھی آسان کام نہیں۔ اس کا اندازہ مجھے سفارت خانے پہنچ کر ہوا۔ مجھے تو یاروں نے یہ تاثر دیا تھا کہ میں جیسے ہی دروازے پر پہنچوں گا مجھے اکیس توپوں کی سلامی دی جائے گی اور عزت مآب سفیر میرے چرن چھو کر کہیں گے کہ ہم تو تشریف آوری کے کب سے منتظر کھڑے ہیں، دراصل پاکستان اور بھارت کے تعلقات جواب تک سدھر نہیں سکے تو اس کی بنیادی وجہ مسئلہ کشمیر نہیں بلکہ ہمارا بھارت تشریف نہ لے جانا ہے۔ الغرض! وہ کچھ اس قسم کی باغ و بہار تقریر کریں گے اور مرادآبادی کام کی منقش چاندی کی طشتری میں ویزا رکھ کر ہماری خدمت میں پیش کریں گے، کیونکہ ہم ایک بین الاقوامی سیمینار میں پاکستان کے مندوب کی حیثیت سے جا رہے ہیں لیکن ہم اس حسن سلوک

سے اس لیے محروم رہے کہ ایک راز دار نے ہمارے کان میں پھونک دیا کہ اگر مرکزی دروازے سے سفارت خانے کے اندر داخل ہو گئے تو خفیہ والے پیچھے لگ جائیں گے۔ یہ سنتے ہی ہمارے اوسان خطا ہو گئے کہ اب ہمارے پاس خطا کرنے کو صرف اوسان ہی بچے تھے۔

بھارت کا نیا سفارت خانہ کئی ایکڑ پر پھیلی ایک وسیع اور پر شکوہ عمارت میں ہے۔ ویزا لینے والوں کے لیے سفارت خانے کی پشت پر انتظامات کیے گئے ہیں۔ میں جب صبح نو بجے پہنچا تو کم از کم پچاس مردوں اور عورتوں کی قطار لگی دیکھی۔ چند غیر ملکی الگ کھڑے تھے، معلوم ہوا کہ لوگ تو اذانوں کے وقت سے آ کر بیٹھ جاتے ہیں تا کہ جلد فراغت حاصل کر سکیں (نئی دہلی میں پاکستانی سفارت خانے کے سامنے بھی ملتا جلتا منظر ہوتا ہے) میں نے پہرے پر کھڑے پاکستانی سپاہی سے مدعا بیان کیا تو اس نے غیر ملکیوں کی ٹولی کی طرف اشارہ کر دیا۔ چنانچہ میں بھی بطور غیر ملکی دروازہ کھلتے ہی اندر چلا گیا، سب کالا لوگ قطار ہی میں باہر کھڑا رہ گیا۔

سفارت خانہ میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ عملہ اور باہر کے لوگوں میں ضروری بات چیت کے علاوہ اور کسی طرح کا تعلق قائم نہ ہو سکے۔ ملگجے شیشوں کے پیچھے وہ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں کا منظر پیش کرتے ہیں۔ اگر خوبصورت ناریاں (یا کم از کم ساڑھیاں) ہی ہوتیں تو یہ منظر بھی خوش منظر ثابت ہو سکتا تھا مگر وہاں تو سب کے سب ڈشکرے تھے۔ بہر حال تھے معقول، میری بات سنی اور تین بجے آنے کو کہا اور یہ بہت بڑی بات تھی کیونکہ باقی سب کو پانچ بجے کے بعد آنے کو کہا جا رہا تھا۔

درمیان کا وقت ہم نے ناصر زیدی کے پاس گزارا جو ان دنوں صدر صاحب کا تقریر نویس تھا اور یار باش اور مہمان نواز دوست ہے۔ مسعود قریشی اور اعظمی صاحب بھی وہیں ہوتے ہیں اور اسی دن مظفر علی سید کا کنٹریکٹ بھی ختم ہو رہا تھا، خوب گپ شپ رہی۔

تین بجے سفارت خانے کی کھڑکی پر پہنچا تو ویزا مل گیا۔ جی خوش ہو گیا، واپس جانے کے لیے ویگن کے انتظار میں کھڑا تھا کہ ایک افریقی نے پاس آ کر انگریزی میں پوچھا:

''فرانسیسی بول لیتے ہو؟''

میں چونکہ مستنصر حسین تارڑ نہیں، اس لیے میں نے نفی میں جواب دیا۔

پھر پوچھا ''انگریزی؟''

عرض کیا ''واجبی سی۔''

پھر دریافت کیا ''اردو؟''

ہماری طبیعت خوش ہو گئی کیونکہ اب ہم اپنی پچ پر تھے۔ میں نے اردو میں پوچھا ''کہاں سے

آنا ہوا؟''

جواب ملا ''ایوری کوسٹ سے۔''

''اور یہ اردو کہاں سے سیکھی؟''

جواب ملا ''ربوہ سے۔''

تفصیلی گفتگو کے بعد انکشاف ہوا کہ یہ وہاں سے اعلیٰ ''تعلیم'' کے لیے ربوہ آئے ہوئے ہیں۔ دو تین برس سے وہیں مقیم ہیں اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد تبلیغی سرگرمیوں میں حصہ لیں گے۔ اب تفریح کے لیے بھارت جا رہے ہیں۔

چلے پیا پردیس

ویزا ملنے کا مطلب تھا کہ اب بھارت جانا طے ہو گیا ہے۔ گھر میں بیوی بچوں نے ویزا دیکھا، چوما، آنکھوں سے لگایا اور خوش ہونے کے ساتھ ساتھ متعجب بھی ہوئے کہ میں ایک دن میں ویزا لے آیا۔

اب تجربہ کار مسافر احباب نے مشورے دینے شروع کیے۔ ڈاکٹر آغا سہیل نے کہا ''وہاں اگر رکشے پر بیٹھو تو مسلمان کے رکشے یا ٹیکسی میں نہ بیٹھنا بلکہ سکھ کو ترجیح دینا، یہ معقول لوگ ہوتے ہیں۔'' فارن ایکسچینج کی بات ہوئی تو عطاء الحق قاسمی نے بتایا کہ ''بینکوں میں دھکے کھانے کی کیا ضرورت ہے، انارکلی میں کرنسی کا تبادلہ کرا لو'' بلکہ امجد اسلام امجد نے تو یہ پیشکش بھی کی کہ ''میرے پاس جو خفیہ زر مبادلہ ہے ضرورت پڑے تو وہ لے سکتے ہو۔'' حسن رضوی نے بتایا کہ ''کیمرے میں فلم ڈال کر نہ لے جانا کیونکہ ایکسرے مشین سے چیکنگ میں یہ خراب ہو جاتی ہے۔'' اب جب سب خوب مشورے دے رہے تھے تو ہماری بیگم صاحبہ کیوں پیچھے رہ جاتیں، فرمانے لگیں ''کسٹم پر چیکنگ ہو تو گھبرانا نہیں بلکہ اعتماد سے بات کرنا۔'' جبکہ بچوں کے مشورے فرمائشوں کی صورت میں تھے اور پھر ایک شام دیکھا تو ڈاکٹر طاہر تونسوی بنفس نفیس چلے آ رہے ہیں، پوچھا ''بھئی! تم کیسے؟''

بولے ''آپ کو رخصت کرنے آئے ہیں۔''

یہ تو سنا تھا کہ حج پر جانے والوں کو کراچی تک رخصت کرنے چلے جاتے ہیں لیکن طاہر تونسوی کے اظہارِ محبت کے انداز میں خاصہ تنوع ملتا ہے۔ اس کے آنے سے مجھے تقویت ہوئی کہ اب جانے سے کوئی نہیں روک سکتا کیونکہ وہ تو پاسپورٹ اور ویزے کے بغیر بھی مجھے بارڈر

کراس کرا سکتا ہے۔

لیکن عملی طور پر صرف کشور ناہید کام آئی جب اسے معلوم ہوا کہ میں دہلی جا رہا ہوں تو اس نے بتایا کہ اسلام آباد سے منیر احمد شیخ بھی جا رہے ہیں اور ہم دونوں کی 15 دسمبر کی ایک ہی فلائٹ ہے۔ اس خبر بلکہ خوش خبری سے میں بہت خوش ہوا۔ منیر احمد شیخ پاکستانی سفارت خانے میں دواڑھائی برس گزار چکے ہیں اس لیے ان کے لیے دہلی اجنبی نہ تھی جبکہ میرے لیے تو کراچی بھی پیرس کی مانند ہے۔ طے یہ پایا کہ ہم 12 بجے تک کشور ناہید کے دفتر میں جمع ہو جائیں اور پھر وہاں سے اکٹھے نکلیں۔

کشور ناہید ہمہ وقت میزبان خاتون ہے چنانچہ اس نے ہم فقروں کے لیے کھانے کا بھی اہتمام کر رکھا تھا منیر احمد شیخ تو کھانے لگے مگر میں نے انکار کر دیا۔

''میں تو ہوائی جہاز پر ایئر ہوسٹس کے ہاتھ سے کھانا کھاؤں گا، تمہارے آلو گوشت سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔''

اس پر وہ بولی ''چالیس منٹ کی فلائٹ میں تو ڈھنگ سے چائے بھی نہ پی سکو گے لہٰذا اس کو غنیمت جانو اور چپکے سے کھالو۔'' ساتھ ہی اس نے آنکھیں نکالیں (اپنی) میں نے ڈر کر نوالہ توڑ لیا۔ تندور کی گرم گرم روٹیوں اور لذیذ سالن نے خوب مزا دیا، ویسے بھی کشور ناہید جتنی چٹ پٹی گفتگو کرتی ہے اتنے ہی چٹ پٹے کھانے بھی پکاتی ہے۔ جب تک ہم کھانا ختم کرتے اس سدا مستعد خاتون نے ایئر پورٹ پر کسی بڑے افسر کو فون کر دیا کہ یہ دو پینڈو آ رہے ہیں انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔

اس طلسمی ٹیلی فون کا یہ اثر ہوا کہ اندر داخل ہوتے ہی ایک صاحب ملے جن کے ہاتھ میں چٹ پر ہم دونوں کے نام لکھے تھے اور اس دن اندازہ ہوا کہ وی آئی پی ٹریٹمنٹ کسے کہتے ہیں۔ چند منٹ کے اندر فارغ ہو کر ہم ڈیپارچر لاؤنج میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

منیر احمد شیخ اچھی کمپنی ثابت ہوئے، کتابی مطالعہ بھی رہا اور دنیا کا عملی تجربہ بھی۔ یوں بھی دنیا دیکھ رکھی ہے چنانچہ ان سے پر لطف گفتگو ہی بلکہ ان دو ہفتوں میں بہت اچھے دوست بن گئے ورنہ ہمارا مشاہدہ تو یہ ہے کہ ادیب کہیں باہر گئے تو دوست تھے مگر واپس آئے تو دشمن بن کر (البتہ امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی کی استثنائی مثال ہے) اسی طرح نہ مجھے منیر احمد شیخ میں کیڑے نکالنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور نہ انہیں مجھ میں سے کیڑے نکالنے کی۔ (افسوس چند برس بعد منیر احمد شیخ کا انتقال ہو گیا۔)

پینڈو

اور اب ہم ہوائی جہاز میں تھے۔

پی آئی اے کی اس انٹرنیشنل فلائٹ اور ڈومیسٹک فلائٹ میں کوئی خاص فرق محسوس نہ ہوا، وہی مسکراہٹ نا آشنا ایئر ہوسٹس، وہی گتے کی گلاسیوں میں چلو بھر کولڈ ڈرنک اور وہی...... مگر چھوڑیئے اس قصے کو۔

جہاز کے پائلٹ نے اعلان کیا کہ ٹیک آف کے دو منٹ بعد ہم امرتسر پر سے گزر چکے تھے۔ میں اپنی گھڑی تیس منٹ آگے کر لیتا ہوں۔ عجب احساس ہوتا ہے یہ ہاتھ کی چند جنبشوں سے گھڑی کی سوئیاں آگے کرنے کا میکانکی عمل نہ تھا بلکہ ایک دنیا سے دوسری دنیا میں لے جانے والی وقت کی جست تھی۔ میں زندگی میں پہلی مرتبہ پاکستان سے باہر جا رہا تھا اور عجیب سنسنی خیز احساسات تھے کہ میں اب بھارتی فضا میں محو پرواز ہوں اور اب تیس منٹ آگے گھڑی اس حقیقت کی شاہد تھی۔ میں کھڑکی سے باہر جھانکتا ہوں، نیلے آسمان پر بادلوں کی جھالر سج رہی تھی۔

جہاز لینڈنگ کے لیے قوس بنا رہا تھا، میں کھڑکی سے جھانکتا ہوں۔ میں اگرچہ ورٹیگو (Vertigo) کی وجہ سے بلندی سے نیچے نہیں جھانک سکتا، سر چکرانے اور طبیعت متلانے لگتی ہے لیکن میں ہر قیمت پر دہلی کی پہلی جھلک دیکھنا چاہتا ہوں۔ سر کے چکر بعد میں ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ نیچے دہلی کا گرد و نواح اجاگر ہوتا جا رہا ہے۔ میری خواہش ہے کہ اے کاش میں فضا سے قطب مینار، ہمایوں کا مقبرہ، لال قلعہ یا ایسی ہی کسی اور مشہور عمارت کو دیکھوں۔ راولپنڈی سے آنے والے مسافر جہانگیر کا مقبرہ، بادشاہی مسجد اور قلعہ کا نظارہ کرتے ہیں لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ عمارات اس راستہ کی طرف نہیں چنانچہ تاریخی عمارات کے بجائے سرسوں کے کھیت اور جدید فلیٹ نظر آئے جو سرما میں سہ پہر کی دھوپ میں چمک رہے تھے۔

اگر اس وقت کوئی میری تصویر اتارتا تو چہرہ پر وہی تاثرات ہوتے جو اس پینڈو لڑکے کے چہرہ پر ہوتے ہیں جو پہلی مرتبہ ریل پر سوار ہو کر شہر میں وارد ہوتا ہے۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ میں نے آنکھوں پر سے موٹے شیشوں کی عینک، سفید بالوں اور ''ڈاکٹری'' اور ''پروفیسری'' کے باوجود اپنے اندر تالیاں بجانے اور کھلکھلا کر ہنسنے والے پینڈو لڑکے کو شہری بنانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اسے بڑے لاڈ اور پیار سے رکھا ہے۔

جہاز لینڈ کرنے کو ہے اور دور کا منظر جیسے کسی زوم لینز کے ذریعے ایک دم کلوز اپ میں آ جاتا ہے۔ ہم لینڈ کر رہے ہیں اور اب ہم لینڈ کر چکے ہیں۔

مسافر نشستوں سے اٹھ کر سامان سنبھال رہے ہیں۔ دروازے پر مسکراہٹ نا آشنا ایئر ہوسٹس میکانکی انداز میں مسافروں کو خدا حافظ کہہ رہی ہے۔

اس کے بعد یہ کہاں جائے گی؟ کیا کرے گی؟ دہلی میں بھلا کب تک یہ قطب مینار دیکھ کر گزارا کر سکتی ہے؟ کیا اس کا کوئی بوائے فرینڈ ہے؟ نہیں تو کیوں نہیں؟ میرے اندر کا افسانہ نگار ایسی ہی فضول باتیں سوچتا ہے۔ کتنی بری بات ہے یہ!

ایئر پورٹ

بھارت کی ہوا میں پہلی سانس!

لاؤنج میں آتے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ میں اپنے چہرے کی رنگت اور زبان کے اشتراک کے باوجود اب ایک نئے ملک میں ہوں۔ ہمارے لاؤنج میں کلمہ شریف اور آیات لکھی ہوتی ہیں اور نماز کے لیے جگہ مخصوص ہوتی ہے مگر یہاں مورتیاں تھیں اور معلوم نہیں یہ دیویاں تھیں یا محض مورتیاں، مگر تھیں بہت سیکسی۔ بھرے بھرے لب، پھیلے کولھوں پر پتلی کمر اور انگیا سے باہر اڈتی چھاتیاں، یہ جنوبی ہند کے فن کا کمال ہوگا کیونکہ وہاں کے موتی کار ہی ایسی سیکسی عورتیں پتھر یا دھات کے قالب میں یوں ڈھالتے تھے کہ مجسمہ ساز کے اندر کا پیگمیلین بیدار ہو جائے، وہ جو بعض پجاریوں کو مورتیوں سے عشق ہو جاتا ہے تو ایسی مورتیاں دیکھ کر وجہ سمجھ میں آ جاتی ہے۔ ہماری شاعری میں بت، صنم اور مورتی کا جو اتنا چرچا ملتا ہے تو وہ بھی اسی کارن، اگر کھجوراہا اور کونارک کے مندر دیکھیں تو ہندو دھرم میں ''متھن'' کی رمز بھی سمجھ میں آ جاتی ہے اور راجندر سنگھ بیدی کے شاہکار افسانہ ''متھن'' کی معنویت بھی۔

یہاں منیر احمد شیخ کی سفارت خانے کی ملازمت کام آئی کہ استقبال کو عارف ملک (پریس اتاشی) موجود تھے۔ ہم دونوں سے ملے، ہمارے پاسپورٹ لیے اور یہ جا وہ جا۔ ہم دونوں ایک طرف اطمینان سے بیٹھ گئے۔ اس وقت اتفاق سے موضوع گفتگو گورنمنٹ کالج لاہور تھا، ہمارے ساتھ ایک اور صاحب بھی بیٹھے تھے جن کی طرف ہم نے اب تک توجہ ہی نہ دی تھی، وہ اچانک بولے ''آپ گورنمنٹ کالج لاہور کی بات کر رہے ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''تو آپ لوگ لاہور سے آئے ہیں؟''

''جی ہاں۔'' اور ہم دونوں نے اپنا اپنا تعارف کرایا۔

خوش ہو کے بتانے لگے، میں بھی راوین ہوں۔ قیام پاکستان سے پہلے کے اساتذہ اور پرنسپل کی باتیں بتانے لگے، یہی نہیں بلکہ چند منٹوں کے اندر اندر انہوں نے اپنی پوری لائف ہسٹری بیان کر دی۔ گورنمنٹ کالج کے ذکر نے انہیں جذباتی بنا دیا تھا۔

یہ میرا تجربہ ہے کہ گورنمنٹ کالج لاہور کے قدیم طلبہ اور اساتذہ کی بے حد عزت ہوتی ہے اور بھارت میں مجھے ایسے کئی لوگ ملے جنہوں نے فخریہ بتایا کہ وہ یا ان کے کوئی عزیز اس عظیم درسگاہ کے طالب علم رہ چکے ہیں۔ اس ضمن میں مجھے ظفر پیامی (دیوان بریندر ناتھ) کی خوبصورت بات یاد آ رہی ہے۔ ایک تقریب میں انہوں نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں صرف دو طبقات ملتے ہیں۔ ایک وہ خوش قسمت جن کا گورنمنٹ کالج لاہور سے تعلق ہے اور دوسرے وہ بد قسمت جن کا اس کالج سے کوئی تعلق نہیں! اور یہی وہ مواقع تھے جب فخر سے میرا سینہ پھول جاتا کہ میں بھی اس کالج سے وابستہ ہوں۔

میں گورنمنٹ کالج کی محبت میں خاصہ آگے نکل گیا۔ بہر حال عارف ملک صاحب کی منصبی حیثیت کام آئی اور کسٹم کلیئرنس اور دستاویزات کی جانچ کے لیے لمبی قطار میں لگنے کے برعکس ہم جلد ہی ایئر پورٹ سے باہر آ گئے جہاں ڈائریکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ ڈاکٹر محمد ایوب تاباں اور ڈپٹی ڈائریکٹر شاہد ماہلی استقبال کو موجود تھے۔ دونوں بہت محبت سے ملے۔ منیر احمد شیخ کی رہائش کا الگ انتظام تھا، مجھے ہوٹل پہنچا دیا گیا۔

007

یہ ہوٹل عجیب تضادات کا مجموعہ ثابت ہوا۔ یہاں ہر طرح کی شراب تو پینے کو مل سکتی تھی مگر کھانے کو گوشت نہیں یعنی یہ سبزی خوروں کا ہوٹل تھا۔ رات کے کھانے کے دوران فلور شو ہوتا یعنی بھارتی فلموں کے رواج کے مطابق یہاں بھی ایک کنیا گیت گاتی لیکن سلیقے کے ساتھ۔ وہ تمام کرتب نہ دکھاتی جو سری دیوی یا ڈمپل کپاڈیہ دکھانے کو بے چین رہتی ہیں۔ یہ ہوٹل ٹورازم کے زیر اہتمام تھا اور اس میں وہ جملہ خوبیاں پائی جاتی تھیں جو سرکاری انتظامات کے باعث ہوا کرتی ہیں۔

بیسن کی ٹونٹی لیک کرتی تھی، ایک لطیفہ یہ تھا کہ کمرے کی تمام بتیاں ایک ہی سوئچ سے روشن ہوتی تھیں۔ اگرچہ میرا ملک نہ تھا لیکن واسا اور واپڈا کے بھاری بل ادا کر کے ہم اتنے خوفزدہ ہیں کہ قطرہ قطرہ کا بھی حساب رکھتے ہیں اس لیے بہتے پانی اور غیر ضروری طور پر کمرہ کی بتیوں کے جلنے سے بہت الجھن ہوتی، خیر یہ سب تو بے ضرر باتیں ہیں، اصل تشویش تو اس وقت ہوئی جب یہ معلوم ہوا کہ یہی وہ ہوٹل ہے جہاں دو ہفتہ قبل ایک پاکستانی سفارت کار جاسوسی کے مبینہ الزام میں پکڑا گیا اور بری طرح زدوکوب کرنے کے بعد واپس بھجوایا گیا۔ اس احساس نے کہ میں بھی اسی ہوٹل میں قیام پذیر ہوں، میرے زیر مطالعہ ایسے تمام جاسوسی ناولوں کے پلاٹ اور کردار زندہ کر دیئے اور چانک میں نے

خود کو 007 محسوس کیا۔ میں اس احساس سے بڑا تھرل محسوس کرتا کہ میرا ٹیلی فون ٹیپ ہو رہا ہوگا، ملحقہ کمرہ میں سیکرٹ ایجنٹ میرے ملاقاتیوں پر نگاہ رکھتے ہوں گے (لطیفہ یہ ہے کہ ملحق کمرے میں بنگلہ دیش کے پروفیسر کلیم سہسرامی مع بیگم اور بیٹی مقیم تھے) پھر میں تصور کرتا کہ میری عدم موجودگی میں میرے کمرہ کی تلاشی لی جا رہی ہے اور وہ کتابوں اور رسالوں کو دیکھ کر پریشان ہو رہے ہیں کہ یہ کس قسم کا پاکستانی جاسوس ہے جو منی ایچر کیمروں اور ٹیپ ریکارڈر کے بجائے کتابوں کی صورت میں کئی کلو ردّی اٹھا لایا ہے۔ اس کے علاوہ دو جوڑے کپڑے تھے اور باقی کچھ بھی نہ تھا چنانچہ میں نے اپنے اٹیچی کیس کو کبھی تالہ تک بھی نہ لگایا، لو بھئی دیکھ لو جو چاہو۔

وہ ہوئے ہم کلام

فون کی گھنٹی بجتی ہے۔

مجھے ہوٹل میں آئے صرف دو گھنٹے ہوئے ہیں۔ یہ کون ہو سکتا ہے؟

''ہیلو۔''

''ڈاکٹر سلیم اختر؟''

''جی میں بول رہا ہوں۔''

''ایم قمرالدین ایڈووکیٹ آپ سے ہم کلام ہے۔''

قمرالدین صاحب تیز لہجہ میں گفتگو کر رہے تھے۔ میری متعدد کتابیں ان کے پاس تھیں اور وہ ''شعور اور لاشعور کا شاعر: غالب'' کے متلاشی تھے۔ میں نہ عمران خان ہوں اور نہ امیتابھ بچن حتیٰ کہ خوبصورت یا مقبول شاعر بھی نہیں محض ایک ڈل نقاد ہوں جبکہ قمرالدین صاحب بتا رہے تھے کہ انہوں نے میری آمد کے بارے میں منتظمین سے مسلسل رابطہ رکھا ہوا تھا اور جیسے ہی انہیں ہوٹل میں پہنچنے کی اطلاع ملی، انہوں نے ملاقات کے لیے فون کر دیا۔ ملاقات کے لیے آنا چاہتے تھے، مع بیگم صاحبہ!

میں نے کہا، بسر و چشم۔

تھوڑی دیر بعد تشریف لے آئے۔ میرے لیے ایک خوبصورت کتاب کا تحفہ لائے، گپ شپ کی، ایک پارٹی پر چلنے کو کہا۔ میں نے معذرت کر لی۔ یہ میں نے خودستائی کے طور پر نہیں لکھا بلکہ صرف اس امر کے اظہار کے طور پر کہ بعض اوقات غیر متوقع طور پر ایسے مسافر نواز مل جاتے ہیں کہ مسافر حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ قمرالدین صاحب بڑے خلیق اور محبت کرنے والے مخلص دوست ثابت ہوئے۔ ان کی بیگم صاحبہ نہایت سلجھی ہوئی نستعلیق اور کم گو خاتون تھیں۔ دونوں سپریم کورٹ کے

معروف وکیلوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اگلے دو ہفتوں میں قمرالدین صاحب کی وضع داری اور خلوص کے متعدد مظاہرے دیکھنے کو ملے بلکہ میری صبح بالعموم ان کے فون سے شروع ہوتی۔

''ایم قمرالدین آپ سے ہم کلام ہے۔''

مجھ سے اس دن کا پروگرام دریافت کرتے، گاڑی کی ضرورت ہوتی تو وہ لے کر آ جاتے، جس دن نہ آ سکتے اس دن معذرت کرتے۔ الغرض! وہ مکمل طور پر میرے انچارج بن چکے تھے۔ یہ سب ان کا خلوص تھا ورنہ غالب انسٹی ٹیوٹ سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ خود تامل ناڈو کے تھے، بیوی بہار کی تھیں مگر دونوں محبت کا سنگم تھے اپنے لیے اور خلوص کا دوآبہ تھے میرے لیے!

16 دسمبر کی صبح کو میں منتظر کہ شاہد ماہلی صاحب آئیں اور مجھ بین الاقوامی شہرت یافتہ مجرم کو انٹرپول بھی جس کی تلاش میں سرگرداں ہے، پولیس سٹیشن کے لیے لے جائیں۔ دونوں ملکوں میں آنے والوں کو ہر شہر میں اپنی آمد اور روانگی کی پولیس میں رپورٹ درج کرانا ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ کام وقت نہیں لیتا لیکن اس کی وجہ سے بلاوجہ انسان تناؤ میں رہتا ہے چنانچہ میں بھی ناشتے کے بعد سے منتظر رہا، اس دوران مجتبیٰ حسین، شمیم حنفی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور بعض دیگر حضرات کے فون بھی آئے۔ ان میں سے بیشتر وہ تھے جن سے یا تو لاہور میں ملاقاتیں رہی تھیں ورنہ قلمی دوستی تھی۔ جب دوپہر ہونے کو آئی اور شاہد صاحب نہ آئے تو میں نے سوچا، میں کون سا بچہ ہوں کہ شاہد صاحب کی انگلی پکڑ کر ہوٹل سے نکلوں، خود بھی تو جا سکتا ہوں۔ نیچے لابی میں آ کر ریسپشن سے پولیس کا پتہ سمجھا، رکشا لیا اور جا کر آمد کی اطلاع درج کرا دی۔ رکشے والے نے پاکستانی مسافر سمجھ کر غالباً زیادہ پیسے طلب کیے لیکن وہ لاہور کے رکشا کے میٹر کے لحاظ سے مجھے تو بہت کم لگے۔

جاتے ہوئے میری نگاہ انجمن ترقی اُردو کے بورڈ پر پڑی تھی چنانچہ پولیس سے فراغت پا کر وہاں جا پہنچا جہاں ڈاکٹر خلیق انجم براجتے ہیں۔ ان سے میں پہلی مرتبہ کراچی میں نگار و نیاز کانفرنس کے موقع پر ملا تھا۔ اس کے بعد لاہور میں بھی ملاقاتیں رہیں۔ بہت ہنس مکھ اور بذلہ سنج انسان ہیں۔ انجمن کے دفتر میں نیّر مسعود، علی جواد زیدی اور کاظم علی خان بھی تشریف فرما تھے۔ ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ ڈاکٹر اکبر حیدری بھی آ گئے۔ اس کے بعد جو محفل غیبت برپا ہوئی تو بس لاہور یاد آ گیا۔ ہر گھنٹے بعد شمیم صاحبہ چائے بنوا کر لے آتیں اور ہماری زبانوں کو طراوت بہم پہنچا جاتیں، ادھر حبیب خاں صاحب بھی وقتاً فوقتاً آ کر جھانک جاتے کہ ہم خیریت سے تو ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی کرسی دکھائی۔ مطبوعات کے بارے میں بتایا، مشاہیر کے خطوط جمع کرنے کے منصوبے کی تفصیلات سے آگاہ کیا اور اہل قلم کی وہ تصاویر دکھائیں جو

انہوں نے اپنے کیمرہ سے اتاری تھیں۔ ڈاکٹر صاحب بہت اچھے فوٹو گرافر ہیں۔ ہمارے محققین میں سے ڈاکٹر وحید قریشی اور مشفق خواجہ بھی بہت اچھی فوٹو گرافی کرتے ہیں اور حسن اتفاق سے یہ تینوں محقق فوٹو گرافر ہونے کے ساتھ ساتھ زبردست فقرہ باز بھی ہیں۔

غالب انسٹی ٹیوٹ

غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے پرفضا علاقے میں ایک خوبصورت عمارت میں قائم کیا گیا ہے۔ یہ اندرا گاندھی کی دلچسپی سے معرضِ وجود میں آیا تھا۔ اس کی اپنی انتظامیہ ہے اور اپنے امور میں خودمختار ادارہ ہے۔ اپنا آڈیٹوریم، کتب خانہ اور مہمان خانہ ہے۔ ایک چھوٹا سا غالب میوزیم بھی ہے۔ غالب اور عہد غالب کے بارے میں اہم اور نادر تصاویر بھی رکھی گئی ہیں، مجلّہ غالب نامہ نکالتے ہیں، جس میں غالب کے بارے میں تحقیقی اور تنقیدی مقالات طبع ہوتے ہیں۔ ہر برس اردو دنیا کی اہم شخصیات کو ایوارڈز دیئے جاتے ہیں۔ غالب پر کتابیں طبع کی جاتی ہیں اور ہر سال ایک بین الاقوامی غالب سیمینار منعقد کیا جاتا ہے۔ الغرض! صحیح معنوں میں غالب کی مقبولیت میں اضافے کے لیے کوشاں ہیں۔ اس کے سیکرٹری جناب محمد شفیع قریشی بے حد فعال اور خلیق انسان ہیں اور اسی سیمینار کے لیے پاکستان سے منیر احمد شیخ اور مجھے بلایا گیا تھا، بنگلہ دیش سے پروفیسر کلیم سہسرامی، روس سے تاجکستان کے مشہور فارسی محقق عبداللہ جان غفاروف اور ماسکو سے اردو سکالر ڈاکٹر لدمیلا واسلویا مدعو تھیں۔ یہ تو تھے غیر ملکی مہمان جبکہ بھارت کے بیشتر قابل ذکر محققین، غالب شناس اور دانشور مدعو کیے گئے تھے اور ان کے علاوہ مقامی حضرات۔ الغرض! اجتماع کیا تھا غالب شناسوں کی کہکشاں تھی۔ صرف چند اسماء سے سیمینار کے معیار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آل احمد سرور، جگن ناتھ آزاد، ظ انصاری، نیّر مسعود، علی جواد زیدی، کاظم علی خان، ڈاکٹر انصار اللہ، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، اکبر حیدری اور ڈاکٹر عبدالستار دلوی۔

سیمینار کا موضوع تھا ''محققین اور مترجمین غالب'' اور ظاہر ہے کہ ایسے موضوع میں عوامی دلچسپی کی کوئی بات نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود ہماری روایت کے برعکس ہال ہمیشہ شائقین سے بھرا رہتا۔ ایک اور بات جو مجھے بہت اچھی لگی وہ یہ تھی کہ مقالہ پڑھنے کے بعد اس پر بحث کی جاتی، خامیاں اُجاگر کی جاتیں اور تحقیقی امور پر دل کھول کر بحث ہوتی۔ جب ایسے ایسے نامور محققین جمع ہوں تو پھر بحث کے انداز اور معیار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے بلکہ مجھے تو بعض اوقات مقالے سے زیادہ بحث میں لطف محسوس ہوتا۔

منیر احمد شیخ نے ''کلام غالب کے پنجابی تراجم'' کے عنوان سے مقالہ پڑھا اور صحیح معنوں

میں میلہ لوٹ لیا۔ میں نے ''مولانا غلام رسول مہر بحیثیت محقق غالب'' کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ سیمینار کے تمام مقالات بعد میں مجلّہ ''غالب نامہ'' میں طبع کر دیئے جاتے ہیں۔ یوں یہ مقالات محفوظ رہ جاتے ہیں۔

کوئی بھی سیمینار ہو، اس کا سب سے بڑا فائدہ ملاقاتوں کی صورت میں ہوتا ہے اور میرے لیے تو یہ سیمینار ملاقاتوں کا میلہ ثابت ہوا۔ جگن ناتھ آزاد سے پرانی یاد اللہ ہے۔ گلے ملے، منہ چوما اور سیلاب میں اپنے کتب خانے کے بہہ جانے کی دکھ بھری داستان سنائی۔ عبداللہ جان غفاروف سے ایک شام کھل کر گفتگو ہوئی تو دونوں کو یاد آیا کہ 1977ء میں علامہ اقبال انٹرنیشنل کانگریس (لاہور) میں ہم دونوں پہلے بھی مل چکے تھے۔ غفاروف فارسی محقق ہیں لہٰذا اردو بھی مفرس اسلوب میں بولتے ہیں۔ مجھے مالک رام صاحب سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا، ملے تو گلے لگا کر جو پہلا فقرہ کہا، وہ یہ تھا ''میں وی پنجابی آں۔''

مالک رام بہت باغ و بہار قسم کی شخصیت ہیں اور ان لوگوں میں سے نہیں جو علم کو ایک بوجھ کی طرح لادے علیت کے مزدور بن کر رہ جاتے ہیں۔ فقرہ باز ہیں اور اچھے فقروں کی داد بھی دیتے ہیں۔ فرمانے لگے میری طبیعت خراب ہے، صرف تم لوگوں کی خاطر میں آیا ہوں۔

کلیم سہسرامی ہوٹل میں میرے پڑوسی تھے۔ کلیم صاحب راج شاہی یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو ہیں۔ انہوں نے خوشخبری سنائی کہ میری دو کتابیں ''تنقیدی دبستان'' اور ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' وہاں ایم اے اردو کے نصاب کے لیے مجوزہ کتب کی فہرست میں شامل کی جا چکی ہیں۔ میرے لیے یہ بہت بڑا اعزاز ہے۔ میرے شکریہ پر انہوں نے بتایا کہ گزشتہ برس وہ دہلی آئے تو بھارت میں مطبوعہ ''تنقیدی دبستان'' خرید کر لے گئے اور کتاب اتنی پسند آئی کہ اسے شاملِ نصاب کرا دیا۔ ان کی بیگم صاحبہ بہت خلیق اور ہنس مکھ خاتون ثابت ہوئیں۔ وہ ان خواتین میں سے ہیں جو طبعاً منتظم ہوتی ہیں چنانچہ ناشتے کی میز پر تمام آرڈرز وغیرہ خود ہی دیتیں۔ پروفیسر کلیم صاحب کا یوں دھیان رکھتی ہیں گویا وہ کوئی برخوردار قسم کی چیز ہوں۔ ان کی بیٹی کا نام ارم تھا، جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ میری بھی بیٹی کا نام ارم ہے تو انہوں نے اس نادیدہ کو بھی اپنی بیٹی بنا لیا، الغرض! بہت ہی محبت کرنے والے ثابت ہوئے۔

ذوق کا گناہ؟

بہت خشک اجلاس جاری تھا کہ منیر احمد شیخ نے آنکھ ماری، میں نے دائیں بائیں دیکھا کوئی عورت نہ بیٹھی تھی۔ ہائیں! تو پھر آنکھ کسے ماری؟ انہوں نے پھر آنکھ ماری جو اس مرتبہ مجھے لگی اور

اشارتاً نہایت ہی پُرترغیب انداز میں باہر آنے کو کہا۔انہوں نے جو کچھ پنجابی میں کہا، اس کے سلیس اردو میں ترجمہ کا کوئی فائدہ نہیں۔خلاصہ یہ تھا کہ خلیق انجم اندرون شہر مرزا مظہر جانِ جاناں کا مزار دکھانے لے جا رہے ہیں۔تم نے چلنا ہے؟ بھلا میں کیوں نہ جاتا؟

ترکمان دروازہ سے داخل ہوتے ہی منظر یکلخت بدل گیا۔ بالکل ایسے جیسے لوہاری کے اندر داخل ہوتے ہی لاہور کچھ اور بن جاتا ہے بلکہ اصل دہلی اور اصل لاہور کی فضا میں کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ وہی تنگ کوچے اور ان کے درمیان بہتی نالیاں، وہی ایک دوسرے سے چپکے مکانات اور سر پر گرتی محسوس ہونے والی چھت، اینٹ کی دیواریں، بچوں کی بھاگ دوڑ، بھینسیں اور بکریاں، راہگیروں کا ہجوم اور ان سب پر مستزاد رکشا، سائیکل، موٹر سائیکل اور قدم تھامنے کو جگہ جگہ کوڑے کے پہاڑ اور نالیوں سے نکلے ہوئے مال مصالحے کے ٹیلے! بس فرق تھا تو گاڑھی پنجابی اور تیز اردو کا! اور ان تنگ بل کھاتی اور گندی گلیوں میں امریکہ اور یورپ کے صاف ستھرے گھروں کے رہنے والے پراسرار مشرق کی تلاش میں آتے ہیں اور روحانی سوغات لے کر جاتے ہیں۔اس امر کے باوجود کہ ان ہی گندی دیواروں پر چک نورس کی فلموں کے پوسٹر سج رہے ہوتے ہیں اور مائیکل جیکسن اور میڈونا کی کیسٹ چل رہی ہوتی ہے۔

اور اسی گندے ماحول میں مرزا مظہر جانِ جاناں کا مزار کنول کی مانند صاف ستھرا تھا۔ہم فاتحہ خوانی کے لیے کھڑے ہوئے تو ان کی شاعری اور شہادت ذہن میں تازہ ہوگئی۔

وہاں سے نکلے تو رضیہ سلطانہ کے مزار پر حاضر ہوئے جسے مزار کہنے کو جی نہ مانے، اگر واقعی یہ رضیہ سلطانہ کی قبر ہے تو اسے دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ یہ روایتی معنوں میں قبر نہ لگی، پتھر کی بڑی بڑی سلوں سے دو چبوترے بنا دیئے گئے تھے۔دوسری قبر کے بارے میں معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس کی تھی۔ اب بچے وہاں کرکٹ کھیل رہے تھے۔ہم احاطہ میں داخل ہوئے تو بدمزہ ہو کر ایک طرف کھڑے ہو کر ہمیں گھورنے لگے کہ یہ کہاں سے آ گئے؟ ایک بچے کی سرگوشی کان میں پڑی ''پاکستانی دکھیں۔''

ڈاکٹر خلیق انجم بتا رہے تھے کہ یہ چند مزارات یا قبریں تو بچ گئی ہیں۔بعض کا تو اب نام و نشان بھی نہیں جیسے استاد شاہ حضرتِ ذوق کی قبر جس پر آج کل عوامی بیت الخلاء بنی ہے۔انہوں نے بتایا کہ اس کے خلاف بہت جدوجہد کی گئی بلکہ اندرا گاندھی نے حکم امتناعی بھی جاری کر دیا مگر جب تک احکامات کی تعمیل ہوتی قبر مسمار کی جا چکی تھی۔ ذوق نے کہا تھا:

کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

لیکن دلی والوں نے اس سے اچھا سلوک نہ کیا۔

میں اس تصور سے لرز کر رہ گیا کہ ہم ادیب جس شہرت کی خاطر عمر بھر پاپڑ بیلتے، سازشیں کرتے، دشمنیاں مول لیتے اور روپیہ پیسہ خرچ کرتے ہیں، اس کا انجام یہ بھی ہو سکتا ہے؟

ہمارے شہرت پسند ادبی وڈیروں کے لیے لمحۂ فکر!

ڈاکٹر خلیق انجم کہہ رہے تھے، نہ جانے ذوق نے کیا گناہ کیا تھا جس کی یہ عبرتناک سزا ملی۔

البتہ غالب اور درد اس لحاظ سے اچھے رہے کہ دونوں کی قبریں بچ گئیں۔ ایک شرابی اور دنیادار انسان تھا، دوسرا نیک دل صوفی تھا۔خرابی تو ذوق بیچارے میں بھی کچھ نہ تھی، بس قبر سرکاری کھاتے میں آ گئی۔

برہمن زادی یا روسی؟

اس سیمینار کی سب سے سنسنی خیز چیز ڈاکٹر لدمیلا واسلویا ثابت ہوئیں۔ ماسکو ریڈیو کے انڈین ڈیپارٹمنٹ سے وابستہ ہیں۔مولانا الطاف حسین حالی پر ڈاکٹریٹ کر رکھی ہے۔ چہرے مہرے سے روسی کم اور برہمن زادی زیادہ نظر آتی تھیں۔ یہ تو سنہری بال تھے جو بھید کھول دیتے تھے ورنہ وہ تو دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا کی زندہ تصویر تھیں۔تاہم سنہری بالوں کے ساتھ مشرقی لباس بہت جچتا۔ غالب اور فیض پسندیدہ شاعر تھے اور دونوں کے روسی زبان میں تراجم کر رکھے تھے۔انہوں نے بتایا کہ غالب کا ترجمہ پچیس ہزار کی تعداد میں چھپا اور ایک ہفتے میں سارا ایڈیشن بک گیا۔انہوں نے بعض بھارتی افسانہ نگاروں کی کہانیاں کے بھی روسی میں تراجم کر رکھے ہیں۔ہم دونوں ایک ہی ہوٹل میں تھے۔ادھر اردو رابطے کے ذریعہ تھی اس لیے ان سے خوب گپ شپ رہتی۔ایک دن ہمارے ہاں کی صورتحال کا ذکر آیا تو میں نے کہا ''اگر آپ مُلّا کو نہیں سمجھتیں تو پھر ہمارے ہاں کے ذہنی جبر کو بھی نہیں سمجھ سکتیں۔''

فوراً بولیں ''دراصل ہر ملک کا اپنا اپنا مُلّا ہوتا ہے اور اس کا اپنا اپنا جبر۔'' اسی لیے یہ گورباچوف کے آنے سے بہت خوش تھیں کہ وہ روسی عوام کو کچھ ذہنی آزادی دینے کی کوشش میں روسی معاشرے کے بند دریچے کھول رہا ہے۔ میں اگر ناشتے کو تنہا آتا تو نیم تاریک گوشے میں بیٹھ کر مختلف ملکوں کے لوگوں کا مشاہدہ کرتا رہتا جو بہت دلچسپ اور بعض صورتوں میں تو معلومات افزا مشغلہ ثابت ہوتا ہے۔ایسی ہی ایک صبح میں اپنے کونے میں تنہا بیٹھا تھا کہ یہ آ گئیں اور کمرہ کے دوسرے سرے پر بیٹھ کر ناشتے کا آرڈر دیا۔عین اسی وقت نیم تاریک کمرے میں نہ جانے کہاں سے سورج کی شعاعیں آ گئیں اور سنہری بالوں سے اٹکھیلیاں کرنے لگیں۔ یوں روسی چہرے پر بھارتی رنگوں کی ہولی کھیلی

جانے لگی۔ اصولاً تو پاس جا کر مجھے حال احوال دریافت کرنا چاہیے تھا مگر میرے اندر کا افسانہ نگار کسی طرح سے بھی اس منظر سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اچھے آداب کے منافی سہی مگر میں سنہرے بالوں میں شعاعوں کے رقص میں اتنا محو ہو چکا تھا کہ خواہش کے باوجود بھی اٹھ نہ سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد رنگوں کی یہ جوالا ٹھنڈی پڑی تو میں چائے (جواب تک ٹھنڈی ہو چکی تھی) کا کپ اٹھا کر میز پر چلا گیا، بولیں:

''میں نے آپ کو کئی مرتبہ آداب کہا مگر آپ نے دیکھا ہی نہیں۔''

میں نے جواب ''میں کچھ اور دیکھ رہا تھا۔''

ذہین خاتون تھیں اس لیے یہ نہ پوچھا کہ میں کیا دیکھ رہا تھا؟ بوقتِ رخصت مجھ سے ماسکو میں ملنے کی دعا کی جس پر میں نے صدق دل سے آمین کہیے۔

ان کی اردو سنی تو آتش کے اس شعر کی عملی تشریح ہوگئی:

تم جو گویا ہوئے تو پھول جھڑے
غنچہ سے منہ میں رنگ لائی بات

مٹی کی خوشبو

یہ ہوٹل بنیادی طور پر غیر ملکی سیاحوں کے لیے تھا اس لیے مسافر بالعموم یہاں زیادہ دن تک نہ ٹکتے۔ ایک دو دن میں تاریخی مقامات کی سیر کرتے اور پھر منظر سے غائب ہو جاتے۔ ایک میں تھا جس نے بارہ دن تک چھاؤنی ڈالے رکھی جس کے نتیجے میں جلد ہی میں انگریزی محاورہ کے مطابق ہوٹل کی فیملیر سائٹ بن گیا اور کبھی کبھی ریسپشن والے بھی بعض خاص لوگوں سے میرا یوں تعارف کراتے گویا میں بھی اس ہوٹل کی کوئی خاص ڈش تھا۔

''ان سے ملیے، یہ ڈاکٹر سلیم اختر ہیں۔ پاکستان سے آئے ہیں۔'' پاکستان کا نام سن کر مخاطب ہمیشہ مجھے نئی دلچسپی سے دیکھتا۔ اسی طرح ایک مرتبہ ناشتے کے کمرے میں میں نے بیرے کو ناشتے کی ٹرے میں آٹے کے پیڑے جیسی چیز لے جاتے دیکھا تو مارے تجسس کے بیرے سے استفسار کیا۔ جواب میں اس نے بتایا کہ یہ مدراسیوں کی خاص اور پسندیدہ ڈش ہے ''ڈوسہ۔'' مجھ سے کہنے لگا آپ بھی آزمایئے اس کا ذائقہ بہت اچھا ہوتا ہے مگر میں پردیس میں معدے کے معاملے میں کسی طرح کا بھی رسک نہ لینا چاہتا تھا اسی لیے میں صرف دو سادہ ٹوسٹ لیتا تھا، لہٰذا میں نے مدراسی ناشتے سے گریز کیا لیکن اس بہانے بیرے سے میری گفتگو کا آغاز ہو گیا۔

اس نے پوچھا ''ساب! آپ کہاں سے آئے ہو؟''

میں نے بتایا۔ بہت خوش ہوا۔ بولا ''ساب، میں بھی اُدھر ہی سے آیا ہوں۔ ہم گوجرانوالہ میں ہوتے تھے۔'' بڑی دیر تک سابقہ وطن کے بارے میں جذباتی باتیں کرتا رہا، اگلے دن ایک اور بیرے کو ملوانے لایا جس نے بتایا کہ ہم آزاد کشمیر کے علاقے میں رہتے تھے اور یہ سب مجھ سے اس گرم جوشی سے مل رہے تھے گویا میں گمشدہ رشتہ دار تھا۔ یہ دونوں بچپن میں ہی ترک وطن کر کے آ گئے تھے اور اب گمشدہ ماضی کے کھنڈر میں یادوں کے چراغ روشن کر رہے تھے۔ اُن سے گفتگو کر کے مجھے یہ احساس ہوا کہ مٹی کا رشتہ کتنا پائیدار ہوتا ہے اور دھرتی سے قدم اکھاڑ کر کہیں بھی چلے جاؤ مگر اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ دہلی میں مجھے ایسے متعدد افراد سے ملنے کا اتفاق ہوا جو پاکستان کا بڑے والہانہ انداز میں نام لیتے تھے۔ صرف اس وجہ سے کہ انہوں نے ادھر جنم لیا تھا۔ کسی کو کرشن نگر کی گلیاں نہ بھولیں تو کوئی انارکلی کا دیوانہ، کسی کا دل قصہ خوانی میں اٹکا تو کوئی لائل پور کے گھنٹہ گھر کو یاد کرتا۔ یہ سب عام لوگ تھے نہ ان کے مقاصد سیاسی تھے اور نہ ادبی لیکن دہلی میں زندگی بسر کرنے کے باوجود بھی ان کے دل میں پاکستان کے لیے نرم گوشہ تھا۔ اسی سے مجھے فکر تونسوی اور جگن ناتھ آزاد جیسے اہل قلم یاد آئے جو فسادات میں جان کے خطرے کے باوجود لاہور چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔ راجندر سنگھ بیدی نے ایک مرتبہ کہا تھا: ''میں لاہور اس لیے نہیں جانا چاہتا کہ ایک مرتبہ وہاں چلا گیا تو میں پھر واپس نہ آ سکوں گا۔'' جگن ناتھ آزاد نے بحیثیت ہندوستانی شہری پاکستان سے واپس جا کر جو سفرنامہ لکھا، اس کا نام تھا ''وطن میں اجنبی'' یہی عالم گوپال متل کا بھی تھا اور رام لعل کا بھی۔ رام لعل نے لاہور میں ایک مرتبہ مجھے بتایا کہ ہمیں ہندوستان میں طعنے کے طور پر پاکستانی کہا جاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نہ کوئی پاکستانی ہوتا ہے اور نہ بھارتی ایجنٹ، دراصل مٹی کی محبت کو دل سے بھلانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جلاوطن بھی مرنے کے بعد اپنی مٹی میں آسودہ ہونا چاہتا ہے۔

میں کیونکہ پاکستانی تھا، اس لیے بعض لوگ مجھے اس مٹی کی محبت کی علامت کا روپ دے دیتے تھے اور یہ میرے لیے عجب جذباتی لمحے ہوتے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی تربیت یوں کی ہے کہ میں جذباتی نہ بن سکوں اور دل و دماغ کی کیفیت کیسی ہی کیوں نہ ہو لیکن چہرے سے اس کا اظہار نہ ہونے پائے لیکن پاکستانی ہونے کی وجہ سے بعض اجنبی لوگوں سے بھی ایسی اپنائیت ملی کہ سمجھ نہ پاتا کہ ان کے جذبات کی پذیرائی کیسے کروں، بالخصوص وہ لوگ تو بہت ہی جذباتی ہو جاتے جو کبھی بھی پاکستان نہ آ سکے، عجب حسرت سے اپنے بچپن کے شہر اور گلی محلے کا ذکر کرتے اور ان مسلمان دوستوں، پڑوسیوں اور بزرگوں کو یاد کرتے جن کی یادوں سے اب

ان کا ماضی منور ہے۔

پاکستانی انڈین اور بس کی سیٹ

ہندوستان اور پاکستان کبھی ایک تھے مگر اب یقیناً دو الگ الگ ملک بن چکے ہیں چنانچہ اردو زبان، امیتابھ بچن، سری دیوی اور لتا منگیشکر کی پسندیدگی کے اشتراک کے باوجود دونوں ملکوں میں جو تضاد پیدا ہو چکا ہے وہ اتنا نمایاں ہے کہ اب اسے ثابت کرنے کے لیے دلائل کی ضرورت نہیں، ہر پاکستانی بھارت میں جا کر یہ محسوس کر سکتا ہے کہ میں ایک دوسرے ملک میں ہوں اور یہ بھارتی ہے اور میں پاکستانی!

لباس کو لیجیے، ہم جو شلوار قمیض پہنتے ہیں وہ بھارتی مرد نہیں پہنتے۔ مجھے کئی ہندو خواتین نے بتایا کہ پاکستانی مرد قمیض شلوار میں بہت اسمارٹ لگتے ہیں، اگرچہ مجھے شلوار قمیص بطورِ خاص پسند نہیں مگر اب میں بھی سوچتا ہوں کہ اسے خوشی خوشی پہنا کروں۔ آخر مجھے بھی تو اسمارٹ بننے کا حق حاصل ہے۔ ہے نا؟ چٹے چاٹے سے کیا ہوتا ہے، ہر وہ پاکستانی جو بس یا ویگن میں سفر کرتا ہے جانتا ہے کہ یہاں کوئی مرد غیر عورت کے ساتھ ایک سیٹ پر نہیں بیٹھ سکتا بلکہ بعض اوقات تو مرد اپنی عورت کے ساتھ بھی ایک سیٹ پر نہیں بیٹھتا۔ عورت کے ساتھ والی سیٹ خالی ہوگی اور عورت بھی کیا، وہ بڑھیا پھونس ہی کیوں نہ ہو مگر مرد باادب باملاحظہ ہوشیار کی تصویر بنے کھڑے رہیں گے۔ کبھی کبھی اگر کوئی خاتون ترس کھا کر بیٹھنے کی اجازت دے بھی دے تو بعض اوقات انسان کھڑے ہونے ہی میں عافیت سمجھتا ہے۔ میرے ساتھ ایک مرتبہ یہی ہوا، ایک عورت نے ویگن میں اپنی ساتھ والی سیٹ پر بٹھا لیا مگر اس کے کپڑوں (یا سر سے) ایسی عجیب و غریب بو آ رہی تھی کہ جلد ہی طبیعت متلی کرنے لگی، کبھی میں دائیں نتھنے سے سانس لیتا تو کبھی بائیں سے، حلق سے بھی سانس لینے کی کوشش کی، افاقہ نہ ہوا، چنانچہ میں سیٹ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

بھارت میں بس سٹاپ پر قطار بندی کا بہت اچھا رواج ہے اور مرد عورت آگے پیچھے قطار میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ نہ کوئی کسی کو چھیڑتا ہے اور نہ کسی کو جواباً یہ پوچھنا پڑتا ہے، گھر میں ماں بہن نہیں ہے کیا؟ بس آتی ہے اور مرد عورت خاموشی سے ساتھ ساتھ بیٹھ جاتے ہیں۔ غیر مرد غیر عورت کے ساتھ بیٹھتا ہے اور نہ کوئی دھماکہ ہوتا ہے اور نہ زلزلہ آتا ہے، نہ قہر کی بجلیاں کڑکتی ہیں حتیٰ کہ بس کا ٹائر تک بھی پنکچر نہیں ہوتا۔ میں ایک دفعہ تجربہ کی خاطر شوقیہ بس میں سوار ہوا تو ایک شریمتی جی کے ساتھ سیٹ خالی تھی مگر میں لاج کا مارا پاکستانی اپنی تربیت کے عین مطابق کھڑا رہا، دوسری طرف بیٹھے ایک

مہاشہ مجھ سے مخاطب ہوئے ''آپ پاکستانی ہیں؟''

میں نے پوچھا ''آپ نے کیسے اندازہ لگایا؟''

بولے ''کوئی انڈین عورت کے ساتھ کی خالی سیٹ ہرگز نہ چھوڑتا اور فوراً بیٹھ جاتا۔''

اب ان شریمتی نے مجھے پہلی مرتبہ دلچسپی سے دیکھا۔ سانولا رنگ، سادہ ساڑھی، ماتھے پر بِندیا۔ میں نے بھی ڈرتے ڈرتے ان کی جانب دیکھا۔ مسکرا کر بولیں:

''آپ بیٹھ جایئے نا؟''

میں سانس روک کر اور جسم چرا کر یوں بیٹھا کہ کہیں میرا انگ چھو جانے سے انکا شریر بھرشٹ نہ ہو جائے مگر وہ نکلیں خالص عورت۔ فوراً سوالات شروع کر دیئے۔ کہاں سے آیا ہوں؟ کس سلسلے میں آیا ہوں؟ کہاں قیام ہے؟ بچے کتنے ہیں؟ بیٹیوں کا سن کر بڑے اشتیاق سے پوچھا، ابھی تک ان کی شادی ہوئی کہ نہیں؟ خود ایک سکول میں معلّمہ تھیں۔ اتنے میں ان کا اسٹاپ آ گیا اور وہ اپنی کاپیاں سنبھالے اتر گئیں۔ کئی دن بعد رات گئے ہوٹل واپس آنے پر ریسپشن نے مختلف پیغامات کی جو چٹیں دیں ان میں ایک عورت کا نام بھی تھا مگر ایسا نام جس سے میں ادیبوں اور شاعروں کی کسی محفل میں نہ ملا۔

اس کے برعکس ایک واقعہ بھی سن لیجیے۔ ہم سب ویگن میں بند بوری میں آلوؤں کی مانند ٹھنسے جا رہے تھے۔ لمبی داڑھی والا ایک مولوی دو سیٹوں پر پھیل کر بیٹھا تھا جبکہ سواریوں کے پاؤں میں ایک غریب بوڑھی عورت بیٹھی تھی۔ میں عام طور پر سوشل سروس کا شوقین نہیں لیکن اس بڑھیا کو دیکھ کر رہا نہ گیا اور میں نے مولوی صاحب سے کہا ''اسے اپنے ساتھ کیوں نہیں بٹھا لیتے؟''

فرمایا ''یہ نامحرم ہے۔'' اس پر میں نے جو جواب دیا وہ مولوی کو پسند نہ آیا اور یوں زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے ویگن میں لڑائی لی اور جیتی بھی کیونکہ تمام سواریوں نے مولوی کو لعن طعن کی مگر وہ نامحرم کو ساتھ بٹھانے پر نہ مانا۔

شراب معمولِ حیات

ایک اور چیز جو ہم پاکستانیوں کے لیے بہت عجیب ہے وہ ہے شراب نوشی کا ہر قسم کے ٹیبوز (Taboos) سے آزاد ہونا۔ وہاں شراب نوشی غیر قانونی نہیں جس کے نتیجے میں اب وہاں پینا پلانا نہ تو عیاشی کے لیے ہے (جیسا کہ ہمارے ہاں ہے) نہ تہوار کا مزا دوبالا کرنے کے لیے (جیسے ہمارے ہاں عید کو بطورِ خاص بوتلیں جمع کی جاتی ہیں) نہ جنس کی خاطر، نہ شباب کی خاطر، نہ جشن کی خاطر، نہ مدارات

کی خاطر، قصہ مختصر پاکستانی پینے کے لیے حیلہ گر ہیں لیکن وہاں یہ معمول حیات میں سے ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ بہت سی سماجی خرابیاں اور ازدواجی الجھنیں جنم لے رہی ہیں اور نقصان یہ کہ پولیس کی رقمیں ڈوب جاتی ہیں۔

میرا بالعموم رات کا کھانا کسی نہ کسی کے گھر ہوتا تھا اور میزبان ہندو ہو یا مسلمان بلا استثنیٰ سب کے ہاں فروغِ مے کا عالم پایا۔ میں یہاں نہیں پیتا اس لیے وہاں بھی پینے کی خواہش یا ضرورت محسوس نہ کی۔ ویسے بھی میں ان بدقسمت لوگوں میں سے ہوں جنہیں مفت کا مال راس نہیں آتا۔ میرا انکار ان کے لیے کبھی تعجب خیز تو کبھی تشویش ناک ثابت ہوتا، چنانچہ کچھ اس طرح کی گفتگو ہوتی۔

''ڈاکٹر صاحب کیا لیں گے؟''

''جی میں نہیں پیتا۔''

''کیا مطلب؟ یعنی آپ واقعی نہیں پیتے؟''

''جی ہاں، میں دراصل سکھ مسلمان ہوں۔''

''یعنی؟''

''میں تو سگریٹ بھی نہیں پیتا۔''

اس پر لوگ مجھے عجیب وغریب نظروں سے دیکھتے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے گھر کھانا تھا، وہ کہنے لگے ''ڈاکٹر صاحب! آپ چھوٹا سا پیگ لے لیں۔''

عرض کیا ''آپ کا چھوٹا پیگ میرے لیے بہت بڑا پیگ ثابت ہوسکتا ہے۔''

انہوں نے اصرار کیا ''پھر بھی تھوڑی سی تو لے لیں۔''

میں نے جواباً کہا ''ڈاکٹر صاحب! میں پیتا نہیں، یہاں اتنی خواتین ہیں، میں اگر پی کر بہک گیا اور ان خواتین میں سے کسی کے ساتھ کوئی ایسی ویسی بات کر بیٹھا تو......''

یہ دھمکی کارگر ہوئی اور نارنگ صاحب نے مزید اصرار نہ کیا۔

علی صدیقی نے ہم مندوبین کے اعزاز میں ایک استقبالیہ کا اہتمام کیا تھا۔ میں باہر پنڈال میں بیٹھا تھا کہ علی صدیقی آئے، مجھے اٹھایا اور کمرۂ خاص میں لے گئے جہاں سبھی مشغولِ مے تھے۔ وہی پیشکش، وہی انکار اور وہی اصرار، ایک صاحب چہک کر بولے:

''سلیم صاحب! آپ پیتے نہیں اسی لیے آپ شاعری نہ کرسکے۔''

عرض کیا ''صاحب! میں تو عشق بھی نہ کرسکا۔''

اس طرح کی گفتگو کے بعد لازمی طور پر ان پاکستانی بھائیوں کا تذکرہ چھڑ جاتا جو اپنے اچھے

طرزِ عمل یا تخلیق کے برعکس محض مے نوشی کی داستانیں چھوڑ آتے ہیں۔

''آخر آپ کے شاعروں اور ادیبوں کی اکثریت یہاں آکر ندیدے پن کا مظاہرہ کیوں کرتی ہے؟''

میں جبر کی نفسیات کی بات کرتا ہوں، دباؤ کے قصے چھیڑتا ہوں، ازلی پیاسوں کی حکایات سناتا ہوں اور مفت کی شراب قاضی کو حلال والی ضرب المثل بیان کرتا ہوں۔

دہلی کی شبینہ محفلوں میں ایک بات مجھے اچھی لگی کہ ان میں بالعموم موسیقی کا اہتمام ہوتا تھا۔ وہاں ہماری مانند موسیقی کے بارے میں نہ تو ابھی تک حلال اور حرام کی بحثیں ملتی ہیں اور نہ ہی اسے اربابِ نشاط سے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ تعلیم کی مانند موسیقی بھی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ بالخصوص ہندوؤں میں کہ جہاں بھجن کی صورت میں یہ مذہبی رسوم کا حصہ بھی ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مسلمان خواتین بھی موسیقی سے شغف کرتی دیکھی گئیں، اسی لیے عشائیوں میں بالعموم کبھی صاحب خانہ کی بیگم یا صاحبزادی یا پھر کوئی مہمان خاتون غزل سرا ہوتی یا پھر کبھی کبھی بیٹا بھی جیسا کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے گپلو سے بیٹے ترون نے غالب اور میر کی خوبصورت غزلیں سنائیں۔

آدھی رات تک شعر و شاعری، موسیقی اور ان کے ساتھ ساتھ دورِ جام رہتا حتیٰ کہ جب اگلی تاریخ شروع ہوچکی ہوتی تو پھر کھانا بھی کھالیا جاتا لیکن اس وقت تک اکثر حضرات مخمور سعیدی بن چکے ہوتے۔ ایسی ہی ایک محفل کے بعد ایک میاں بیوی مجھے ہوٹل چھوڑنے جارہے تھے، میں نے یوں مادر پدر آزاد شراب نوشی کے نقصانات کے بارے میں استفسار کیا تو خاتون کہنے لگیں ''اب یہ اتنی عام ہوچکی ہے کہ روایتی معنوں میں یہ نقصان دہ نہیں رہی۔'' یہ بات مجھے سمجھ نہ آئی۔ انہوں نے وضاحت کی ''جب گھر میں بیٹھ کر پی جاسکتی ہے تو میاں کو باہر جاکر پینے کی ضرورت نہیں۔''

''اور بیوی کو بھی؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل۔'' وہ کہنے لگیں۔ ''اب عورتیں بھی خاوند کے ساتھ پی لیتی ہیں۔''

میں نے پوچھا ''جب گھر میں ہر وقت بوتلیں موجود رہیں گی تو کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ بچے بھی اس کا مزا چکھ لیں؟''

بولیں ''ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے کہ بعض اوقات تجربہ کی خاطر ہی بچے پی سکتے ہیں لیکن اس میں بھی ایک بات یہ ہے کہ اب یہ اتنی عام ہوچکی ہے کہ اب بچوں میں بھی اس کے بارے میں کسی طرح کا تھرل یا تجسس باقی نہیں رہا، وہ پی لیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا، نہ پئیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' مگر

یہ منطق مجھ پاکستانی کے پلّے نہ پڑی۔

شراب کا ادبی فائدہ

البتہ بحیثیت ادیب مجھے شراب نوشی کے اس ادبی فائدہ کا احساس ضرور ہوا کہ شراب پی لینے کے بعد ادیبوں میں جو جنگ چھڑتی اصل جنگ تو وہی ہوتی ہے، ہماری سوکھی لڑائی تو محض ایک شُرلی ہوتی ہے۔

پاکستان اور بھارت مذہبی، تہذیبی اور تمدنی لحاظ سے کتنے ہی جداگانہ اور برعکس کیوں نہ ہوں مگر جہاں تک قلم قبیلے کا تعلق ہے تو دونوں ملکوں کے ادیبوں کی خصلتیں اور کرتوتیں بالکل یکساں ہیں۔ حسد، سازش، عیب جوئی، بدخواہی اور ان کے نتیجے میں ہونے والے لڑائی جھگڑوں میں یکسانیت ملتی ہے یعنی وہی بات کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔

دہلی کے پندرہ روزہ قیام کی ہر ادبی محفل مجھے تو لاہور کی ہر ادبی محفل کی کاربن کاپی لگی۔ البتہ ہم پاکستانی ادیب دہلی کے ادیبوں سے تیز زبانی میں محض اس وجہ سے پیچھے رہ جاتے ہیں کہ شراب کی مہمیز سے محروم ہیں، اس لیے ہم بعض اوقات گفتار کے جوہر خاطر خواہ دکھانے میں ناکام رہتے ہیں، دل کی دل میں رہ جاتی ہے اور مکمل سچ نہیں بول پاتے لیکن بھارتی ادیبوں کو سچ بولنے کے لیے شراب کی سہولت حاصل ہے اسی لیے نشہ طلوع ہونے کے بعد وہ غالب کے اس شعر کی زندہ تصویر بن جاتے ہیں:

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

چنانچہ اہلِ قلم کے اندازِ گل افشانیٔ گفتار کے ایسے ایسے فرحت بخش نمونے ملاحظہ کیے کہ طبیعت باغ و بہار ہوگئی۔ شراب کا اور کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو یہ سچ بولنے کا بہانہ مہیا کر دیتی ہے۔ سچ اور وہ بھی کسی شرابی ادیب کا سچ اور پھر کسی دوسرے شرابی ادیب کے بارے میں سچ تو اس سے زیادہ لذیذ سچ کا تصور ممکن نہیں۔ بس یوں سمجھیے کہ بارہ مصالحے کی چاٹ ہوتی تھی لیکن کبھی کبھی یہ سچ کیسی تلخ حقیقت کا غماز ثابت ہوسکتا ہے اس کا بھی میں عینی شاہد ہوں۔ ایک شبینہ محفل میں ایک بزرگ ادیب جب زیادہ مخمور ہوگئے تو انہیں دو سینئر ادیبوں میں صلح کرانے کی سوجھی۔ ادھر وہ سینئر ادیب بھی خاصی پی چکے تھے، لہٰذا صلح کی یہ گفتگو مزید جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ ایک دم جو آوازوں کا شور بلند ہوا تو سب چونکے، بعض پینے والوں نے تو یوں دیکھا، گویا تعجب کر رہے ہوں کہ ہائیں یہ کام تو ہمیں اب تک کر لینا چاہیے تھا، یہ دونوں کیسے سبقت لے گئے۔ بعض نے قطعاً کوئی نوٹس ہی نہ لیا، اپنے گلاس سے محوِ کلام رہے۔ بعض خواتین کے چہروں پر البتہ سراسیمگی کے آثار نظر آئے۔ ایک نے دوسرے سے کیا کہا؟ اس کا

اعادہ حدود آرڈیننس کی حد میں لے جائے گا، البتہ مسلمان ادیب نے ہندو ادیب سے جو فقرہ کہا وہ آج کے بھارتی مسلمان کی اجتماعی سوچ کا مظہر ہے۔ بولے:

"اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اقلیت میں ہونے کی وجہ سے مجھے دبا لو گے تو یہ تمہاری غلطی ہے اب ایسا نہیں ہوسکتا۔"

یقیناً شراب نوشی کے بہت سے فائدے ہیں!

اب جہاں آپ نے سچ سنا تو وہاں ایک مثال جھوٹ کی بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔ نارنگ ساقی کے گھر مخمور سعیدی جب صحیح معنوں میں اسم بامسمیٰ کی تصویر بن گئے تو لڑکھڑاتے ہوئے میری جانب آئے، مجھے گلے لگایا اور لکنت آمیز لہجے میں بولے:

"ڈاکٹر سلیم اختر تم ایک عظیم نقاد ہو۔ یو آر اے گریٹ رائٹر!" میرا خیال ہے آج مخمور سعیدی اس فقرے کی تردید کردے گا۔

خالص سانولا رنگ

ہم نے اپنے ذہن میں بھارتیوں کے لباس کی یوں تخصیص کر رکھی ہے کہ ہندو دھوتی باندھتا ہے، مسلمان شیروانی پہنتا ہے، ہندنی ساڑھی باندھتی ہے، عیسائی لڑکی سکرٹ یا جین میں ملبوس ہوگی اور نیتاجی کھدر پوش ہوں گے لیکن دہلی میں اس قسم کی ملبوساتی درجہ بندی نہ دیکھی۔ مسلمان لڑکیاں جین اور جیکٹ میں بھی دیکھیں اور ہندو مرد کو شیروانی میں ملبوس پایا۔ علی گڑھ میں جس دکان سے میں نے گزک خریدی اس کا سائن بورڈ ہندی میں تھا اور کھدر پوش دکاندار نے گاندھی کیپ پہن رکھی تھی۔ میرے ساتھ ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ تھے جب انہوں نے بطور پاکستانی تعارف کرایا تو اس نے خوش ہوکر بتایا کہ اس کا ایک بھائی کراچی میں بھی کاروبار کرتا ہے۔ تب پتا چلا کہ وہ تو مسلمان ہے۔ مالک رام شیروانی میں مسلمان معلوم ہوتے ہیں جبکہ ظ انصاری اپنی ٹوپی سے ہندو۔

بحیثیت مجموعی وہاں کی عورتوں اور لڑکیوں میں سادہ لباسی نظر آئی۔ خواتین کی اکثریت کے سانولے چہرے میک اپ کے بغیر اصل رنگ میں نظر آئے، اس لیے سہانے اور پرکشش لگے۔

میں پاکستان کے سب سے مشہور اور قدیم کالج میں پڑھاتا ہوں، اگر اس کالج سے نئے فیشنز کے چشمے پھوٹتے نہیں تو کم از کم یہاں سب سے پہلے فیشن متعارف ضرور ہوتے ہیں، ویسے بھی آپ اپنے کوچہ و بازار دیکھیں تو عورتوں کی اکثریت نے چہرہ فروغ میک اپ سے گویا گلستان کیا ہوتا ہے۔ وہ جس راہ سے گزر جائیں بہار کے جھونکے کی مانند خوشبو بکھیرتی گزرتی ہیں، یوں کہ اندازہ ہو

جاتا ہے کہ ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے۔ ہمارے نودولتیا معاشرے کی خواتین، صاحبوں کی میسیں، کالج اور یونیورسٹی کی طالبات کسی بھی تقریب میں نئے جوڑے کے بغیر جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتیں۔ خود پرستی، خودنمائی اور خودتشہیری اب پاکستانی قوم کا ٹریڈ مارک بن چکی ہے مگر مجھے دہلی کی محفلوں، تقریبات اور عشائیوں میں اس کے برعکس نظر آیا۔ استثنائی اقلیت سے قطع نظر خواتین کی اکثریت کو میک اپ کے بغیر سادہ لباس میں پایا۔ ہماری خواتین جس طرح سر کے ربن سے لے کر پاؤں کی جوتی، جراب اور اس کے ساتھ ساتھ لپ اسٹک کی میچنگ کے خبط میں مبتلا ہیں وہاں کی لڑکیوں کی اکثریت کو اس جنون سے آزاد پایا! میں نے اس موضوع پر ایک دن شمع افروز زیدی سے کہ "جو خود بھی نہیں محتاج زیور کا" کی چلتی پھرتی تصویر ہیں، گفتگو کی تو کہنے لگیں کہ یہاں طالبات کے لیے میک اپ اور پرفیوم کا استعمال پسند نہیں کیا جاتا، اسی طرح لباس پر بھی زیادہ خرچ نہیں کیا جاتا۔ ہاں شادی بیاہ کی بات اور ہے جہاں دل کھول کر ارمان نکالے جاتے ہیں۔ ملازمت پیشہ خواتین میں سے بیشتر کپڑوں کی طرف تو توجہ دیتی ہیں لیکن زیادہ میک اپ نہیں کرتیں اور اسی لیے سڑکوں، دکانوں اور دفتروں میں سانولے چہروں کا سیلاب رواں رہتا ہے۔ ان کے برعکس ہماری کالیاں گورا بننے کے چکر میں عمر بھر میاں کا پیسہ اور چہرے کی جلد برباد کرتی رہتی ہیں۔ اس کے باوجود بھی یہ احساس رہتا ہے:

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ہماری خواتین کے چہرے اور جسم کی متضاد صورتحال کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا چہرہ اور ہاتھ الگ الگ رنگ کے ہوتے ہیں اور ان میں سے اکثریت کی صورت یہ ہے کہ میک اپ کے بغیر آئینہ دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتیں۔

یہ درست ہے کہ دہلی میں سانولے چہروں میں یکسانیت کا سا احساس ہوتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض چہروں کا نمک ایسا تھا کہ نظر اور قدم بیک وقت ٹھٹک کر رہ جائیں۔ وہ جو پرانی کتابوں میں پڑھتے تھے کہ فلاں صاحب گھر سے کسی کام کے لیے نکلے مگر راہ میں ایسا چہرہ دیکھا کہ ہر طرح کے کام سے گئے اور اس کے پیچھے چل دیئے تو مجھے دہلی کے بعض نمکین چہروں نے اس کی وجہ بھی سمجھا دی بلکہ ایسے دوراہے بھی آئے کہ جی چاہا پاسپورٹ چاک کردوں اور میر تقی میر کا ہم زبان ہو جاؤں:

قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

ادبی تقاریب میں گل پاشی

دہلی میں قیام کے دوران مجھے دو کانفرنسوں، متعدد ادبی تقاریب اور استقبالیوں میں شرکت

کا موقع ملا۔ اس ضمن میں ایک بات جو بہت بھائی وہ تھی "گل پاشی"، یعنی صدر، مہمان خصوصی اور دیگر اہم مہمانوں کو پھولوں کے ہار پہنانا، ہندوؤں کے لیے تو یوں بھی درخت (پیپل) پودے (تلسی) اور پھول (گیندا) اساطیری تقدس کے حامل ہیں اسی لیے ان کی مذہبی اور سماجی تقاریب میں ان کا کسی نہ کسی طرح کا استعمال لازم ہوتا ہے لیکن مذہب سے قطع نظر ادبی تقاریب اور مشاعروں کو بھی آرائش گل سے بہار بداماں کر دیا جاتا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے اہم شخصیات یا پھر خواتین (خوبصورت ہوں تو اور بھی موزوں) کو زحمت دی جاتی اور یہ پھول مالا خوبصورت اور فنکاری کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔ جب ہم ور مالا اور جے مالا اور ان سے وابستہ بعض تاریخی واقعات کو ذہن میں لائیں تو ان کی تاریخی قدامت اور اساطیری اہمیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ ہمارا نودولتیا اور تصنع پسند معاشرہ بھی ہار پسند کرتا ہے لیکن یہ پھولوں کے برعکس تلہ اور نوٹوں کے ہار ہوتے ہیں۔ نوٹوں کے ہار تو کثیر المقاصد قسم کی چیز ہیں اور شادیوں میں سلامی سے لے کر صاحب کو نذرانہ پیش کرنے تک ان سے ہر طرح کا کام لیا جاتا ہے۔

علی صدیقی نے ہم مندوبین کے اعزاز میں جو استقبالیہ دیا، اس کی آرائش میں پھولوں کی افراط کا یہ عالم تھا گویا فلاور شو ہو۔ چنانچہ جب مہمانوں کو اظہار خیال کے لیے کہا گیا تو میں نے تمام گفتگو پھولوں کے حوالہ سے کی۔ تقریب کے بعد میں نے شمع افروز زیدی سے کہا کہ اتنے پھول دیکھ کر میرا تو جی چاہتا ہے ایک اور ولیمہ کرالوں۔ اس پر وہ گویا ہوئی "اچھا! لاہور سے آئے ہوئے چار دن ہوئے ہیں اور آپ نے ولیموں کی باتیں شروع کر دیں۔ میں ابھی بھابی کو فون کرتی ہوں کہ تمہارے میاں دہلی میں بہک رہے ہیں"...... اور یوں اس ظالم نے ہمارے غبارے میں سوئی چبھو دی۔

رحمان نیر صاحب نے "بیسویں صدی" کی جانب سے میرے لیے جس تقریب کا اہتمام کیا اس میں شمع افروز زیدی نے میرے گلے میں گلاب کے پھولوں کا جو ہار ڈالا، وہ اتنا خوبصورت تھا کہ مرجھا جانے پر بھی پھینکنے کو جی نہ چاہا اور آخری دن تک اس کی خوشبو سے میرا کمرہ مہکتا رہا چنانچہ دہلی کی خوشگوار یادوں میں پھولوں کی مہک بھی شامل ہے۔

ہم اور وہ

سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے ملک سے پھول عنقا ہو گئے یا ذوقِ گل بینی کی جگہ محض شوقِ گل چینی ہی رہ گیا؟

اس انداز پر اور بھی کئی باتوں میں موازنہ کیا جا سکتا ہے مثلاً وہاں کا مسلمان ہمارے مقابلے

میں زیادہ بہتر اور پکا مسلمان ہے۔ مسجدیں زیادہ پُر رونق اور مُلّا متشدّد۔

ہماری سڑکوں کے مقابلے میں وہاں کی سڑکوں پر پولیس بہت کم نظر آئی۔ ہمیں تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا ہم پولیس سٹیٹ میں زندگی بسر کر رہے ہیں جہاں دن رات سڑکوں پر پولیس ''عیدی'' وصول کرتی رہتی ہے اور جہاں تھانہ، تھانیدار کا ذاتی عقوبت خانہ ہے۔

سڑکوں اور بس سٹاپوں پر کاروں اور موٹر سائیکلوں والے بگڑے امیرزادوں کی غنڈہ گردی کے مظاہرے نسبتاً کم دیکھے جاتے ہیں۔ تعلیمی اداروں کی فضا ہمارے مقابلہ میں کہیں زیادہ صاف ہے اور بالعموم مخلوط تعلیم ہونے کے باوجود بھی اخلاقی فضا معتدل ہے۔

نمستے کا فلسفہ

ہماری ملاقات ہو تو صرف السلام علیکم سے کام چل جاتا ہے کہ اس میں جو ہمہ گیری ملتی ہے وہ کثیر المقاصد ہے مگر وہاں ایک دن میں متعدد الفاظ سننے کو ملتے۔ آداب، گڈ مارننگ، نمستے، نمسکار، جے رام جی کی، رام رام، تسلیم اور کبھی کبھار السلام علیکم بھی۔ ان تمام الفاظ میں سے آداب غیر وابستہ لفظ ہے نہ اسلامی نہ غیر اسلامی سیکولر لفظ، اسی لیے زیادہ تر یہی استعمال ہوتا حتیٰ کہ مسلمان بھی بالعموم اسی کا سہارا لیتے۔

مجھے اس سلسلے میں خاصی الجھن ہوتی میں عادتاً السلام علیکم کہہ کر مصافحے کو ہاتھ بڑھا دیتا اور جواباً دونوں ہاتھ جوڑ کر نمسکار کر دیا جاتا۔ غالباً اس لحاظ سے ہندو دنیا بھر میں منفرد ہیں کہ ان کے ہاں مصافحہ اور معانقہ سے پرہیز کیا جاتا ہے۔ فریقین کے ہاتھ جوڑ کر نمستے کہنے میں اظہار عجز کے ساتھ لمس سے گریز بھی شامل ہے۔ میں نے نمستے کی رمز پر خاصہ غور کیا تو بنیادی وجہ چھوت چھات کے نظام کی ضمنی پیداوار نظر آئی۔ بے لمس سماجی روابط کا یہ انداز ہندو معاشرہ سے ہی مخصوص نظر آتا ہے۔ یہ الگ بات کہ اب وہاں شریمان جی تو نمستے کریں اور شریمتی جی مصافحہ! معانقہ کی البتہ کوئی صورت نظر نہ آئی۔

ویسے ایک بات ہے کہ خوبصورت ہندنی سانولی مخروطی انگلیوں سے نمستے کرتے وقت گویا خود سپردگی کی تصویر بن جاتی یوں کہ حسن میں مزید کشش پیدا ہو جائے۔ پامیلا نے یوں ہی تو برطانیہ کے وڈیروں کو تگنی کا ناچ نہ نچوایا تھا۔

بھارت تضادات کا ملک ہے۔ ایک طرف ایٹمی دھماکہ کرتے ہیں، اگنی میزائل چلاتے ہیں اور خلاء میں مصنوعی سیارہ چھوڑتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی گائے، ناگ، بندر، پیپل اور تلسی کی پوجا بھی ہوتی ہے جبکہ جنوبی ہند میں شیولنگ کے مندر عام ہیں جہاں عورتیں اولاد لینے جاتی ہیں اور یہی نہیں بلکہ

ابھی تک دیوداسیاں بھی ملتی ہیں اور ان کے ساتھ وہ سب کچھ کیا جاتا ہے جو ایسی داسیوں کے ساتھ ہو سکتا ہے۔

کسی زمانہ میں یونانی اور رومی اساطیر کو بہت عروج تھا مگر مسیحیت اور پھر تعلیم اور سائنس نے عملاً ان کا خاتمہ کر دیا جبکہ اسلام نے مصری اساطیر کو کالعدم کر دیا لیکن ہندوستان واحد ملک ہے جہاں پانچ ہزار برس پرانی اساطیر، ان سے وابستہ عقائد اور ان سے جنم لینے والی رسوم اور توہمات کروڑوں افراد کی عملی زندگی میں موثر کردار ادا کر رہی ہیں۔ لگن کے لیے شبھ گھڑی کا تعین، کسی بڑے آدمی کا سو برہمنوں کو کھانا کھلانا اور اودکھاٹن کے لیے ناریل توڑنا، ٹیکسی ڈرائیور کا بجرنگ بلی کی تصویر لگانا، عمارتوں پر ''اوم'' لکھنا، سانپ کو دودھ پلانا۔ یہ سب ایسے اساطیری مظاہر ہیں جو ایک عام بھارتی کی زندگی میں یوں رس بس چکے ہیں کہ اس نے کبھی ان کی پانچ ہزار سالہ قدامت پر غور نہیں کیا ہوگا۔ اسی اساطیری عمل نے تخلیقی سطح پر اظہار پا کر رقص اور موسیقی (اور بالخصوص بھجن) کی صورت میں تہذیبی ورثہ کی صورت اختیار کر لی، کون ہے جو میرا بائی کے بھجن سنے اور متاثر نہ ہو؟ یہی وجہ ہے کہ اساطیر، قدیم تاریخ، علم الانسان جیسے علوم سے دلچسپی رکھنے والے محققین کے لیے بھارت ایک ''زندہ تجربہ'' کی حیثیت رکھتا ہے۔ بھارت اجتماعی نفسیات کی بھی تحیر انگیز مثالیں پیش کرتا ہے۔ سانپ کو دودھ پلانے والا، بندر کو نمسکار اور گائے کو پرنام کرنے والے بھارتی اجتماعی جنون (Mass Psychosis) میں مبتلا ہو کر انسانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیتے ہیں۔ مسلمانوں اور سکھوں کے ساتھ جو ہو رہا ہے، وہ تو سب پر عیاں ہے۔ حد تو یہ ہے کہ جنوبی ہند میں اب بھی اونچی جاتی کے لوگ عمارتوں کی بنیادوں میں اچھوت کی کھوپڑیاں گاڑ دیتے ہیں۔ یہ سب اسی اساطیر کے مظاہر ہیں جس کی جڑیں ہندو سائیکی میں اتنی گہری پیوست ہیں کہ وہ ان کے بغیر زندگی بسر کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا اور وہ کتنا ہی آزاد خیال، تعلیم یافتہ اور جدید کیوں نہ بن جائے، اساطیر سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا اور دیکھا جائے تو ان ہی تضادات کی وجہ سے ہندو اور ہندو معاشرہ کا مطالعہ دلچسپ ثابت ہوتا ہے۔ اسے اس مثال سے سمجھئے کہ تمام دنیا میں مادرانہ سربراہی والا معاشرہ ختم ہو چکا ہے لیکن بھارت کے مشرقی علاقوں یعنی آسام، میزورم، میگھالے وغیرہ میں اب تک یہ نظام فعال ہے۔

آنندی

میں ادبی جلسوں اور ادیبوں سے ملاقاتوں میں ایسا الجھا کہ دہلی کی سیر کا موقع نہ مل سکا۔ اگرچہ دہلی کے تاریخی مقامات کی مانند وہاں کے بعض ادیب بھی ہمارے لیے قابل دید ثابت ہوئے۔

اب یہ الگ بات ہے کہ معاصرین انہیں ناقابل دید قرار دیتے تھے لیکن ادیب ہونے کی وجہ سے ان زندہ آثارِ قدیمہ میں بھی میرے لیے دلچسپی کا خاصہ سامان تھا اور میں اب تک اسی پر گزارہ کیے جا رہا تھا، تاہم پہلی مرتبہ دہلی آنا اور تاریخی عمارات سے صرفِ نظر کرنا بھی زیادتی ہوتی جبکہ ہم پاکستانیوں کے لیے تو یہ عمارتیں محض سنگ وخشت سے بڑھ کر مسلم تہذیب کی نشانیوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ مسلمانوں نے ہندوستان کو کیا دیا، تاریخیں اس کے تذکرے سے معمور ہیں جبکہ ڈاکٹر تاراچند نے تو اپنی تحقیق کا موضوع ہی یہ بنایا ''اسلام کا اثر ہندوستانی تہذیب پر!'' ادھر مغل سلطنت نے ہندوستان کو جو کچھ دیا اس کی فہرست بھی طویل ہے۔ ان کے زندہ تحائف میں سے اردو زبان، عطر گلاب، راگ درباری، تاج محل اور مغل منی ایچرز کی اہمیت سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے؟

دہلی میں بہت کچھ دیکھا مگر خواہش کے باوجود غلام عباس کی ''آنندی'' نہ دیکھ پایا۔ قمر الدین صاحب تو بڑے تابعدار شوہر اور نستعلیق انسان ہیں انہیں تو غالباً ادھر کے راستہ کا بھی علم نہ ہوگا۔ ہمارے ادیب عام طور پر ایسے مقامات پر جانا پسند نہیں کرتے مگر میں سمجھتا ہوں کہ ایسے مقامات کا ''سب کلچر'' ملکی کلچر کے وسیع کُل کا ایک اہم جزو ہوتا ہے جس سے اغماض تو برتا جا سکتا ہے مگر انکار ممکن نہیں! بہر حال کوئی ایسا نہ ملا جو مجھے ''آنندی'' کے آثار دکھانے لے جاتا۔

خودکشی بذریعہ قطب مینار

قمر الدین صاحب نے اپنی تمام قانونی مصروفیات کو ایک دن کے لیے معطل کیا اور صبح سویرے گاڑی لے کر آ گئے۔ بولے ''آج کا دن آپ کے لیے وقف ہے، ساری دہلی گھومتے ہیں۔''

قطب مینار پہنچے تو اگرچہ زیادہ وقت نہ تھا مگر بے حد رش تھا۔ ملکی اور غیر ملکی کیمرے لیے گویا قطب مینار پر حملہ آور تھے۔ غالباً اٹلی میں پیسا کے لیننگ ٹاور کے بعد یہ مینار دنیا کے مشہور ترین میناروں میں شمار ہوتا ہے، البتہ پیرس کا دو سو سال پرانا ایفل ٹاور ان سب سے زیادہ مشہور ہے کہ وہ اب پیرس کی علامت بن چکا ہے۔

علامہ اقبال نے کہا تھا کہ پٹھانوں کی عمارات جلال کی مظہر ہیں جبکہ مغل عمارات میں جمال کا عنصر غالب ہے۔ قطب مینار دیکھیں تو علامہ کی بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ مسجد کا نام قوت الاسلام بھی جلال کا حامل ہے جبکہ لال قلعہ میں موتی مسجد اور تاج محل جمال کے مظہر ہیں۔ تاج محل کی مانند قطب مینار بھی مردوں اور عورتوں کے مختلف تلازمے ابھارتا ہے جو بسا اوقات ان کی نفسی ترنگ کے غماز ہوتے ہیں۔

ہم گئے تو ایک حصے کی مرمت ہو رہی تھی اور اوپر چڑھنے کا دروازہ بند۔ قمر الدین صاحب نے بتایا کہ دکھی دلوں نے خودکشی کے لیے مینار کو منتخب کر رکھا تھا، لہٰذا دروازہ بند کر دیا گیا لیکن دروازہ بند کرنے والے یہ بھول گئے ریل کی پٹڑی اور جمنا کا فاصلہ زیادہ نہیں۔

مسجد کے صحن میں لوہے کا ایک مینار ایستادہ ہے بالکل سلنڈر نما مگر زیادہ بلند نہیں۔ کالج کے لڑکوں کی ایک ٹولی اسی کے گرد کھڑی تھی۔ ایک لڑکا آگے بڑھتا، اس کے ساتھ کمر جوڑتا اور پشت پر سے ہاتھوں کو جوڑنے کی کوشش کرتا مگر جب ہاتھ نہ ملتے تو شرمندہ ہو کر ہنستا ہوا ہٹ جاتا اور باقی زور زور سے قہقہے لگاتے، اس کے بعد قہقہوں کے شور میں دوسرا آگے بڑھتا، ناکام ہوتا اور قہقہوں کے شور میں شرمندہ ہوتا۔ قمر الدین صاحب نے بتایا کہ اس کے بارے میں یہ روایت ہے کہ اگر یوں دونوں ہاتھ نہ مل سکیں تو وہ حرامی ہوتا ہے۔ وہ کہنے لگے، ہم بھی بچپن میں آ کر اسی طرح کی حرکتیں کرتے تھے (مگر میں نے مارے احترام کے نتیجہ دریافت نہ کیا) اس اطلاع کی روشنی میں میں نے لڑکوں کی کوشش کو نئی دلچسپی سے دیکھنا شروع کیا۔ ایک بھی مینار کے معیار پر پورا نہ اترا۔ ''ہائیں! یہ بھارتی ناریوں کو کیا ہو گیا ہے۔''

کوئی ویرانی سی ویرانی

علاء الدین خلجی کا علائی دروازہ اور التمش کا مزار بھی وہیں تھا۔ مزار شاید کبھی دیدہ زیب ہوگا اب تو اس کی چھت کا گنبد بھی ندارد تھا اور بے گنبد چھت کے گول سوراخ سے نیلا آسمان دیکھ کر کسمپرسی کا احساس ہوتا ہے۔

رضیہ بیچاری کو یہاں جگہ نہ مل سکی۔ مسلم تاریخ کی پہلی سلطانہ جس نے ہر ممکن طریقے سے مردانہ معیار کے مطابق حکومت کرنے کی کوشش کی۔ شاید تاریخی لحاظ سے وہ کامران نہ رہی مگر اس معاشرے کے لحاظ سے وہ یقیناً باہمت، پرعزم اور خود اعتماد خاتون تھی۔ آج جمہوریت کے زمانے میں اگر بے نظیر کی اتنی مخالفت ہو سکتی ہے تو اس قدیم معاشرے کے دربار اور سازشی امراء کے عہد میں حکمران عورت کی مشکلات کا اندازہ لگانا دشوار نہیں۔ ویسے بھی شاہی جب تک موجود رہتی ہے، سر چڑھ کر بولتی ہے لیکن خاتمے کے بعد بے کسی کے تلخ ثمر کے ساتھ ہاتھ کچھ نہیں آتا اور دنیا صرف ان سے عبرت حاصل کر سکتی ہے۔ چند خوش نصیب بادشاہوں کو چھوڑ کر کہ جن کے کارناموں نے ان کا نام زندہ رکھا، خوبصورت مقابر محفوظ رہ گئے۔ اکثریت کے مزاروں کے نام ونشان بھی نہیں ملتے۔ وہی آتش والی بات:

نہ ہے قبر دارا نہ گورِ سکندر!
مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے

صفدر جنگ اور ہمایوں کے مقبرے البتہ بہت زیدہ زیب لگے۔ دونوں مقابر مغل فنِ تعمیر کی خوبصورت مثالیں پیش کرنے کے ساتھ تاج محل کے اندازِ تعمیر کے پیش رو بھی ہیں۔ مغل ذوقِ جمال کے مطابق یہ وسیع چمنستان میں تعمیر کیے گئے ہیں۔ ہمایوں کا مقبرہ اس بنا پر تاریخی اہمیت کا حامل ہے کہ 1857ء میں سقوطِ دہلی کے وقت بہادر شاہ ظفر اہل خانہ کے ساتھ اس مقبرہ میں روپوش ہوئے۔ اس توقع پر کہ انگریز مقبرے کے تقدس کا احترام کرتے ہوئے اس میں پناہ گزینوں کو گزند نہ پہنچائیں گے لیکن انہیں غالباً ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریزوں کی فطرت کا اندازہ نہ تھا۔

پُراسرار مشرق کا سپیرا

ہم جب مقبرہ دیکھنے پہنچے تو مرکزی دروازے کے سامنے سڑک پر ایک سپیرا اپنے گلے میں اجگر سانپ کو ڈالے طرح طرح کی حرکتیں کر رہا تھا اور غیر ملکیوں (غالباً امریکن) کی ایک ٹولی اس کی تصویریں بنا رہی تھی۔ یورپ کے وہ بھولے بھالے دولت مند جو پراسرار مشرق کی تلاش میں ان علاقوں میں آتے ہیں، یادگار کے طور پر ایسی تصاویر لے جاتے ہیں جبکہ پراسرار مشرق کے سیاہ فام باشندوں کی دال روٹی کا اسی بہانے بندوبست ہو جاتا ہے۔ ویسے بھی ان دنوں یورپ اور بالخصوص امریکہ میں علم نجوم، کالا علم، جادو ٹونے اور مافوق الفطرت وغیرہ سے جو دلچسپی ظاہر کی جارہی ہے ہم اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے کیونکہ عقل پرستی کی بنا پر ہم ان سب کو توہمات قرار دے کر ان سے منکر ہونے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن مغرب میں اب بڑے بڑے لوگ اور معروف شخصیات ان میں کس حد تک دلچسپی لے رہی ہیں، کولن ولسن اور شرلے میکلینز کی کتابیں پڑھ کر کسی حد تک اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی گرو رجنیش قسم کے لوگوں اور ہرے، کرشنا ہرے راما کے کلب اور حشیش گانجہ اور چرس کی وجہ سے بھارت اب اس قماش کے لوگوں کے لیے خصوصی کشش کا حامل ثابت ہو رہا ہے۔ منشیات کے دھندے کی بدنامی پاکستان کے حصہ میں آئی جبکہ ڈالر بھارت کما رہا ہے اور اس ضمن میں بھارت کا رویہ بالکل بنیوں جیسا ہے کہ ڈالر حاصل کرنے کے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا مثلاً بیشتر بڑے ہوٹل بلوں کی ادائیگی روپے کی بجائے غیر ملکی کرنسی میں طلب کرتے ہیں۔

لال قلعہ میں لاہوری دروازے سے جائیں تو یوں محسوس ہو گا گویا ہم انارکلی میں داخل ہو گئے ہیں۔ ایک طویل بازار ہے جس میں کپڑا، مورتیاں، نقلی زیورات، برتن اور اسی انداز کی اشیاء کی دو

رویہ دکانیں ملیں گی اور ظاہر ہے کہ قیمتیں معمول سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں۔ مغل مینا بازار لگاتے تھے، ان کے قلعے کو ایک عام بازار میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

لال قلعہ خاصی خستہ حال میں نظر آیا۔ روشِ دھول سے اٹی، فوارے سوکھے، پانی کی تہہ کائی آلودہ، دیواروں کی نقاشی آلودگی کی شکار، خوبصورت بیل بوٹوں میں سے رنگین پتھر کھرچے ہوئے اور درو دیوار نڈھال۔ الغرض! چار اطراف سے عدم توجہی کا احساس ہوتا ہے۔ حالانکہ ٹکٹوں کی فروخت سے بھی بہت کچھ حاصل ہو جاتا ہے اسی کو قلعے کی مرمت اور تزئین کے لیے خرچ کیا جا سکتا ہے۔ البتہ قلعے کا چھوٹا سا میوزیم اچھا لگا جس میں غالب کی حقے والی مشہور پینٹنگ بھی نظر آئی۔ رات کو ساز و آواز کا پروگرام بھی پیش کیا جاتا ہے۔ اس کی بہت تعریف سنی تھی مگر میں جانے کے لیے وقت نہ نکال سکا۔

محمد صالح کمبوہ کی ''شاہجہان نامہ'' میں شاہجہان آباد اور لال قلعہ کی تعمیر کی دلچسپ تفصیلات ملتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی تعمیر میں کتنا وقت اور دولت صرف ہوئی تھی۔ کبھی یہاں پرندہ پر نہ مار سکتا ہو گا اب ایک جم غفیر تھا۔ ہنستے، کھیلتے، بھاگتے، دوڑتے اور شور مچاتے۔ 15 راگست کی تقریبات میں صدر اور وزیر اعظم یہاں سے سلامی لیتے اور خطاب کرتے ہیں۔

پھول، سکون اور تازہ ہوا

ہندو دھرم میں اگنی مقدس ہے اس لیے شادی کے وقت آگ کے گرد پھیرے لیے جاتے ہیں اور نعش کو شعلوں کے بستر پر سلایا جاتا ہے یوں کہ غالب کے اس شعر کی تصویر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہے:

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

کیونکہ جسم اور دل دونوں جل جاتے ہیں اس لیے ہماری مانند ان کے ہاں مزار و مقابر کا تصور نہیں ملتا، تاہم اہم تاریخی شخصیات کی راکھ دبا کر انہوں نے جو یادگاریں بنائیں وہ پرفضا بھی ہیں اور فنکارانہ بھی۔

مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لعل نہرو اور اندرا گاندھی کی یادگاریں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ سینکڑوں ایکڑ پر پھیلے وسیع سبزہ زار میں پھول، سکون اور تازہ ہوا! گاندھی کی سادھی چمکیلے سیاہ ٹائلز سے بنائی گئی ہے اور ہر وقت عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا ہے۔ مرد عورت آتے اور پرنام کرتے، ''چرن'' چھوتے یا سجدہ کرتے۔

پنڈت جواہر لعل نہرو سیکولر ذہن کے تھے، لہٰذا وصیت کی تھی کہ میری راکھ کو تمام ہندوستان کی زمین پر پھینکا جائے تاکہ صحیح معنوں میں خاکِ وطن سے مل کر ایک ہو جائے، لہٰذا نہرو کی یادگار میں اس کی راکھ نہیں دبی۔ 1965ء کی جنگ میں ایوب خان کو سیاسی مات دینے والے لال بہادر شاستری کی یادگار بھی پاس ہی نظر آئی مگر ادھر زیادہ لوگوں کو نہ دیکھا۔ ظاہر ہے اس میں نہرو خاندان والی کشش نہیں۔

ذاتی طور پر مجھے اندرا گاندھی کی یادگار بہت پسند آئی۔ وہ مزاج کے لحاظ سے جیسی آرٹسٹک خاتون تھی، اس کی یادگار بھی ویسی ہی بنائی گئی۔ کھلا سبزہ زار اور صاف ستھری روشیں پھر ہلکا سا فراز اور پھر خوبصورت ٹائلز سے بننے والے مستطیل میں یک رنگ پودوں کے قطعہ میں ایک ناتراشیدہ پتھر دھرتی کے سینے سے سنگی شعلے کی مانند لپکتا محسوس ہوتا ہے، اگر یہ اندرا گاندھی کی بے لچک فطرت کی علامت ہے تو اس سے زیادہ بلیغ علامت نہ ہو سکتی تھی۔ اس ناتراشیدہ چٹان میں اپنی ایک انوکھی شان ہے اور جس زاویئے سے بھی دیکھو نیا حسن نظر آتا ہے۔ میں نے سب سے زیادہ تصویریں اسی کی اتاریں۔

یادگار کے وسیع سبزہ زار میں مختلف مقامات پر بھارت کے مختلف علاقوں سے مخصوص ناتراشیدہ پتھر رکھے تھے۔ ہر پتھر کے ساتھ اس کا نام اور علاقے کی وضاحت کر دی گئی تھی۔ گھاس پھول اور مختلف رنگوں، حجم اور صورتوں کے ناتراشیدہ پتھر یہ سب دسمبر کی سہ پہر کی مہربان دھوپ میں عجیب حسن اور سکون کا احساس پیدا کر رہے تھے۔

ہماری مساجد میں تازہ ہوا کی وجہ سے وسعت اور پھیلاؤ کا احساس ہوتا ہے جبکہ اس کے برعکس مندر چاروں طرف سے بند ہوتے ہیں جس کے نتیجہ میں گھٹن کا احساس ہوتا ہے لیکن جدید بھارت کی بانی ان شخصیات کی یادگاروں میں تزئین کے لیے فطرت پر انحصار کیا گیا ہے جس کے نتیجہ میں سادگی میں بھی بانکپن پیدا ہو گیا اور دہلی کے شور و شغب، بھیڑ بھاڑ اور آپادھاپی سے تنے اعصاب یہاں آکر سکون پذیر ہو سکتے ہیں۔

مرزا غالب

میں غالب سیمینار کے لیے مدعو کیا گیا تھا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ مرزا غالب کے مزار پر حاضری نہ دیتا۔

کسی زمانے میں بستی نظام الدین شہر سے باہر ہو گی مگر اب یہ بھی دہلی کے پھیلاؤ کا ایک حصہ

ہے۔ اسی بستی میں غالب کا مزار ہے جس کے پہلو میں غالب اکیڈمی ہے جہاں شریف نقوی صاحب معتمد ہیں۔ تنگ کوچے میں دونوں طرف دکانیں، خوانچے اور ریڑھیاں ہیں، ان میں پھول بیچنے والے بھی ہیں اور سبز چادریں، مذہبی تصانیف اور کھانے پینے کی چیزیں فروخت کرنے والے بھی۔ کوچہ حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار کو جاتا ہے اور منظر بالکل لاہور میں حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار والی گلی سے مشابہہ ہے حتیٰ کہ اسی طرح ہاتھ پھیلائے فقراء کی دورویہ قطاریں بھی ملیں۔

غالب کا مزار پہلے آتا ہے۔ اس کی دیوار کے ساتھ ایک کبابیہ بڑے اہتمام سے کوئلے دہکا رہا تھا۔ پختہ احاطے میں سنگ مرمر کا سفید مزار باہر کی رونق اور شور سے الگ اور تنہا نظر آیا۔

فاتحہ کو ہاتھ اٹھاتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں میرا اپنا دفن ہے۔ اب تک جن بزرگوں کے مزارات، بادشاہوں کے مقابر اور تاریخی شخصیات کی یادگاریں دیکھیں، وہ سب عظیم تھے ان کی عظمت سے مرعوب ہوا جا سکتا تھا، ان کے کارناموں پر آفرین کی جا سکتی تھی یا پھر انہیں حصولِ عبرت کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا مگر ان سے ہم کلامی ممکن نہیں مگر یہاں وہ غالب سو رہا تھا جو پرکشش شخصیت کا حامل، خوبصورت فطرت والا انسان اور خواب دیکھنے والا حسّاس فنکار تھا۔ عوام جو اسے چچا غالب کہتے ہیں تو یہ محبت اور اپنائیت یوں ہی نہیں مل جاتی۔

غالب کا سنگ مرمر کا یہ مقبرہ نامور ہدایت کار اور فلم ساز سہراب مودی نے اپنی فلم ''غالب'' کی کامیابی کے بعد بنوایا تھا، فلم میں بھارت بھوش کے ساتھ ثریا نے اداکاری کے جوہر دکھائے تھے۔ فلم کو صدارتی ایوارڈ ملا تھا اپنے وقت کا خوبرو اور مقبول ہیرو بھارت بھوشن اب کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہا ہے اور لاکھوں دلوں کی دھڑکن ثریا ابھی تک مس ہے اور بے حد موٹی ہو چکی ہے۔

مزار سے باہر غالب کی اہلیہ امراؤ بیگم کی قبر نظر آئی۔ قبر اگرچہ پختہ تھی مگر کتبے کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے۔ بیچاری امراؤ بیگم وہ رئیس زادی جو شاعر کے پلے بندھ گئی، جو اپنے خاوند کی پیچیدہ تخلیقی شخصیت کو سمجھنے میں ناکام رہی، اس کی مے نوشی سے سمجھوتہ نہ کر پائی اور بالآخر کھانے پینے کے برتن الگ کرنے پر مجبور ہوئی اور مرنے کے بعد بھی وہ اسی ریت کو نبھاتی نظر آ رہی تھی۔ اس احاطہ میں عارف کی قبر بھی نظر آئی وہی جواں مرگ زین العابدین عارف جو مرزا غالب کی بیوی کا بھانجہ، غالب کا منہ بولا بیٹا اور شاگرد بھی تھا۔ اچھا شاعر تھا، غالب کی یہ غزل دراصل عارف کا مرثیہ ہے:

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

اسی احاطہ کی پشت پر چھوٹا سا ایک اور قبرستان بھی نظر آیا۔ کتبوں پر نظر ڈالی تو غالب کے خسر

نواب لوہارو کی قبر نظر آئی اور ان کے پاس مشہور شاعر ساغر نظامی کو خوابیدہ پایا جبکہ غالب اکیڈمی کی پشت پر ایک احاطہ میں مرزا کوکلتاش اور دیگر امراء کی سنگ مرمر کی قبریں نظر آئیں۔ یہاں سنگ مرمر کا بے حد خوبصورت اور نفیس کٹ ورک نظر آیا۔ مرزا کوکلتاش کی قبر پر ایک سیاہ بلی گہری سبز آنکھوں سے منیر احمد شیخ کو اور مجھے گھور رہی تھی۔ سفید قبر پر سیاہ بلی، عجیب منظر تھا۔ میں نے کیمرہ نکالا مگر جب تک میں فوکس کرتا بلی چھلانگ مار کر یہ جا وہ جا۔

دیوارِ گریہ

ہوا یہ کہ ایک شام مجتبیٰ حسین میرے ہوٹل کے کمرے میں تشریف لائے۔ ہم دونوں نے کسی تقریب میں اکٹھے شرکت کرنا تھی۔ میں نے انہیں بیٹھنے کو کہا اور خود جلدی سے اپنی عینک حسب عادت بستر پر پھینک کر کپڑے بدلنے کو غسل خانے میں جا گھسا۔ مجتبیٰ حسین عینک کے مونث ہونے سے اس پر جا لیٹے اور جب میں واپس آیا تو مزاح نگار کی جگہ شرمسار مرد کو پایا۔ اگلی شام ایم قمر الدین کہ میرے لیے اب وہ ہر مرض اور مسئلے کے لیے امرت دھارا بن چکے تھے، مجھے چاندنی چوک لے گئے۔ ان کا واقف عینک ساز تھا، اس لیے فریم میں جلد شیشے لگ جانے کی توقع تھی۔ یہ نک چڑھی عینک پردیس میں میرے ساتھ نہ جانے کیوں ایسا ہی حسن سلوک کرتی ہے۔ امریکہ میں بھی عینک کے ایک شیشے میں بال آ گیا، نیو یارک میں ایک سیاہ فام خاتون کی دکان کی سیلز گرل کے سامنے دل شکستہ کی مانند شکستہ شیشہ پیش کیا۔ یہ سوچ کر کہ شاید رنگ کا اشتراک کام آ جائے۔ اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور ایک نظر کریکڈ شیشہ کو اور بولی ''ہنڈرڈ بکس۔''

اسے تھینک یو (مگر دل میں برا بھلا) کہہ کر سوچا وطن عزیز میں یہ کام دو تین ڈالر میں کروالیں گے اور یوں تمام امریکہ کو اس کریک عینک کی مدد سے دیکھتا رہا۔ شاید اسی لیے کوئی لڑکی پسند نہ آ سکی۔ سفرنامہ میں یوں تو لڑکیاں نہیں ڈالی جا سکتیں کہ عینک ہی ٹھیک کراؤ۔ خیر صاحب! جب تک فریم میں شیشے فٹ ہوتے ہم دونوں نے چاندنی چوک کی سیر شروع کر دی۔ جس طرح ترکمان گیٹ سے اندر داخل ہوں تو اپنے بھاٹی لوہاری یاد آ جاتے ہیں اسی طرح چاندنی چوک سے انارکلی کی طرف دھیان جاتا ہے۔ وہی دکانیں، بھانت بھانت کے دکاندار اور دنیا و مافیہا سے بے خبر خریدار عورتیں۔ ماتھے پر بندیا ہے یا نہیں، اس سے فرق نہیں پڑتا۔ شاپنگ عورت کو کیسے اندھا کر دیتی ہے، اس کا مطالعہ بڑا دلچسپ بھی ہے اور مہنگا بھی۔ میں پہلے اسے محض نفسیاتی کمزوری سمجھتا تھا مگر اب اسے جنسی مسئلہ سمجھتا ہوں کہ شاپنگ کا جسم کی کیمسٹری کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔

قمر الدین بولے ''ہم مرزا غالب کے گھر کے قریب ہیں، چلیے آپ کو ان کا گھر دکھلاؤں۔''

میں فرطِ شوق سے بے تاب ہو گیا، میں کوچہ بلی ماراں کا وہ گھر دیکھوں گا جس میں غالب نے کتابِ زیست کے متعدد باب رقم کیے، غزلیں کہیں، خطوط لکھے، بیوی سے جھگڑا، شراب پی۔ 1857ء کے ہنگامہ میں اسی گھر میں بند ہو کر ''دستنبو'' لکھی اور یہی وہ گھر تھا جس کی چھت پر صبح صادق کو وہ زہرہ کی جلوہ گری کا مشاہدہ کیا کرتا تھا اور یہی وہ گھر ہے جس کی چھت ابر سے زیادہ ٹپکتی تھی۔

ایک موڑ مڑ کر قمر الدین بولے ''یہیں کہیں ہونا چاہیے تھا۔'' مگر کچھ بھی تو نہ تھا، کچھ کاریگر کام میں جتے تھے۔ شور تھا باتوں کا، ہنگامہ تھا ٹریفک کا۔ قمر الدین نے احاطے میں کام کرنے والے کاریگروں میں سے ایک سے پوچھا ''یہاں غالب کا گھر ہوتا تھا؟''

اسے غالباً ہم جیسے سرپھروں سے واسطہ رہتا تھا۔ اس نے ہاتھ روکے اور زبان کھولے بغیر گردن سے دیوار کی طرف اشارہ کر دیا۔

''کہاں؟ کدھر؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے بڑی بے زاری سے ایک دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ تب اندازہ ہوا کہ اب صرف یہی دیوار باقی بچی ہے۔ گھر اور اس کے صحن میں کاریگر کام کر رہے تھے۔ لوگوں نے میرے صحن میں رستے بنا لیے اور خود مرزا بھی تو کہہ گئے تھے:

بیٹھے ہیں راہ گزر پہ ہم

اور اب ہم وہیں کھڑے تھے۔ دیوار کیا تھی پرانی اینٹوں سے لالی جھڑ رہی تھی۔ یہ کمبخت اب تک گری کیوں نہیں؟ یہ درست ہے کہ خود غالب نے بھی کہا تھا:

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

لیکن اس شعر پر لفظ بہ لفظ عمل کرنے کی تو ضرورت نہ تھی۔ شاعر لوگ تو اس قسم کی بے سرو پا باتیں کرتے ہی رہتے ہیں۔

غالب اکیڈمی کی بالائی منزل میں غالب کے نام کا کتب خانہ ہے۔ اس کے پسندیدہ کھانے، پھل اور مرغوب مشروب سجائے گئے ہیں۔ ایک طرف غالب مسند نشین ہے۔ غالب کی آنکھوں میں جھانکنے پر، آنکھوں میں تو دم ہے کا احساس ہوتا ہے۔

پھر سوچتا ہوں، مجھے اتنا جذباتی ہونے کی کیا ضرورت؟ غالب کا کونسا آبائی مکان تھا، نہ ہی ایل ڈی اے نے بڑی سفارشوں کے بعد اسے پانچ مرلہ زمین الاٹ کی تھی اور نہ ہی اس نے ہاؤس

بلڈنگ فنانس کارپوریشن سے ''بلاسود'' قرض لیا تھا۔ ہر چند کہ عمر بھر قرض ہی لیتا رہا اور قرض کی مے بھی پیتا رہا۔ کرائے کا مکان تھا۔ سال بعد بی بی بھی چل بسی تھی تو پھر چھت آنگن اور دالان کس کام کے۔ ہمارا غالب مکان ومزار کا محتاج نہیں، ہمارے لیے تو وہ اپنے دیوان کے صفحات میں زندہ ہے:

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسد!

روشنی

حضرت نظام الدین اولیاء کا مزار مرجع خاص و عام ہے۔ یہ ان جلیل القدر صوفیاء میں سے ہیں جنہوں نے ہندوستان میں اسلام کا چراغ روشن کیا۔ احاطے میں داخل ہوں تو پہلے سفید جالیوں والا امیر خسرو کا چھوٹا سا مرقد آتا ہے جس کے مقابل شہزادی جہاں آرا آسودۂ خاک ہے۔ شہزادی خوش قسمت تھی کہ ایک ولی کے در پر سونے کی جگہ مل گئی اور قبر محفوظ رہ گئی ورنہ توسیع شہر کے منصوبوں نے بڑے بڑوں کی قبریں کھالیں۔ شہزادی زیب النساء کی قبر پر اب ریلوے پلیٹ فارم بن چکا ہے:

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

شہزادی جہاں آرا کے علم وفضل اور ذوقِ شعر کی معاصر تاریخیں گواہ ہیں۔ وہ فنون لطیفہ اور فنکاروں کی بھی قدردان تھی۔ ''شاہجہاں نامہ'' میں یہ لکھا ملتا ہے۔ شہزادی جہاں آرا ایک مرتبہ ہاتھی پر سوار ہو کر سیر گل کو گلستان میں آئی۔ ایک کم بخت شاعر بھی وہاں موجود تھا جس نے نقاب پوش شہزادی کو دیکھ کر یہ شعر پڑھ دیا:

برقع بہ رخ افگندہ برد ناز بہ باغش
تانکہت گل بیختہ آید بہ دماغش

یہ اپنے وقت کا مشہور شاعر جیدی طہرانی تھا۔ شہزادی نے اچھا شعر کہنے کا انعام تو پانچ ہزار روپے دیا مگر بدنگاہی کے جرم میں شہر بدر بھی کر دیا اور اب ہم گردن ٹیڑھی کیے کتبہ پڑھ رہے تھے۔ ایک امریکن ٹورسٹ تصاویر بنا رہا تھا۔ اس کی عورت لاتعلقی سے تمام منظر کو دیکھ رہی تھی۔ جین اور جیکٹ میں ملبوس، گلے میں لال اور سبز منکوں کی مالا غالباً باہر چھابڑی لگائے کسی ''جوہری'' سے خریدی ہوگی۔

امیر خسرو کے سفید مزار کو دیکھ کر عجب احساس ہوا۔ یہاں وہ جامع حیثیات شخصیت محوِ خواب ہے جس کی تہذیبی شخصیت نے ہندوستان کے عوام اور خواص دونوں پر انمٹ نقوش چھوڑے۔ وہ صوفی بھی تھے اور درباری بھی، شاعر بھی موسیقار بھی۔ فارسی کے عظیم اور قادرالکلام شعراء میں شمار ہوئے۔

اہل ایران گنتی کے جن چند ہندوستانی فارسی گو شعرا کی عظمت کو تسلیم کرتے ہیں، خسرو ان میں سرفہرست ہیں۔ لوک رس میں ڈوبی جو شاعری کی، وہ آج بھی عوام کی زبان اور دلوں میں زندہ ہے۔ اتر پردیش میں اب بھی شادی بیاہ کے موقعوں پر ان سے منسوب گیت گائے جاتے ہیں جن میں مقبول ترین گیت ''کاہے کو بیاہی بدیس رہے، سن بابل مورے'' بھی شامل ہے۔ ہندوی اور فارسی کے ملاپ سے جو ریختہ کہا، اس کی جداگانہ لسانی اہمیت ہے:

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں نہ دارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

امیر خسرو کو اپنے مرشد حضرت خواجہ نظام الدین اولیا سے جو محبت اور عقیدت تھی وہ آپ اپنی مثال ہے۔ مرشد کے انتقال کے وقت دہلی میں نہ تھے، واپسی پر انتقال کا علم ہوا تو یہ دوہا کہا:

گوری سوئے سیج پہ مکھ پہ ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چو دیس

مرشد کے انتقال کے بعد 18 شوال 725ھ (1325ء) کو انتقال کیا اور اب انہی کی پائنتی محوِ خواب ہیں۔ ہم جب پہنچے تو خسرو کے مزار کے قریب کچھ مسلمانوں کو گرم گرم بحث میں پایا۔ فاتحہ کو ہاتھ اٹھائے مگر ان کی کرخت آوازیں یکسوئی ختم کر رہی تھیں۔ معاملاتِ زر زیر بحث تھے۔ یہ لوگ غالباً مزار کے پروردہ ہوں گے۔

ہمارے صوفیاء نے زندگی بھر درس محبت دیا تھا جس سے جہاں لاتعداد غیر مسلم مشرف بہ اسلام ہوئے وہاں موت کے بعد بھی ان کے مزارات محبت فاتح عالم کی علامت ثابت ہوئے۔

ہندوستان کے کسی بھی حصے میں چلے جایئے، مسلمانوں سے تعصب اور نفرت کے باوجود لاتعداد ہندو مرادیں پانے کے لیے ان مزاروں کا رخ کرتے ہیں اور یہی میں نے یہاں بھی دیکھا کہ حضرت کے مزار پر مسلمانوں کے پہلو بہ پہلو تلک والے ہندو، ساڑھی میں ملبوس بندیا والی ہندو عورتیں (بعض کی گود میں بچے) اور سکھ بھی خمیدہ سر نظر آئے بلکہ جین میں ملبوس ایک لڑکی تو مجھے عیسائی لگی۔ یہ سب ضرورت مند تھے اور اس پاک آستانہ پر آرزوؤں کے چراغ روشن کرنے آئے تھے، خالی ہاتھ آتے اور جھولیاں بھر بھر کر لے جاتے، حضرت نظام الدین کی روشنی سب کے لیے تھی اور اب بھی ہے۔

جب چند برس پیشتر لاہور میں اداکار منوج کمار آیا تو اس نے ایک انٹرویو میں بتایا ''جب میرے دادا کو علم ہوا کہ میں لاہور جا رہا ہوں تو انہوں نے بطور خاص حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار پر حاضری دینے کی تلقین کی تھی۔'' چنانچہ منوج کمار داتا صاحب کے مزار پر گیا۔

ملّا مذہب سے محبت کو خارج کر دیتا ہے اسی لیے اس میں زِشت خوئی پیدا ہو جاتی ہے جبکہ صوفی کا مذہب ہی محبت ہوتا ہے اسی لیے وہ سب کا محبوب ہو جاتا ہے۔ ملّا مذہب سے مذہب کے پیروکاروں کو خوفزدہ کر دیتا ہے جبکہ صوفی غیروں کو اپنا بنا کر دائرہ اسلام میں لے آتا ہے۔ ہندوستان میں اسلام شاہوں نے نہیں بلکہ انہی بوریا نشین صوفیوں نے پھیلایا تھا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے نفرت اور تعصب میں کتنا اضافہ ہی کیوں نہ ہو جائے مگر جب تک ان اللہ والوں کے مزار و مقابر موجود ہیں، ہندو ان کی روشنی سے آنکھیں بند نہ کر سکیں گے۔

پاکستانی پولیس کو بلاؤ

ایک دن مجتبیٰ حسین کہنے لگے ''چلیں آپ کو لودھی گارڈنز دکھالائیں۔ ابھی تک لودھی گارڈنز تو نہیں دیکھے؟'' میں نے بتایا ''لودھی گارڈنز تو کجا میں ابھی تک جامع مسجد بھی نہیں جا سکا۔'' چنانچہ ہم نے لودھی گارڈنز کا رخ کیا۔ ساتھ ''شگوفہ'' حیدرآباد کے مدیر ڈاکٹر سید مصطفےٰ کمال بھی تھے۔ یہ جگہ بھی تاریخی آثار کی حامل ہے۔ مرقع عبرت بنے شاہی مقابر تھے۔ وسیع وفراخ مسجد میں سنگِ مرمر کے کٹ ورک میں آیات دیکھیں تو خوش نویسی کے اسلوب کے ساتھ سنگ تراش کی فنی مہارت کا بھی قائل ہونا پڑا۔ دور تک پھیلے سبز گھاس کے قطعات اور درمیان میں چھوٹی سی خوشنما نہر، دسمبر کی سہ پہر کی نرم دھوپ ماحول کو پرسکون بنا رہی تھی۔ ہوا کے تھکے تھکے جھونکوں میں ہلکی سی خنکی شامل تھی۔ ایسی خنکی جو اعصاب میں گدگدی کر دیتی ہے مگر ہمیں گدگدی ہو رہی تھی مجتبیٰ حسین کی دلچسپ باتوں اور ڈاکٹر مصطفےٰ کمال کے لطیفوں سے! کبھی یہ علاقہ شاہانہ اہمیت کا حامل رہا ہوگا، جبھی تو شاہی مقابر یہاں بنائے گئے تھے لیکن اب نہ شاہ تھے نہ شاہی، یہ جگہ عوامی سیر گاہ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ کبھی کبھی بمبئی کے فلم ساز، ہیرو اور ہیروئن کی بھاگ دوڑ اور اچھل کود والا گانا بھی فلما لیتے تھے۔ چلتے چلتے نگاہ جو دائیں جانب کی تو جھاڑیوں کی ''گپھا'' میں بیلوں میں تقریباً چھپی بنچ پر لڑکی لڑکا بیٹھے تھے بلکہ لڑکے سے میری آنکھیں بھی چار ہوئیں۔

میری آنکھوں نے کہا ''بچو پکڑے گئے۔ سرِعام فحش کرتے ہو۔''

اس کی آنکھوں نے تمسخر اڑاتے ہوئے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

میں نے چلتے چلتے ایک مرتبہ پھر گردن گھما کر دیکھا۔ وہ دونوں صنعتِ ادغام کی زندہ مثال بنے تھے۔

''وہ دیکھو ایک رومانٹک کپل۔''

مگر دونوں حضرات نے اسے کوئی خاص اہمیت نہ دی۔

تھوڑا آگے گئے تو گھاس کے ایک تختہ پر سردارانی جی لیٹی تھیں اور سردار جی ان کے پیٹ پر سر رکھے بسرام کر رہے تھے۔ اس مشاہدے کو کئی برس گزر چکے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ان کا سر پیٹ پر ہی تھا۔ یہ ٹین ایجرز نہ تھے بلکہ ادھیڑ عمر کے میاں بیوی، جبھی تو اوٹ کی ضرورت نہ تھی۔ میں نے سوچا بھلا مجھے خواہ مخواہ پریشان ہونے کی کیا ضرورت؟ ہوسکتا ہے ایسے گنجان آباد گھر میں رہتے ہوں کہ کھل کر بات چیت کا موقع نہ ملتا ہو یا گھر کی گھٹن والی فضا میں بے تکلف ہو کر پاس بیٹھنے کی سہولت نہ ہو، لہٰذا دسمبر کی سہ پہر کی نرم دھوپ میں کچھ دیر کو آسودہ ہو بیٹھے ہیں۔

اگر یہ دونوں اپنے علاقہ علامہ اقبال ٹاؤن کے گلشنِ اقبال میں حدِ ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے چھ فٹ کے فاصلے پر بھی بیٹھے ہوتے تو حدود میں دھر لیے جاتے۔ سپاہی نکاح نامہ طلب کرتا جو سردار صاحب کے پاس سے نہ نکلتا، نہ ہی ان دونوں کے پاس مشترکہ طور پر اتنی رقم نکلتی کہ دے کر گلوخلاصی کراتے، لہٰذا تھانہ سے گھر میں فون کرتے تب گھر والے علاقے کے ایم پی اے یا کونسلر کے ساتھ آ کر جان چھڑاتے ورنہ دو چار ہزار کا چڑھاوا چڑھا کر گلوخلاصی ہوتی اور آئندہ کے لیے توبہ توبہ کر اٹھتے۔ یہ سب سوچ کر میں نے خود ہی ہنس دیا۔

''کیا بات ہے؟'' مجتبیٰ حسین نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔''

''تو پھر ہنسے کیوں؟''

گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد لوٹے تو سردار صاحب اور ان کی سردارانی ابھی تک موجود تھیں البتہ اندازِ نشست تبدیل ہو چکا تھا۔ اب سردار جی تکیہ بنے تھے اور سردارنی جی استراحت فرما رہی تھیں۔ آگے آئے تو میں نے بطورِ خاص بیلوں میں چھپی بنچ کو دیکھا۔ لڑکے اور لڑکی کو جس حال میں چھوڑ گیا تھا وہ اسی میں مگن تھے۔

میزان

دہلی میں کیونکہ پہلی مرتبہ گیا تھا، اس لیے میں نے شعوری طور پر ہر چیز کو دیکھنے، سمجھنے، پرکھنے اور تولنے کی کوشش کی۔ قیامِ پاکستان تک میں بمبئی، پونا اور انبالہ شہر میں مقیم رہا۔ 1947ء میں ہم انبالہ شہر میں تھے جہاں سے دسمبر 47ء کے وسط میں ہرج مرج کھینچتے لاہور پہنچے تھے۔ لاہور اگرچہ میرا مولد ہے مگر یہاں مہاجر کے طور پر واپسی ہوئی تھی۔ دونوں ممالک کے تقابل کے لیے کسی لمبے چوڑے

فلسفیانہ تصور اور عمرانی نظریئے کی ضرورت نہیں۔ عام زندگی کے رویوں، عمومی چلن، گلیوں اور بازاروں میں رواں خلقت کے طرزِ عمل سے ہی میزان کے دونوں پلڑوں میں سے ایک پلڑا جھک جاتا ہے۔

میں نے لودھی گارڈنز میں جو دیکھا (اور دیکھا جائے تو اسے کوئی خاص ''دیکھنا'' بھی نہیں کہا جا سکتا) یہ بھی تقابلی رویئے ہی کی ذیل میں آتا ہے۔ ہمارے ہاں جو لغو خبر ''سرِعام فحش حرکات'' کی سرخی کے ساتھ اخبارات میں آئے دن چھپتی رہتی ہے وہ ہمارے منافق معاشرہ سے ہی مخصوص ہے کہ فحش حرکت کا معیار پاکستانی پولیس طے کرتی ہے۔

اب پولیس کا ذکر چلا ہے تو دہلی میں لاہور کے مقابلے میں سڑکوں پر بہت کم پولیس دکھائی دی۔ حالانکہ دہلی ہمیشہ ہی سے جلسے جلوسوں، ہنگاموں اور تخریب کاری کا مرکز رہی ہے۔ پارٹیوں وغیرہ کی وجہ سے شاید ہی میں کبھی نصف شب سے پہلے ہوٹل واپس آیا ہوں مگر میں نے لاہور کی مانند سڑکوں پر پولیس کی ناکہ بندی نہ دیکھی۔ نہ کبھی کسی نے روکا حالانکہ خود وہ لوگ بھی ہماری مانند اپنی پولیس کی کرپشن سے نالاں ہیں۔ دراصل طویل آمریت نے پاکستان کو پولیس سٹیٹ میں تبدیل کر دیا ہے تو فرق کھلے اور بند معاشرہ سے پیدا ہوتا ہے۔ ویسے تو لندن اور نیویارک کے باسی بھی اپنی پولیس سے کوئی ایسا خاص پیار نہیں کرتے۔

میں نے مُلّائیت کے حوالے سے وہاں کے مسلمانوں کو ٹٹولا تو وہ ہم سے بھی زیادہ نالاں نکلے۔ بالخصوص کانگریس نواز مُلّاؤں اور بالعموم بنیاد پرستوں سے! بھارتی مُلّا کی تلخ مزاجی کا اندازہ لگانا دشوار نہیں جسے وہاں صحیح معنوں میں اسلام خطرہ میں نظر آتا ہے۔

رسالے کے ایک مدیر نے کہا ''میں مسلمانوں کے محلے میں نہیں رہ سکتا۔ ہندوؤں کے محلے میں رہتا ہوں۔'' میں نے وجہ پوچھی تو وہی نکلی جس کے باعث ہم سے بھی بہت سے اپنے مکانات تبدیل کرنا چاہتے ہیں مگر اس لیے نہیں کر پاتے کہ ہر محلے ہی میں ''وہ'' وجہ موجود ہے۔

ایک معروف محقق کہنے لگے ''میں مسلمان دکاندار سے سودا نہیں لیتا۔ محلے سے باہر جا کر ہندو دکاندار سے چیزیں خرید لاتا ہوں۔''

''مگر کیوں؟''

''سالے بدمزاج اور بدتمیز ہیں۔''

''مگر پھر بھی......''

''بات کرو تو کھانے کو دوڑتے ہیں۔ میں زیادہ قیمت دے سکتا ہوں لیکن ان کے ساتھ بک بک نہیں کر سکتا۔''

اس کا مجھے بھی کسی حد تک تجربہ ہوا۔ جب شمع افروز زیدی کے ساتھ شاپنگ کے لیے گیا تو ان کے لحاظ والی تمام دکانیں ہندوؤں یا سکھوں کی نکلیں۔

اسی شاپنگ کے دوران یہ اندازہ بھی ہوا کہ دہلی کے بازاروں میں ہم پاکستانیوں کو دبئی والا بلکہ بے حد دبئی والا سمجھا جاتا ہے۔ ایک دکان پر حسبِ معمول شمع نہایت سلیقے سے بھاؤ تاؤ میں مصروف تھی کہ میں نے لقمہ دیا ''ہاں! ہاں! کچھ کم کریں، میں پاکستان سے آیا ہوں اور دہلی والوں کا مہمان ہوں۔ مہمان سے اچھا سلوک کریں۔''

شمع نے کہنی مار کر مجھے خاموش کرا دیا اور دکان سے باہر نکل کر مجھے بتایا کہ ''اگر انہیں یہ پتہ چل جائے کہ گاہک پاکستانی ہے تو یہ بھاؤ بڑھا دیتے ہیں۔''

''وہ کیوں؟''

''ان کا خیال ہے کہ آپ لوگ بہت دولت مند ہوتے ہیں۔ اس لیے قیمت بڑھا دیتے ہیں اور پھر کم بھی نہیں کرتے۔'' یہ سن کر میرا سینہ فخر سے پھول گیا، چلو کسی معاملے میں تو بھارت نواسی ہم سے مرعوب نکلے، اگرچہ اس کے بعد میں نے عمومی خاموشی اختیار کر لی مگر پھر بھی خود بوید کی مانند پاکستانی ہونے کا بھید کھل ہی جاتا۔

میری بیٹیوں نے کولہاپوری چپل کی فرمائش کی تھی، وہ لینے کو جوتوں کی دکان میں داخل ہوئے تو دکاندار اپنی جوتیاں بھول کر میرے شوز کی طرف متوجہ ہو گیا اور بڑے اشتیاق سے پوچھا:

''آپ لاہور سے آئے ہوں گے؟''

''آپ نے کیسے اندازہ لگایا؟''

''یہ شوز اِدھر کے نہیں ہو سکتے۔''

واضح رہے کہ جوتے بازی میرے ''اشواق'' میں شامل نہیں ہے اور میرے شوز بس عام سے ہی تھے مگر وہ انہیں دیکھ کر قاسم کی مانند خوش ہو رہا تھا۔ چنانچہ مارے اشتیاق کے ایک جوتا اتروا کر کسی فنکار کی مانند اسے جانچتے ہوئے پوچھا:

''کہاں سے لیا تھا؟''

میں نے مال کی ایک مشہور دکان کا پتہ بتایا۔

خوش ہو کر بولا ''یقیناً ایسا جوتا ویسی ہی دکان سے مل سکتا تھا۔'' پھر قیمت پوچھی اور سن کر بولا ''بہت مناسب ہے۔''

میں نے کہا ''سودا پٹالو، کتنے میں لو گے؟''

میرے جواب میں اس کی ہنسی لیکن کوئی خواہاں نہیں واں جنس گراں کا جیسی تھی، البتہ اس کا بڑا خوشگوار اثر یہ ہوا کہ اس نے بہت مناسب دام پر کولہاپوری چپلیاں فروخت کیں۔ شمع اس سودے سے بہت مسرور دکھائی دے رہی تھیں۔ شمع پی ایچ ڈی ہیں ''بیسویں صدی'' نکالتی ہیں۔ ادبی تقاریب میں بعض اوقات سٹیج سیکرٹری بھی ہوتی ہیں لیکن عورت آخر عورت ہوتی ہے۔ دام کم کراتے وقت دیکھو تو قطعاً لیڈی ڈاکٹر ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ پاکستان آتی رہتی ہیں اور لاہور کے ادبی حلقوں میں جانی پہچانی جاتی ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ دہلی کی مانند لاہور سے بھی اچھی اور سستی شاپنگ کر کے لے جاتی ہوں گی۔ انہوں نے مجھے اتنی اچھی شاپنگ کرائی کہ گھر میں میری مقبولیت کا گراف خاصا اونچا ہو گیا۔ ایک اور موقع پر بھی پاکستانی ہونے کا بھید کھل گیا، میری بیوی نے سوا دو گز عرض والی کشمیری شال لانے کو کہا تھا چونکہ بھارتی کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ کہتے ہیں، اس لیے دکانیں کشمیری شالوں سے بھری ہوئی تھیں مگر سوا دو گز عرض والی شالیں نہ مل رہی تھیں۔ ایک دکاندار بولا ''صاحب! ادھر چھوٹے ارج کی سال چلتا ہے۔ ہاں لاہور سے جو لوگ آتے ہیں، وہ سوا دو گز ارج کی سال مانگتے ہیں۔''

میں شمع کی نصیحت فراموش کرتے ہوئے خوشی سے بولا ''میں لاہور ہی سے آیا ہوں۔''

''جبھی تو میں بولوں ہوں!''

اَن جل

کپڑوں اور جوتوں کی مانند کھانا پینا بھی میرے مسائل میں شامل نہیں ہے۔ میری بیوی، میرے کپڑے اور جوتے خرید کر لاتی ہے، جو لا دیتی ہے پہن لیتا ہوں۔ کھانے سے جو تھوڑی بہت رغبت تھی وہ پہلے ہائی بلڈ پریشر اور پھر یورک ایسڈ کی وجہ سے بالکل ہی ختم ہو گئی۔ لاہور میں تو بعض اوقات سارا سارا دن بغیر کھائے گزار دیا کرتا ہوں مگر دہلی میں دن میں دو تین کھانے اور چائے بھگتانی ہوتی تھی۔ میں تیز مصالحوں اور گوشت سے خوفزدہ تھا مگر وہاں کے کھانوں نے گمشدہ ذائقوں کی بازیافت کا کام کیا۔

ایک بات میں نے بطور خاص نوٹ کی کہ سیمینار میں مقالات اور بحث کے دوران تو سامعین کم ہوتے لیکن کھانے پر سامعین کی تعداد میں اچانک اضافہ ہو جاتا یوں کہ سبھی لمبے لمبے ہاتھ مار کر حقِ نقد ادا کرتے نظر آتے اور وہ بھی اس اسلوب سے:

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

یہ تجربہ کار سامعین تھے اور اس رمز سے آگاہ کہ خشک تنقیدی مقالات کے مقابلہ میں دہلی کا قورمہ، حیدر آبادی بریانی اور لال روٹی کا معیار کہیں زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ آخر انہی کھانوں سے وہ جسمانی قوت پیدا اور ذہن کی نشوونما ہو گی جس کی مدد سے اعلیٰ تنقیدی ذوق جلا پاتا ہے جیسا کہ عرض کیا ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے میں نمک، گرم مصالحوں، تیز مرچوں اور اچار چٹنی الغرض تمام خوش ذائقوں سے پرہیز کرتا ہوں لیکن دہلی کے چٹ پٹے کھانوں نے میرا پرہیز مکمل طور پر ختم کروا دیا۔ کمال ہے کہ سب کچھ ہضم بھی ہوتا رہا۔ غالباً لاہور کے مقابلے میں دہلی کا پانی زیادہ ہاضم ہو گا ورنہ زبیر رضوی صاحب نے میرا جو کھانا کیا تھا، اس میں ان کی بیگم صاحبہ نے جو خاص ڈشیں بنائی تھیں اور جن پر سب مہمان ٹوٹ پڑے تھے، میں صرف دہلی میں ہی ہضم کر سکتا تھا۔

میری ایک خراب عادت ہے کہ میں سردی میں بھی فریج کا ٹھنڈا پانی پیتا ہوں۔ اس دسمبر میں مجھے فریج کا پانی کہاں سے ملتا (البتہ فریج کی بیئر کی کمی نہ تھی) جب تیز مصالحوں سے زبان جل رہی ہو، معدہ میں غذا لے جانے والی نالی تپ رہی ہو تو ایسے میں یخ پانی کا مزا کچھ اور ہوتا ہے۔ ٹھنڈے پانی سے جسم میں خنکی کا احساس جس طرح سے بتدریج پھیلتا اور اس سے اعصاب جس طرح جھوم اٹھتے ہیں اسے الفاظ میں بیان کرنا آسان نہیں۔ بس آپ ٹھنڈے پانی کا گلاس پی کر خنکی کا آنند حاصل کر سکتے ہیں اور میں اسی آنند سے محروم تھا۔

ایم قمر الدین مجھے دوپہر کا کھانا کھلانے دہلی کے معروف اسلامی ہوٹل میں لے گئے جس کے کھانے کی بہت شہرت ہے اور واقعی وہ اس شہرت کا مستحق تھا۔ جب بیرا پانی کا جگ اور گلاس لے کر ہماری میز کی طرف آیا اور روایتی انداز میں میز صاف کرنے لگا تو میں نے پانی کے جگ کو دیکھ کر پوچھا ''فریج کا پانی ہے؟''

''جی نہیں۔''

اس پر میں نے کہا ''دہلی میں آئے آٹھ دس دن گزر گئے مگر ٹھنڈے پانی کو ترس گیا ہوں۔''

بولا ''صاحب جاڑوں میں ٹھنڈا پانی کہاں؟''

''تو پھر لاؤ کہیں سے۔''

''جی کوشش کرتا ہوں۔''

''ہاں کرو، میں تو سخت پیاسا ہوں۔''

''برف والا چلے گا؟''

''ہاں، برف والا چلے گا۔''

چنانچہ تھوڑی دیر بعد وہ ایک خوبصورت طشتری میں (جو مجھے تو چاندی کی لگی) آئس کیوبز لے آیا۔ ابھی اس نے طشتری میز پر رکھی ہی تھی کہ پڑوس کی میز سے ایک صاحب نے نعرۂ مستانہ لگایا

"برف۔"

پیشتر اس کے کہ ہمیں احساس ہوتا وہ اٹھے اور طشتری اُچک کر اپنی میز پر براجمان ہو گئے۔

"ارے! میری برف۔"

وہ بات کاٹ کر بولے "بہت برف ہے۔ آپ کا کام بھی چل جائے گا اور میرا بھی۔" گویا یہ بھی اپنے جیسے دل جلے نکلے۔

بلڈ پریشر کی وجہ سے اب مجھے نمکین کے مقابلے میں میٹھے سے زیادہ رغبت ہے چنانچہ دعوتوں میں اگر حالات سازگار رہوں، میں پلیٹ میں چاولوں اور بوٹیوں کی شملہ پہاڑی بنانے کی بجائے صرف میٹھے سے کام چلا لیتا ہوں۔ اگرچہ ہماری مٹھائیاں بھی بری نہیں مگر دہلی میں مٹھائیوں کا تنوع قابل ذکر بھی ہے اور لذیذ بھی، اس کی بنیادی وجہ تو خود ہندوستان کی وسعت اور کلچرل ورائٹی میں تلاش کی جا سکتی ہے۔ اسے یوں سمجھیے کہ جس طرح پنجاب، تامل ناڈو اور بنگال زبان اور ثقافت میں منفرد ہیں اسی طرح خورد و نوش میں بھی رنگا رنگی ملتی ہے۔ شاید ہم بنگالیوں کی مانند مٹھی میں بھر کر چاول اور کانٹے چنے بغیر مچھلی تو نہ کھا سکیں مگر مدراسیوں کی مرغوب ڈش "ڈوسا" سے یقیناً لطف اندوز ہو سکتے ہیں، جو جنوب کی مانند شمالی ہند کے ہوٹلوں میں بھی اب تیار کی جاتی ہے، تاہم کھانے کے مقابلے میں مٹھائیوں میں اس تنوع کا اور بھی زیادہ احساس ہوتا ہے۔ اگرچہ بنگال اور مدراس کی مٹھائیاں زیادہ پرلطف اور ذائقے دار ثابت ہوتی ہیں لیکن دوسرے علاقوں کی مٹھائیاں بھی کم نہیں اور میں نے یہ کوشش بھی کی کہ ہر علاقے کی سوغات کم از کم چکھ تو لوں۔ کسی زمانے میں متھرا کے پیڑے مشہور تھے مگر اب بھی کھوئے کی مٹھائیوں کا نفیس ذائقہ لاجواب ہے۔ بعض مٹھائیاں تو لکھنؤ کے روایتی رکابداروں کی یاد دلاتی ہیں۔

"یہ پستہ کی برفی کس طرح ہے؟"

"پانچ سو روپے!"

"من!"

وہ ہنسا "بھائی جان ایک کلو کے پانچ سو روپے ہیں۔"

اور یوں بھائی جان پستہ کی برفی چکھے بغیر واپس آ گئے۔ البتہ میں وہاں پونا کی اس مٹھائی کو تلاش کرتا رہا جو مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ جس کی شکل سموسے جیسی تکونی تھی، باہر سے باقر خانی کی طرح خشک مگر اندر کھویا بھرا ہوا ہوتا تھا۔ مجھے نام یاد نہیں رہا مگر بہت مزیدار، دہلی میں کئی اصحاب سے اس کے

بارے میں استفسار بھی کیا مگر کسی کو علم نہ تھا۔

پاکستان کیوں بنایا تھا؟

کھانے پینے کا ذکر چلا ہے تو یہ بھی سن لیجیے کہ عام خیال کے برعکس اب بیشتر ہندو بالخصوص نئی نسل کے تعلیم یافتہ محض سبزی خور نہیں رہے بلکہ سب کچھ کھا لیتے ہیں۔ چکن تو خیر سامنے کی چیز ہے، بکرے کے گوشت اور بعض حضرات تو گاؤ ماتا کے گوشت سے بھی پرہیز نہیں کرتے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا جن دنوں راجیو گاندھی پائلٹ تھا، جب وہ کلکتے کی فلائٹ پر جاتا تو وہاں کسی مخصوص دکان سے اپنی پسند کا گوشت لے کر آتا اور پھر دہلی واپسی کے بعد مخصوص اور بے تکلف احباب کی دعوت کی جاتی تھی۔ الغرض پرانے پنڈتوں، انتہا پسند عورتوں اور بنیاد پرستوں سے قطع نظر اب عام ہندو کے لیے سب کچھ جائز ہے، تاہم ہندو کے لیے گوشت کھانا نفسیاتی اہمیت کا کیا تجربہ بن سکتا ہے اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب مہاتما گاندھی کی خودنوشت سوانح عمری کے اس حصے کا مطالعہ کرتے ہیں جب اس نے ایک گوشت خور دوست کی ترغیب اور خود کو باغی ثابت کرنے کے لیے گوشت تو کھا لیا مگر اس کے لیے تجربہ اتنا ہی Traumatic ثابت ہوا جتنا کسی پاکستانی کے لیے شعوری طور پر سؤر کا گوشت کھا لینا، تاہم دل والوں کی بھی کمی نہیں، اس ضمن میں فراق گورکھپوری کا واقعہ دلچسپی سے خالی نہیں، دوستوں کی محفل میں کھانے پینے کا ذکر کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں طرح طرح کی ڈشوں اور گوشت خوری کا بھی ذکر چلا تو کسی نے شرارتاً پوچھا "اور گائے کا گوشت بھی کھایا؟"

فراق نے برجستہ جواب دیا "ارے بھائی! اتنا بڑا جانور کیسے نظر انداز ہو سکتا تھا؟"

اب یہ ذکر چلا تو بہت سے معروف ادیبوں کے واقعات یاد آ رہے ہیں۔ جگن ناتھ آزاد وقتاً فوقتاً پاکستان تشریف لاتے رہتے ہیں، یہاں ان کے مداحوں کا وسیع حلقہ بھی ہے۔ ایک مرتبہ لاہور آئے تو میں نے انہیں اور چند احباب کو کھانے پر مدعو کیا۔ میری بیوی شامی کباب اتنے اچھے بناتی ہے کہ خود شامی بھی نہیں بناتے ہوں گے اور کالم کی صورت میں انتظار حسین سے سند حاصل کر چکی ہے۔ اب یہ کیسے ممکن تھا کہ دعوت ہو اور شامی کبابوں کے بغیر، اچھے اور خستہ شامی کباب بڑے گوشت ہی کے بنتے ہیں، چنانچہ پریشان ہو کر پوچھنے لگی "آزاد صاحب برا تو نہ منائیں گے؟"

"کیوں؟"

"شامی کباب بڑے گوشت کے بنتے ہیں ناں۔"

"تو کیا، آزاد صاحب آزاد انسان ہیں۔"

''دیکھ لیں، ناراض نہ ہو جائیں۔''

''مجھے معلوم ہے وہ ناراض نہ ہوں گے۔''

ناراض تو کجا آزاد صاحب کباب دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ سب سے پہلے ان ہی کو شرفِ قبولیت بخشا اور کھانے کے بعد میری بیوی سے ان کی تعریف کی۔ اس دعوت میں انہوں نے بڑی دلچسپ بات سنائی۔ محمد طفیل مرحوم نے جب پہلی مرتبہ ان کا کھانا کیا تو ہندو سمجھ کر میز سبزیوں اور دالوں سے بھر دی، آزاد صاحب نے نگاہِ تاسف سے یہ اشتہار با منظر دیکھا اور طفیل صاحب سے کہا:

''بھائی اگر یہی کچھ کھانا تھا تو پاکستان کیوں بنایا تھا؟''

محبت کا مارا

صوبۂ بہار کے ایک پرفضا مقام ہزاری باغ میں جلیل اشرف صاحب مقامی کالج میں اردو کے لیکچرار ہیں جبکہ ان کی بیگم ڈاکٹر خورشید جہاں اسی شہر کے وومن کالج میں صدر شعبۂ اردو ہیں۔ ان دنوں جلیل اشرف، رانچی یونیورسٹی کے پروفیسر اور معروف نقاد ڈاکٹر وہاب اشرفی کی زیرِ نگرانی مجھ ناہنجار کی تنقید پر پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی مقالہ قلم بند کر رہے ہیں۔ مقالے کا عنوان ہے ''اردو تنقید کے فروغ میں ڈاکٹر سلیم اختر کا حصہ'' (جلیل اشرف صاحب مقالہ مکمل کر کے جنوری 1992ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں) مقالہ کی تیاری کے سلسلہ میں گزشتہ دو تین برس سے ہم میں خط و کتابت ہو رہی تھی۔ اب جو دہلی جانے کا سبب بنا تو سوچا چلو لگے ہاتھ ہزاری باغ کی سیر بھی کر لیں چنانچہ ہزاری باغ کے لیے بھی ویزا حاصل کر لیا مگر دہلی جا کر معلوم ہوا کہ ہزاری باغ تو صحیح معنوں میں ''ہزاری'' ہے یعنی ہزار بارہ سو کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ ادھر دہلی نے یوں قدم پکڑے کہ میں لکھنؤ اور آگرہ تک نہ جا سکا، ہزاری باغ کا طویل سفر تو قطعاً ممکن نہ تھا چنانچہ میں نے جلیل اشرف صاحب کو اپنی آمد کی اطلاع دے دی۔ جس طرح میرے لیے جانا آسان نہ تھا، اسی طرح ان کے لیے بھی آنا آسان نہ ہوگا لیکن کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شام چلے آ رہے ہیں محبت کے مارے۔ ان کی اس محبت نے بہت متاثر کیا۔ جس شام وہ پہنچے اسی شام مندوبین کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا لیکن مجھے یہ اچھا نہ لگا کہ صرف مجھ سے ملنے کے لیے ہرج مرج کھینچتا ہوا جو شخص دہلی پہنچا ہو اسے چھوڑ کر واہ واہ سننے کی تقریب میں چلا جاؤں، چنانچہ وہ شام ہم دونوں نے گفتگو میں گزاری اور اگلے تین چار دن ہم نے اکٹھے بسر کیے۔

جلیل اشرف صاحب کو میں نے مرقعِ خلوص پایا۔ اس طرح ان کی بیگم (جو اب میری نادیدہ

بہن ہیں) کے خطوط سے بھی اس اپنائیت کا احساس ہوتا رہا ہے جو ایک چھوٹی بہن بڑے بھائی کو دے سکتی ہے۔ ڈاکٹر خورشید جہاں کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ''اردو تنقید پر انگریزی تنقید کے اثرات'' طبع ہو کر اس مشکل موضوع پر اہم معلومات فراہم کرتا ہے۔ بھارت کے ادبی حلقوں میں اسے خصوصی پذیرائی حاصل ہونے کی اطلاعات بھی ملی ہیں۔

فنونِ لطیفہ

بعض اوقات کوئی چھوٹی سی بات بڑے تعلقات کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ ہوا یہ کہ تین چار برس قبل بھارت کے ایک رسالے میں ادب کے کسی انتخاب پر تبصرہ پڑھتے ہوئے اپنے ایک افسانے کے بارے میں بھی تعریفی سطریں پڑھیں تو کتاب کے ناشر کی معرفت مرتب صاحب کو ایک خط لکھ کر کتاب کی خواہش کی۔ مرتب تھے نند کشور وکرم اور کتاب تھی ''عالمی اردو ادب'' (وہ ہر برس یہ انتخاب مرتب اور شائع کرتے ہیں) نند صاحب کا خط آیا اور کتاب بھی اور یوں قلمی دوستی کا آغاز ہو گیا۔ انہیں جب اخبارات کے ذریعے سے میری آمد کی اطلاع ملی تو ایک دن دیوندر اسّر کے ساتھ ملاقات کو ہوٹل تشریف لائے۔ دیوندر اسّر کی نفسیاتی تنقید کا میں پرانا قاری اور مداح ہوں بلکہ اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ ''نفسیاتی تنقید'' میں، میں نے ان کی نفسیاتی تنقید کا خصوصی مطالعہ کیا تھا۔ دیوندر اسّر نازک اندام ہیں جبکہ نند کشور گول مٹول ہیں اور شاید اسی لیے دونوں کی گاڑھی چھنتی ہے۔ جلیل اشرف بھی ان دنوں دہلی میں تھے، سو ہم چاروں نے خوب سیر کی۔

میری خواہش پر ایک روز یہ مجھے مصوری اور ناٹک کے تربیتی اداروں میں لے گئے جو دہلی میں بکثرت ہیں۔ مصوری کا یہ عالم ہے کہ بیک وقت دن میں دو تین شو ہو رہے ہوتے ہیں اور قدیم دھارمک سے لے کر جدید ترین تجریدی تجربات تک مصورانہ اسلوب میں خاصا تنوع نظر آتا ہے۔ اسی طرح مجسمہ سازی میں بھی اگر ایک طرف روایتی مذہبی شخصیات کے مجسمے فروخت ہوتے ہیں تو دوسری طرف علامتی اور تجریدی فگر بھی نظر آئے لیکن مجھے سب سے زیادہ تانبہ اور پیتل کے وہ مجسمے بھائے جو غالباً جنوب کے مندروں کی مورتیوں کی شبیہہ تھے۔ بھاری چھاتیوں، سڈول کولھوں اور پتلی کمر میں گہری ناف والے یہ مجسمے عورت کو اس کے الوہی کے برعکس ارضی روپ میں پیش کرتے ہیں۔ بیشتر نرت کے انداز میں کمر کو ذرا سا خم دیئے آنکھوں میں پتلیوں کو ذرا سا ٹیڑھا کیے اور انگلی اٹھائے یوں پرکشش نظر آئیں کہ پیگمولین کی مانند ان کے زندہ ہو جانے کی دعا مانگنے کی جی چاہا۔ لکشمی اور نٹ راج کے مجسمے مجھے بہت بھائے مگر اس لیے نہ خریدے:

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے

ایک نوجوان مجسمہ ساز سے اس کے ون مین شو میں ملاقات ہوئی تو میں نے اس سے مجسمہ سازی کے کمرشل پہلو پر گافی گفتگو کی اور سب کو پُر امید پایا۔ تصاویر کی فروخت سے اگرچہ رئیس تو نہیں بن جاتے لیکن فاقے بھی نہیں ہوتے۔ یہ سب تو نوجوان اور نو آموز تھے لیکن وہ مصور یا مجسمہ ساز جو مشہور ہو چکے ہیں ان کے تو وارے نیارے ہیں اور بقول دیوندر اسّر اگر کوئی شخص ایف ایم حسین کی تصویر خرید لے تو انکم ٹیکس والے یہ تفتیش کرنے آ جاتے ہیں کہ تمہارے پاس اتنی بڑی رقم کہاں سے آ گئی؟

دہلی میں متعدد ناٹک گھر ہیں۔ وہ بھی جو کمرشل ہیں اور وہ بھی جو آرٹ پلے سٹیج کرتے ہیں۔ دونوں کی خاطر خواہ سرپرستی کی جاتی ہے۔ بھارت میں سٹیج کی اس لیے بھی بہت زیادہ اہمیت ہے کہ بعض اوقات یہیں سے فلم اور ٹیلی ویژن کے لیے ٹیلنٹ دستیاب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ متعدد ایسے اداکار اور فلمی ستارے ملتے ہیں جنہوں نے سٹیج سے ابتدائی تربیت حاصل کی تھی۔ البتہ اس کا افسوس رہے گا کہ میں کوئی ڈراما نہ دیکھ سکا۔ میں نے نکڑ ناٹک کا بھی بہت ذکر سن رکھا تھا مگر وہ بھی نہ دیکھ پایا۔ دراصل یہ سب کام فرصت کے ہیں اور وہی عنقا تھی کہ صبح کا ناشتہ کر کے ہوٹل سے نکلتا تو نصف شب سے پہلے واپسی ممکن نہ ہوتی۔

ہندو پانی / مسلم پانی

ہم چاروں صبح سے گھوم رہے تھے لہٰذا دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے ایک ریستوران میں رک گئے جہاں بہت رش تھا۔ میں کچھ دیر تک اِدھر اُدھر دیکھتا رہا اور تب مجھے اپنا بچپن یاد آ گیا جب ریلوے سٹیشن پر ہندو اور مسلمان کا پانی الگ الگ ہوتا تھا اور پانی پلانے والا ہندو پانی اور مسلمان پانی کی صدا لگاتا تھا۔ اب میں اس کے برعکس دیکھ رہا تھا۔ اپنی میز پر ہی ہم دو مسلمان اور دو ہندو تھے۔ سامنے ایک سردار جی اپنے کنبے کے ساتھ براجمان تھے۔ ریستوران کا مالک مجھے مدراسی لگا، اردگرد میزوں پر مسلمان اور عیسائی وغیرہ کھانا کھاتے نظر آئے۔ ملازم لڑکوں میں سے بیشتر ہندو لگے۔

میں نے کہا ”یہ سب بڑا عجیب سا لگ رہا ہے۔ مجھے اپنے بچپن کا ہندو پانی اور مسلم پانی اب تک یاد ہے مگر اب میں بدلا ہوا ماحول دیکھ رہا ہوں اور سب اکٹھے بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں۔“

دیوندر اسّر کہنے لگے ”فضا کافی تبدیل ہو چکی ہے اور ویسے ہی چھوت چھات کے جرم کی سزا چھ ماہ ہے۔“

یہ تو ہوئی آئیڈیل صورت عملاً یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات اونچی ذات کے ہندو کسی عمارت کی تعمیر کے وقت کسی اچھوت کی کھوپڑی کا بلیدان دے رہے ہیں۔ بعض اوقات انہیں ان کی اوقات یاد دلانے کی خاطر انہیں یا ان کی بستیوں کو آگ لگا دی جاتی ہے۔ بعض اوقات ردِعمل میں اچھوت بھی چڑھ دوڑتے ہیں۔ ابھی گزشتہ دنوں یہ خبر چھپی تھی کہ بہار کے ایک گاؤں کو اچھوتوں نے پھونک کر اونچی ذات کے ساٹھ ہندوؤں کو خاکستر کر دیا تھا۔ اوہ معاف کیجیے! میں اچھوت لکھ رہا ہوں، حالانکہ ان کے لیے سرکاری طور پر ”ہریجن“ کا لفظ مستعمل ہے۔

اخبارات اور لیڈروں کے بیانات کی بنا پر ہمارے ذہن میں بھارت کا کچھ ایسا نقشہ کھنچ چکا ہے گویا ہندو اور مسلمان فوجوں کی طرح آمنے سامنے ہتھیار لیے صف آرا رہتے ہوں اور ہر وقت یدھ پڑتا رہتا ہو۔ فسادات سے قطع نظر عام حالات میں ہندو مسلمان، سکھ سب ایک دوسرے سے ملتے جلتے اور سماجی روابط استوار رکھتے ہیں۔ میرا کیونکہ اہلِ قلم سے رابطہ تھا اور یہ لوگ بالعموم تعصّبات سے آزاد ہوتے ہیں اس لیے مجھے کسی بھی موقع پر ہندو پانی اور مسلم پانی کا احساس نہ ہوا۔ صرف میرا نام سن کر یا اخبارات میں میرے بارے میں پڑھ کر مجھ سے ہوٹل میں ملنے کے لیے آنے والوں میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ اسی طرح اردو کے مقابلے میں ہندی پریس نے میرے بارے میں زیادہ خبریں دیں اور میرے انٹرویوز لیے۔ ہندو کے گھر مسلمان دعوت کھا رہے ہیں اور مسلمان کے گھر ہندو پی رہے ہیں۔ میں نے چھوٹے بچوں کو فلموں کی مانند بزرگ مسلمانوں اور سکھوں کے چرن بھی چھوتے پایا۔ ڈاکٹر خلیق انجم کی اہلیہ ہندو ہیں اور بقول ان کے ساس بہو میں کبھی جھگڑا نہیں ہوا۔ ایم قمرالدین کا ڈرائیور ہندو تھا جس سے ان کا بیٹوں جیسا مشفقانہ سلوک تھا۔ اس سے پہلے میں ان دو مسلمان دانشوروں کا ذکر کر آیا ہوں جو مسلمان کے برعکس ہندو دکاندار سے سودا خریدنا پسند کرتے ہیں اور عصمت چغتائی تو سب کو پیچھے چھوڑ گئیں کہ دفن ہونے کی بجائے چِتا میں جلنے کی وصیت کر گئیں (پاکستانی ہوتے ہوئے ن۔م۔ راشد نے بھی لندن میں نعش سوزی (Cremation) کی وصیت کی تھی) یہ سب تو ہے لیکن اس کے باوجود جب ہندو پر مذہبی جنون چڑھتا ہے تو اس کا مظاہرہ کتنا خوفناک ہوتا ہے اس کے شاہد فسادات ہیں۔ اُدھر بابری مسجد کی جگہ پر رام جنم بھومی کی تعمیر نہ جانے اور کتنی جانوں کی بھینٹ لے گی۔

تاہم پانچ ہزار برس کی روایات اتنی آسانی سے ختم بھی تو نہیں ہو سکتیں کیونکہ برہمن اور کٹر قسم کے ہندو اب بھی چھوت اور اچھوت کے تصور پر عمل کرتے ہیں، شاید شمالی ہند میں مسلم حکومتوں کے زیرِ اثر حالات قدرے بہتر ہوں گے لیکن جنوبی ہند میں تو اب تک اچھوتوں کی قربانیاں دینے کی خبریں مل جاتی ہیں۔ ہاں اچھوت کنیا کی اور بات ہے!

گریڈوں کے اچھوت

پھر میں سوچتا ہوں کہ ہم پاکستانیوں کو بھارت میں چھوت چھات اور ذات پات پر اعتراض کا کیا حق پہنچتا ہے کہ اسلامی مساوات، مسلم اخوت اور نظام مصطفیٰ کے دعوؤں کے باوجود عملاً پاکستانی معاشرہ چار ذاتوں کی بجائے، گریڈوں سے جنم لینے والے ذات پات کے کٹر نظام میں منقسم ہے۔ ہر گریڈ سے منسلک فرد کو ایک غیر مرئی دیوار بہتر گریڈ کے حامل افراد سے جدا رکھتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہم فانی عوام سے PCS والے نفرت کرتے ہیں تو ان کو CSP حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس ضمن میں اگر میں وڈیرے اور غریب کسان کی بات چھیڑ بیٹھا تو پھر پنجابی فلم کا ٹریلر شروع ہو جائے گا تو پھر ہمیں بھارت کے برہمنوں اور اچھوتوں کے بارے میں زبان کھولنے کا کیا حق ہے؟ ہاں اتنا فرق ہے کہ پاکستانی اچھوتوں کو چھوا جا سکتا ہے اور بس۔

پاکستانی معاشرے کے تضادات اپنی بدترین (یا بہترین) صورت میں اسلام آباد میں نظر آتے ہیں جواب مسلمانوں، پاکستانیوں یا انسانوں کی بجائے گریڈوں کے شہر میں تبدیل ہو چکا ہے اور پھر اسلام آباد جانے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ زندہ دلوں کے شہر لاہور کے سیکرٹریٹ میں ذرا پیدل چلے جائیے، آپ کو مین گیٹ پر کھڑے محافظ روک لیں گے، ہاں اگر آپ گاڑی پر سوار ہوں تو وہ نہ صرف آپ کے لیے دروازہ کھولے گا بلکہ سلام بھی کرے گا اور اگر کہیں آپ کی گاڑی پر MPA یا MNA کی سبز پلیٹ لگی ہے تو پھر کھل جا سم سم کی مانند یہ پلیٹ تمام بند دروازے کھولتی جائے گی۔ یہ عالم ہے اس عمارت کا جو اسلامی مساوات اور اخوت کی داعی حکومت کی علامت ہے۔

مزید بھارتی

بحیثیت مجموعی پاکستان کے مقابلے میں بھارت میں معیارِ زندگی اتنا بلند نہیں جس کا اندازہ ان کے لباس، جوتوں اور گھروں سے ہو جاتا ہے جبکہ بمبئی اور کلکتہ جیسے بڑے شہروں میں تو بیس تیس لاکھ افراد فٹ پاتھ پر زندگی بسر کرتے ہیں، وہیں پیدا ہوتے ہیں، پلتے بڑھتے ہیں، روزگار کرتے ہیں، شادی بیاہ کر کے بچے پیدا کرتے ہیں (کیسے؟) اور مر جاتے ہیں جبکہ پاکستان میں کراچی اور لاہور کے بعد کوئی ایسا شہر ہی نہیں جس کی آبادی بیس تیس لاکھ ہو۔ گویا گوجرانوالہ، وزیر آباد، گجرات، فیصل آباد، ساہیوال اور ملتان جیسے شہر صرف بمبئی اور کلکتہ کی فٹ پاتھوں پر آباد ہیں۔ اس کا بنیادی سبب شرح پیدائش کی راکٹ رفتار ہے۔ حکومت خواہ کچھ ہی کیوں نہ کرے وہ ملکی وسائل اور بڑھتی آبادی میں

توازن پیدا نہیں کر سکتی۔ اسے اس مثال سے سمجھئے کہ بھارت میں ایک منٹ میں تین بچے پیدا ہوتے ہیں بالفاظ دیگر جتنی دیر میں آپ نے اس حصے کا مطالعہ کیا اتنی دیر میں وہاں متعدد رام اور لکشمن اور سیتا اور لکشمی جنم لے چکی ہوں گی (بے فکر رہیے اس میں آپ کا کوئی دوش نہیں) اسی لیے آبادی کو قابو میں رکھنے کے لیے وہاں فیملی پلاننگ سے لے کر فسادات تک ہر طریقہ آزمایا جاتا ہے مگر یوں محسوس ہوتا ہے گویا تمام بھارتیوں کو مزید بھارتی پیدا کرنے کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہ ہو۔

وجۂ نزاع

مجتبیٰ حسین ملے، کہنے لگے ''ہم طنز و مزاح کانفرنس منعقد کر رہے ہیں۔ اس میں ایک مضمون پڑھ ڈالو۔'' میں نے کہا ''میں تو صرف غالب سیمینار کے نقطۂ نظر سے غالب پر ہی مقالہ لایا ہوں۔ طنز و مزاح پر تو میرے پاس کچھ نہیں۔''

حکم دیا ''پاکستان میں طنز و مزاح کے موضوع پر تقریر کر دو۔''

میں گفتار کا غازی نہیں، تاہم اگر جان پر بن جائے تو تقریر بھی کر لیتا ہوں لیکن یہ میرے مزاج کی چیز نہیں۔ بہرحال میں نے مضمون لکھنے کی حامی بھر لی۔ مجتبیٰ حسین بڑے فعال انسان ہیں اور ادیبوں کے ساتھ ساتھ سرکار، دربار اور میڈیا سے بھی خوشگوار تعلقات رکھتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ طنز و مزاح کانفرنس کے باقاعدہ اعلان کے لیے ایک پریس کانفرنس کر رہے ہیں۔ منیر احمد شیخ اور مجھے بھی اس پریس کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی کہ اسی بہانے ہماری بھی رونمائی ہو جائے گی۔ پریس کانفرنس میں متعدد صحافیوں سے ملاقات ہوئی۔ جب مجتبیٰ حسین طنز و مزاح کانفرنس کے بارے میں بریفنگ ختم کر چکے تو صحافیوں نے ہم دونوں کو گھیر لیا۔

منیر احمد شیخ نے میرے کان میں کہا ''یار! میری بڑی سینسٹیو پوسٹ ہے، کہیں یہ نہ ہو کہ منہ سے الٹی سیدھی بات نکل جائے اور مصیبت گلے پڑ جائے۔''

میں نے کہا ''آپ خاموش رہیے، میں سنبھال لوں گا۔''

اگرچہ ایک دو صحافیوں کے سوالات نہ تھے بلکہ طعنہ زنی تھی، تاہم میں نے حتی الامکان گفتگو کو سنبھالے رکھا مگر جب مجتبیٰ حسین نے دیکھا کہ اب یہ میرے بس کا بھی روگ نہیں رہا تو انہوں نے کھانے کا اعلان کر دیا۔ یوں سب صحافی تیری سرکار میں پہنچ کر ایک ہو گئے۔ صحافی گوشت کی پلیٹوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ میز پر میرے ساتھ ایک خاصی خوبصورت لڑکی دکھائی دی، سفید پیشانی پر سرخ بندیا، موٹی موٹی آنکھیں (یا شاید مجھے ہی موٹی لگیں) وہ سفید انگلیوں میں چمچہ تھامے بوٹیاں نکال کر

پلیٹ میں ڈال رہی تھیں۔ میں نے پوچھا ''آپ جرنلسٹ ہیں؟''

''جی ہاں۔'' اور اس نے اپنے اخبار کا نام بتایا، کہنے لگیں ''آیئے کچھ باتیں کرتے ہیں۔''

ہم دونوں اپنی پلیٹیں لے کر الگ صوفے پر بیٹھ گئے۔

چھوٹتے ہی کہنے لگی ''ہم دونوں ملک صلح سے کیوں نہیں رہ سکتے؟''

میں نے کہا ''مسائل ہی ایسے ہیں کہ لاکھ کوشش کرو، شک وشبہ کی فضا ختم نہیں ہو سکتی۔''

''وہ کیسے؟''

میں نے کہا ''میرا اور آپ کا کوئی جھگڑا ہے؟''

بولی ''نہیں۔''

''آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہے؟''

''نہیں۔''

''لیکن اس کے باوجود ہم پاکستانی اور ہندوستانی ہونے کی وجہ سے ہی Hostile ہیں۔''

''مگر کیوں؟ آخر وجہ کیا ہے؟''

''اس کی وجہ کشمیر ہے۔''

اس نے سوالیہ انداز میں بڑی بڑی آنکھیں میری طرف اٹھا دیں۔ میں اب پاکستانی تھا اور اس نقطۂ نظر سے خاصی گرم گفتگو کی مگر وہ بھارتی تھی، قائل نہ ہوئی۔

''آخر اس تمام سچویشن کا کوئی حل بھی تو ہوگا۔''

''ہے!''

''کیا؟''

''میرے ساتھ بھاگ چلو!''

"What?"

اس کا سفید چہرہ سرخ ہو رہا تھا، وہ سخت کنفیوژ ہو رہی تھی اور بڑی بڑی آنکھیں جھپکا کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔

طنز ومزاح کانفرنس

طنز ومزاح کانفرنس جو محض ''کل ہند'' ہوتی، اب منیر احمد شیخ اور میری شرکت کی وجہ سے اچانک ''ہندو پاکستان طنز ومزاح کانفرنس'' میں تبدیل ہوگئی۔ مقالات کے تین سیشن تھے۔ ایک

نشست فکر تونسوی کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے مخصوص تھی۔ رات کو مزاحیہ مشاعرہ تھا، الغرض یہ ہندوستان کے اہم مقالہ نگاروں اور مزاح نویسوں کا بھرپور اور نمائندہ اجتماع تھا۔ ہم دونوں کو ایک ایک اجلاس میں مہمانِ خصوصی بنایا گیا۔ منیر احمد شیخ کا مزاحیہ مضمون بہت کامیاب رہا اور انہوں نے سامعین سے بھرپور داد پائی۔

میری مصروفیات کا یہ عالم تھا کہ ناشتے کے بعد ہوٹل سے نکلتا تو نصف شب سے پہلے کبھی واپسی نہ ہوتی، بھلا مقالہ لکھنے کا وقت کہاں مل سکتا تھا، حتیٰ کہ کانفرنس کا اوپننگ سیشن بھی ہو گیا۔ اگلے دن مجھ کو ہی مقالہ پڑھنا تھا چنانچہ اس رات جبکہ کیلنڈر پر نئی تاریخ آ رہی تھی تو میں نے مضمون قلم بند کیا۔ بس عزت رہ گئی، البتہ اس فقرے کی بہت داد ملی۔

''انتظار حسین لوگوں میں کیڑے ڈالتے ہیں جبکہ مشفق خواجہ کیڑے نکالتے ہیں۔''

یہ فقرہ اس طرح بار بار سنا گیا جیسے مشاعرہ میں شعر کے لیے مکرر ارشاد کہا جاتا ہے۔ اس سیشن کی رپورٹنگ میں بھی زیادہ تر میرے ہی مضمون کا چرچا رہا۔

اس کانفرنس کے باعث متعدد اہل قلم سے بھی ملاقات ہوگئی۔ مجھے یوسف ناظم صاحب سے مل کر بہت خوشی ہوئی کہ وہ بھی صاحبِ اسلوب مزاح نگار ہیں، اسی طرح ''شگوفہ'' حیدر آباد کے مدیر اور مجتبیٰ حسین کے یارِ خاص ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال سے بھی خوب گپ شپ رہی، بہت دلچسپ انسان ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ کانفرنس بہت کامیاب رہی، مقالات کا معیار بھی بہت بلند تھا اور کیوں نہ ہوتا نامور اہلِ قلم کا اجتماع تھا۔ اسی طرح مزاحیہ تحریریں بھی قہقہہ آور تھیں البتہ مزاحی مشاعرہ نہ بھایا، دراصل طنز و مزاح کے لیے بہت باریک نظر اور اسلوب کی پُرکاری کی ضرورت ہوتی ہے محض بیوی، کتے، لیڈر، ٹرانسپورٹ اور گنج وغیرہ پر مزاح نہیں باندھا جا سکتا، اس پر مستزاد بعض شعراء کی صداکاری بلکہ اداکاری۔ بہرحال یہ سب سامعین کو خوش کرنے کے لیے تھا اور اس میں وہ کامیاب رہے۔

فکر تونسوی

میں نے ''بیسویں صدی'' کے فکر تونسوی نمبر کے لیے ایک تنقیدی مقالہ قلم بند کیا تھا جس کی نقل مجھے شمع افروز زیدی نے لا دی۔ یوں مجتبیٰ حسین کی فرمائش پر یہ مقالہ فکر تونسوی کے لیے مخصوص نشست میں پیش کر دیا۔ اس روز سامعین میں فکر تونسوی کے اہل خانہ بھی موجود تھے۔

فکر تونسوی اُن ترقی پسند دانشوروں میں سے تھے جو صحیح معنوں میں ترکِ رسوم کے قائل تھے۔ ملک تقسیم ہوا تو انہوں نے شدید فسادات اور جان کو خطرے کے باوجود بھی لاہور چھوڑنے سے

انکار کر دیا۔ قتیل شفائی راوی ہیں کہ فکر کی جان کو خطرہ لاحق تھا اور وہ لاہور نہ چھوڑنے پر مُصر، لہٰذا ایک دن ڈراما کرتے ہوئے ایک خنجر بکف شخص کو انہیں ڈرانے کے لیے بھیجا گیا اور یوں انہیں زبردستی لاہور سے رخصت کیا گیا۔

ایک دفعہ لاہور تشریف لائے تو قتیل شفائی انہیں ملوانے کے لیے میرے گھر بھی لائے، بہت محبت سے گلے ملے۔ ان دنوں میں نے بھی کچھ طنزیہ مضامین لکھے تھے ان میں سے بعض انہوں نے پڑھ رکھے تھے، سو ان کی تعریف کی۔ ''فکرنامہ'' عنایت کی اور اس کے بعد ہم میں کچھ خطوط کا بھی تبادلہ ہوا۔ جب میں نے اپنے طنزیہ مضامین کے مجموعے ''طنزانیہ'' کے لیے مختصر دیباچہ کی فرمائش کی تو انہوں نے لکھ بھیجا جواب ''کلامِ نرم و نازک'' میں بطور دیباچہ شامل ہے۔ ان کے انتقال سے دلی دکھ ہوا۔

ظفر پیامی

اس کانفرنس میں ظفر پیامی (برہندر ناتھ) نے میرے تعارف میں ایک خوبصورت بات کہی جس سے میں واقعی بہت خوش ہوا اور جس کا میں نے واپسی پر لاہور میں خاصہ چرچا بھی کیا۔ کہنے لگے ''یہ جو طبقاتی تقسیم کی بات کی جاتی ہے تو میں اسے نہیں مانتا۔ یہاں دو طبقات ہیں ایک وہ جن کا گورنمنٹ کالج لاہور سے تعلق رہا ہے اور دوسرے وہ جن کا اس کالج سے کوئی تعلق نہیں۔ سلیم اختر خوش قسمت ہے کہ اس کا اس کالج سے تعلق ہے اور میں بدقسمت ہوں کہ میرا اس سے تعلق نہیں۔'' میں نے ظفر پیامی سے کہا کہ میں لاہور جا کر یہ بات سب کو بتاؤں گا۔ ظفر پیامی معروف ناول نگار اور سفرنامہ نگار تھے اور پیکرِ خلوص۔ افسوس 1989ء میں ان کا اچانک انتقال ہو گیا۔

انٹرویوز

پیغام ملا آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن میں ہمارا انٹرویو ہونا ہے۔ مجتبیٰ حسین کہ ان معاملات میں ہمارے رہنما تھے، منیر احمد شیخ کو اور مجھے لے گئے۔

آل انڈیا ریڈیو دہلی کی عمارت اگرچہ پرانی ہے مگر خوبصورت لگی۔ مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی استاد کریم خاں کے Bust پر نگاہ پڑتی ہے اور یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ یہاں فن پر مذہب غالب نہ آنے پایا تھا۔ ہم سب نے ستیش بترا صاحب کے ساتھ چائے پی اور یہیں ایک سانولی فوٹو گرافر نے ہم سب کی تصویریں بنا لیں (جو غالباً ریڈیو کے رسالے ''آواز'' میں چھپی ہوں گی۔) منیر احمد شیخ کا انٹرویو کاظم علی خاں نے اور میرا ڈاکٹر نیّر مسعود نے لیا۔ نصف

گھنٹے کے انٹرویو میں نیّر مسعود صاحب نے مجھ سے بہت کچھ اگلوا لیا۔ نیّر مسعود، نامور محقق مسعود حسن رضوی ادیب کے صاحبزادے ہیں مگر اپنی انفرادی حیثیت میں محقق، ناقد اور افسانہ نگار کے طور پر خصوصی شہرت رکھتے ہیں جنہوں نے ''سیمیا'' کا مطالعہ کیا ہے وہ ان کے افسانوں کی ہانٹڈ فضا سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ نفیس اور نستعلیق انسان ہیں۔ انہوں نے بڑی محبت سے لکھنؤ میں اپنے گھر آنے کی دعوت دی، میرے پاس لکھنؤ کا ویزا بھی تھا مگر دہلی کی مصروفیات ایسی تھیں کہ میں لکھنؤ نہ جا سکا، حالانکہ میرے لیے لکھنؤ میں رام لعل کی ذات بھی باعثِ کشش ہے، انہیں جب اخبارات کے ذریعہ سے میرے دہلی آنے کا علم ہوا تو میرے لکھنؤ نہ آنے پر گلہ بھرا خط لکھا۔

ریڈیو سے فراغت پا کر ہم دوردرشن گئے جہاں ہم دونوں کا مشترکہ انٹرویو جلیل احمد قدوائی صاحب نے لیا۔ پروڈیوسر انجم عثمانی تھے، یہ جوشیلے نوجوان ہیں اور فکشن سے خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ انہیں کے ساتھ کینٹین میں ہم نے مشہور مدراسی کھانا ''ڈوسا'' کھایا اور اسے لذیذ پایا۔

آل انڈیا ریڈیو کے برعکس دوردرشن کی عمارت کچھ بھی نہ تھی اور سٹوڈیو کا یہ عالم گویا ہمارے باورچی خانے میں ریکارڈنگ ہو رہی ہو۔ کیمرہ مین ایک سکھ تھا، نہ میں کیمرہ مین ہوں اور نہ مجھے اس کی تکنیک پر حاوی ہونے کا دعویٰ ہے لیکن متعدد ٹیلی ویژن پروگرام کرنے کی وجہ سے لائٹنگ، مائیک اور کیمرہ پوزیشن کا تھوڑا بہت اندازہ یقیناً ہے۔ مثلاً انٹرویو یا پینل ڈسکشن میں ایک کیمرہ کمپیئر پر مرکوز ہوتا ہے جبکہ دوسرا گفتگو کرنے والوں کو کور کرتا ہے جبکہ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ ہم دونوں کو ایک ایک کیمرہ فوکس کیے ہوئے تھا۔ میں نے منیر احمد شیخ کے کان میں سرگوشی کی ''یہ کیا کر رہے ہیں، ایک کیمرہ تو قدوائی صاحب پر ہونا چاہیے تھا۔'' اور وہی ہوا جب گفتگو کا آغاز ہوا تو اس غلطی کا احساس ہوا، لہٰذا کیمرے دوبارہ سیٹ کیے گئے لیکن گفتگو کے لحاظ سے یہ انٹرویو بہت کامیاب رہا۔

جہاں تک ٹی وی انٹرویو کا تعلق ہے تو یہ لاہور میں نہ دیکھا گیا، البتہ ریڈیو کا انٹرویو کئی مرتبہ نشر ہوا کیونکہ مختلف اوقات میں مختلف اصحاب نے یہ انٹرویو سننے کا ذکر کیا۔ وہاں غیر ملکیوں کو نقد معاوضہ کی بجائے تحفہ دیتے ہیں، یہ مجھے زیادہ اچھا لگا۔ پیسے ملتے تو خرچ ہو جاتے مگر پیتل کا مور اور مراد آبادی کام کی صراحی ابھی تک میرے ڈرائنگ روم میں سجی ہیں۔

دوردرشن

جیسے فلم میں ہم انڈیا سے پیچھے ہیں، ویسے ہی ٹی وی میں وہ ہم سے پیچھے ہیں۔ میں جہاں بھی

گیا، یہاں کے ڈراموں، ایکٹروں، ایکٹرسوں اور گانے والوں کا چرچا سنا۔ بھارت میں فنکار کی کتنی عزت ہوتی ہے اس کا اندازہ مہدی حسن کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے جو بھارت ہی میں ایک صاحب نے سنایا تھا، بقول مہدی حسن ''جب ہم انڈیا میں آتے ہیں تو بھگوان ہو جاتے ہیں لیکن جب وطن واپس جاتے ہیں تو پھر میراثی بن جاتے ہیں مگر بھگوان سے میراثی بننا آسان نہیں ہوتا۔''

جہاں تک سیٹ، لائٹنگ اور کیمرہ تکنیک کا تعلق ہے تو اس میں بھی دوردرشن ہم سے کوسوں پیچھے ہے۔ اس امر کا بڑی شدت سے مجھے اس وقت احساس ہوتا جب میں اتوار کو لیٹ نائٹ میں دوردرشن سے کلاسیکی رقص کا پروگرام دیکھتا ہوں، مجھے کلاسیکی رقص کے فن کی کوئی سمجھ نہیں مگر میں یہ پروگرام مس نہیں کرتا۔ دورانِ رقص رقاصہ کے بدن کی جنبشوں سے بنتے بگڑتے زاویے دیکھ کر بدمزہ ہو کر یہ سوچتا ہوں کہ اگر ان کی رقاصہ ہوا اور سٹوڈیو ہمارا تو سیٹ، لائٹنگ اور کیمرے سے رقص کے تاثر میں دو چند اضافہ کر دیں جبکہ دوردرشن میں اعضا کی اس شاعری کی عکس بندی میں کسی طرح کا جمالیاتی شعور نہیں ملتا۔ وہ تو یہ کرتے ہیں کہ ایک لانگ شاٹ، دوسرا میڈیم شاٹ اور کبھی کبھی مہندی لگے پاؤں کا کلوز اپ۔ اگر رقاصہ کے ساتھ ساتھ کیمرہ رقص نہ کر سکے تو رقص کی عکس بندی کس کام کی؟

کھل جا سم سم

وہاں کے اہلِ قلم نے بالعموم اس بات کی شکایت کی کہ پاکستان سے جو بھی آتا ہے ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے ان کی خبریں اور انٹرویوز نشر کیے جاتے ہیں بلکہ محض پاکستانی ہونے کی بنا پر بعض اوقات تو وہ لوگ بھی لفٹ لے جاتے جن کا پاکستان میں بھی کوئی خاص نام، کام یا مقام نہیں ہے جبکہ اس کے برعکس پاکستان میں بھارتی اہلِ قلم سے حسنِ سلوک نہیں کیا جاتا اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کا گلہ بجا ہے۔

یہاں جب اس موضوع پر بات کی تو جواب ملا، وہ ایسا پروپیگنڈا کے لیے کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہم پروپیگنڈا کے لیے ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔ میں اپنی مثال دیتا ہوں۔ انہوں نے جب ہمارے انٹرویوز لیے تو یہ خالص ادبی تھے اور ان میں صرف پاکستانی ادب اور ادیبوں کا تذکرہ ہوا تو انہوں ہم سے کیا حاصل کیا؟

میں سمجھتا ہوں، اصل بات بند اور کھلے معاشرے کی ہے۔ ہمارے حکمران عوام کو احمق یا چھوئی موئی سمجھتے ہیں اور ان کے بموجب یہاں خارجی اثرات نہ جانے کیا گل کھلائیں گے، غالباً انہیں اپنے عوام کے سچے پاکستانی ہونے کا یقین نہیں ورنہ بھارت سے ادب، فلم اور فنونِ لطیفہ کی جو نامور شخصیات یہاں آتی ہیں، ان کے انٹرویوز نشر ہونے سے نظریۂ پاکستان پر ضرب نہ پڑے گی۔

تھپڑ کھانے کا ایوارڈ

مجتبیٰ حسین ہم ادیبوں کو ہارمنی ایوارڈ کی تقریب میں شرکت کے لیے لے جا رہے تھے۔ ٹیکسی میں کچھ مقامی ادیب اور مرحوم دلیپ سنگھ تھا۔ ہارمنی ایوارڈ خاصہ اہم ہے اور فرقہ واریت کو ختم کر کے طبقاتی ہم آہنگی کو فروغ دینے والے سیاستدانوں، صحافیوں، ادیبوں اور سماجی کارکنوں کو دیا جاتا ہے۔ میں نے دریافت کیا، ایوارڈ دینے کا معیار کیا ہے؟

اس پر دلیپ سنگھ جو اب تک خاموش بیٹھا تھا، بولا ''اگر آپ کے منہ پر ہندو تھپڑ مارے اور آپ جواب میں کہیں کہ میں آپ سے پیار کرتا ہوں تو آپ اس ایوارڈ کے مستحق ہوں گے۔''

اور میں اچانک سب کچھ سمجھ گیا۔

تقریب کی صدارت کے ایل بھگت کر رہے تھے۔ یہ وزیر ان دنوں سکھوں کی ہٹ لسٹ پر تھے چنانچہ سٹیج پر مسلح کمانڈوز کے نرغے میں براجمان تھے۔ میں نے ایسی خوفناک سکیورٹی پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ یہ بھی ہارمنی ایوارڈ کا ایک پہلو تھا۔

نئی ناری

قیامِ دہلی کے دوران مختلف اجتماعات اور تقریبات میں مختلف انداز و اسلوب کی خواتین سے ملاقاتیں رہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی اس قابل نہ نکلی کہ سفرنامہ میں ڈالی جا سکتی کہ بیشتر ادیب تھیں، البتہ مجتبیٰ حسین نے ایک خاتون سے ملوایا جن کی ذہانت نے واقعی متاثر کیا۔ یہ ہیں مرنال پانڈے، سانولا رنگ، بوٹا سا قد اور چھوٹی سی ناک جس سے چہرے پر بچپن سا آ جاتا ہے۔ متحرک آنکھیں اور بے جھجک گفتگو، نمستے کی بجائے مصافحہ کرتی ہیں۔ نئے بھارت کی ناری ہیں، وہاں کے مقبول ہندی رسالے ''ساپتاہک ہندوستان'' کی مدیرہ ہیں، ٹی وی پروگرام کرتی ہیں، لکھک ہیں بلکہ ان کی والدہ بھی معروف ہندی ناول نگار ہیں اور بقول مجتبیٰ حسین ''مرنال سے نہیں ملے تو دہلی نہیں دیکھی''، سو ہم نے بھی اس دہلی کو دو مرتبہ دیکھا۔ ایک مرتبہ انہوں نے ہمیں ایک کلب میں شام کی چائے پر مدعو کیا اور دوسری مرتبہ اپنے دفتر میں بلایا۔ متعدد موضوعات پر ان سے دلچسپ گفتگو رہی۔ منیر احمد شیخ نے اردو کا مسئلہ چھیڑا مگر مجھے ہندو مسلم پانی کی طرح ہندو مسلم شادیوں سے زیادہ دلچسپی تھی۔ میں نے پوچھا ''ایسی شادیاں قبول ہو جاتی ہیں یا نہیں؟''

کہنے لگیں ''بہت اونچے طبقے فلم انڈسٹری یا بہت نچلے طبقے میں یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں بنتا لیکن

درمیانہ طبقہ میں زیادہ مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ عموماً دونوں خاندان والے ہی ایسی شادی قبول نہیں کرتے۔"

"اور بچے؟" میں نے پوچھا۔

"بچوں کا مسئلہ بھی رہتا ہے۔"

"خصوصاً مذہب کے حوالے سے؟"

"بالکل وہ مسلمان رہتا ہے یا ہندو یقیناً یہ مسئلہ تو ہے۔"

"اور اس کے باوجود بھی؟"

"جی ہاں، اس کے باوجود بھی ایسی شادیاں نہ صرف ہو رہی ہیں بلکہ ان کی تعداد میں اضافہ بھی ہوتا جا رہا ہے۔"

شاید سیکولر بھارت کا یہی آئیڈیل ہو مگر ہندو مسلم معاشرے میں مذہب اب بھی سب سے بڑی حقیقت ہے اور اس سے صرفِ نظر ممکن نہیں!

اور اب علی گڑھ

جب میں بھارت جانے کے لیے ویزا فارم پُر کر رہا تھا تو علی گڑھ میں قیام کے لیے کسی کا پتہ لکھنا ضروری تھا، میں وہاں کسی کو بھی اس حیثیت سے نہ جانتا تھا کہ اس کے گھر کا پتہ لکھ سکوں۔ ابن فرید سے خاصی خط و کتابت رہی تھی مگر میں نے سنا تھا کہ وہ ملک سے باہر ہیں۔ اسی ادھیڑ بُن میں تھا کہ اچانک ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ یاد آ گئے جنہوں نے میری کتاب "تنقیدی دبستان" پڑھ کر مجھے خط لکھا تھا اور اسی سے ہماری قلمی دوستی کا آغاز ہوا تھا، چنانچہ میں نے ویزا فارم پر ان کے گھر کا پتہ لکھ دیا اور احتیاطاً انہیں اس کی اطلاع بھی دے دی کہ اس دوران اگر شہر چھوڑ کر جانا ہو تو جا سکیں۔

میرے پاس لکھنؤ، علی گڑھ اور ہزاری باغ کا ویزا تھا مگر دہلی نے یوں قدم پکڑ لیے کہ خواہش اور نیّر مسعود صاحب کے پرخلوص اصرار کے باوجود بھی لکھنؤ جانے کے لیے وقت نہ نکال سکا۔ لکھنؤ تو دور تھا، آگرہ بھی نہ جا سکا۔ جہاں لوگ ویزے کے بغیر ہی سٹک جاتے ہیں۔ شاید دہلی کی مصروفیات کے باعث علی گڑھ جانا بھی رہ جاتا لیکن ہوا یوں کہ مرزا خلیل بیگ اپنی اہلیہ دردانہ اور دو پیاری سی بچیوں کے ساتھ خود بھی طنز و مزاح کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تھے، مجھ سے ملاقات ہوئی تو دونوں میاں بیوی بہت تپاک سے ملے، بجائے ناراض ہونے کے وہ اس بات پر خوش تھے کہ میں نے علی گڑھ میں قیام کے لیے ویزا فارم پر اُن کے گھر کا پتہ لکھا تھا۔ حالانکہ اصولاً تو انہیں یہ سن کر شہر چھوڑ کر چلے جانا چاہیے تھا لیکن میاں بیوی اسی بات پر مُصر تھے کہ میں ان کے ہاں ہی قیام کروں۔

بیگم دردانہ خود بھی لیکچرار ہیں اور ادب و نقد کا بہت اچھا ذوق رکھتی ہیں۔ دونوں میاں بیوی میں بہت ہم آہنگی دیکھی، وہ اشارہ کرتیں اور یہ سمجھ جاتے۔ مرزا خلیل تنقید کے اسلوبیاتی دبستان سے تعلق رکھتے ہیں، لسانیات کے شعبے میں ریڈر ہیں اور اچھا تجزیاتی ذہن رکھنے والے نقاد ہیں۔ اضافی خوبی شہریار کا ہم زلف ہونا بھی ہے۔

اگرچہ میاں بیوی کے پُرخلوص اصرار نے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا مگر یہ مسئلہ ایک اور طرح سے حل ہو گیا۔ ہوا یہ کہ طنز و مزاح کانفرنس کے ایک اجلاس کی صدارت کے لیے علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہاشم علی تشریف لائے تھے۔ تعارف پر انہیں جب معلوم ہوا کہ میں پہلی مرتبہ یہاں آیا ہوں اور علی گڑھ جانے کی خواہش ہے تو آپ نے فرمایا، آپ کسی کے گھر جانے کی بجائے ہماری یونیورسٹی کے مہمان بن کر جائیں۔ ہاشم علی صاحب نے وہیں بیٹھے بیٹھے ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ کو ایک چٹھی دے دی کہ میں یونیورسٹی کا مہمان رہوں گا، یوں رہائش کا مسئلہ بطریق احسن حل ہو گیا۔

سفر

علی گڑھ کے سفر کے بہانے مجھے دہلی کا ریلوے اسٹیشن، مسافروں کی بھیڑ اور ریل کار دیکھنے کا موقع بھی مل گیا۔

دوپہر کا کھانا ہم لوگوں نے دہلی کے اسٹیشن پر کھایا۔ ایک بڑی سی طشتری میں چھوٹے چھوٹے خانے بنے تھے جن میں اُبلے چاول، دال، سبزی اور اچار وغیرہ دھرے تھے۔ قیمت فی طشتری سات روپے تھی۔ ہمارے ہاں یہ کھانا منفی گوشت ہونے کے باوجود بھی کم از کم تین گنا مہنگا ہوتا، یہ تو تھا ہم کالوں کے لیے جبکہ غیر ملکی سیاحوں کے لیے ایک خوبصورت لاؤنج تھی۔ میں نے شیشوں والے دروازے سے اندر جھانکا تو یورپین اور جاپانی چہروں کی اکثریت نظر آئی۔ کچھ مشتاق، کچھ بے زار اور کچھ کتاب یا رسالے کے اوراق میں گم۔

دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر رش دیکھ کر پہلی مرتبہ صحیح معنوں میں آبادی کی کثرت کا اندازہ ہوا۔ دہلی کی سڑکوں پر بھی رش ہوتا ہے لیکن لاہور یا کراچی سے آنے والے ایسی بھیڑ بھاڑ کے عادی ہوتے ہیں لیکن دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر اوورہیڈ برج اور پلیٹ فارم پر خلقت کا جو اژدہام دیکھا، اسے اگر کوئی بلندی سے دیکھے تو اس جم غفیر سے تشکیل پانے والا منظر کسی اژدہے سے مشابہہ نظر آئے گا...... طویل سیاہ اور متحرک! جب یہ اژدھا غضبناک ہو کر شوکتا ہوگا تو کیا غضب نہ ڈھاتا ہوگا اور اسی سے بھارت کے فسادات کی وحشت اور بربریت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ اژدھا تباہی، بربادی اور

خونریزی کی داستانیں چھوڑ جاتا ہے۔

بھارتی ریل میں جداگانہ زنانہ مردانہ ڈبے نہیں ہوتے۔ البتہ رش کم کرنے کے لیے بعض گاڑیوں میں خاصے فاصلے کی حد تک کا ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے۔ چنانچہ علی گڑھ سے واپسی پر میں اگرچہ دہلی اترا مگر ٹکٹ انبالہ کا لینا پڑا تھا جس پر خلیل صاحب نے فقرہ چست کیا: ''لیجیے اب تو آپ اپنی سسرال بھی جا سکتے ہیں۔'' (میری بیوی انبالوی ہے) بھارتی ریل کے مقابلے میں ہماری گاڑیاں زیادہ خوبصورت ہیں، ان کی کلر سکیم بھی جاذب نظر ہے اور ڈبے بھی زیادہ آرام دہ ہیں جبکہ ان کے ڈبوں پر جو رنگ کیا گیا ہے نہ وہ سرخ ہے اور نہ براؤن بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اینٹیں پیس کر ان کی کیری کا لیپ کر دیا ہو۔ اندر سیٹیں کم آرام دہ اور گندگی زیادہ۔ مجھے خلیل صاحب نے بتایا کہ صفائی کا جو سرکاری انتظام ہے، وہ تو ہے ہی ایک اور صورت یہ بھی ہے کہ غریب آدمی اندر آ کر ڈبہ صاف کر دیتا ہے اور لوگ اسے پیسے دے دیتے ہیں۔ بھیک نہ مانگی صفائی کر لی گویا بھارتیوں نے ریلوے کے جمعداروں کی پرائیویٹائزیشن کر لی ہے۔

ایک بات البتہ اچھی لگی کہ مسافروں کی اکثریت مطالعے میں محو ملی۔ میں نے اس امر کا جائزہ لیا تو اکثریت کو فلمی رسالے، ہندی کے ڈائجسٹ، رسالے اور انگریزی اخبار پڑھتے پایا۔ خلیل صاحب کی بچیاں بھی انگریزی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ اس موضوع پر گفتگو ہوئی تو خلل صاحب نے بتایا کہ طویل سفر والی گاڑیوں میں لائبریری بھی ہوتی ہے جہاں سے دوران سفر کتابیں مستعار لے کر پڑھی جا سکتی ہیں۔ یہ بات مجھے بہت اچھی لگی، اگر ہمارے ہاں بھی یہ انتظام ہو جائے تو ہمارے مسافروں کی اکثریت جو دوران سفر ایک دوسرے کا مغز چاٹتی اور ملکی سیاست اور بین الاقوامی امور پر بصیرت افروز تبصرے کرتی رہتی ہے تو وہ اس کام سے نجات پائے اور منہ بند کر کے اگر دماغ کو نہیں تو کم از کم آنکھوں ہی کام میں لائے۔

میں کھڑکی سے باہر دیکھتا ہوں تو ریلوے ٹریک کے ساتھ کھیتوں کی ہریالی سفر کر رہی ہے۔ کھیت، درخت اور جھاڑیاں ساتھ دوڑ رہی ہیں۔ کبھی کبھی ایک ایسا قطعہ بھی نظر آ جاتا ہے جس میں سرسوں اپنے جوبن پر نظر آتی ہے۔

کول

پُرشور ہجوم اور پُرشور ٹریفک والی دہلی کی بھاگ دوڑ کے بعد علی گڑھ مجھے خوابیدہ سا محسوس ہوا، دسمبر کی مہربان دھوپ میں سوئے سوئے سے راستوں پر رکشے والے جیسے خواب دیکھتے سلوموشن میں جا رہے ہوں۔ گھنے درختوں کی سبزی دھوپ میں چمک رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ شہرت کی مناسبت سے علی گڑھ بہت بڑا شہر ہوگا مگر یہ تو قصبہ سا لگا۔ علی گڑھ کا پرانا نام ''کول'' تھا چنانچہ غالب کے ایک خط میں

اسے ''کول'' ہی کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ مرزا خلیل بیگ نے مجھے ایک پرانی مسجد دکھائی جس کے دروازے پر قطعہ تاریخ میں اسے ''کول'' ہی لکھا گیا۔ مسلم نشاۃ الثانیہ میں سرسید، ان کے رفقاء اور علی گڑھ کا جو کردار ہے اس سے سب آگاہ ہیں اس لیے مجھے اس ضمن میں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں لیکن اتنا ہے کہ قدم قدم پر ایسی یادگاریں ملتی ہیں جو اس عہد کی یاد تازہ کر دیتی ہیں جب سرسید احمد خان کی تحریک نے ہندوستان کے خوابیدہ مسلم معاشرے کو جھنجھوڑ ڈالا تھا، چنانچہ سرسید کے مرقد پر فاتحہ خوانی کرتے وقت ان کی جدوجہد ذہن میں تھی۔ آج ایک پاکستانی، عظیم مُعلّم کو خراج عقیدت پیش کر رہا تھا تو یہ بھی بالواسطہ طور پر سرسید ہی کے باعث تھا۔

علی گڑھ یونیورسٹی کا کیمپس وسیع اور خوبصورت ہے۔ میں نے سرسید کی رہائش گاہ کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ ان کی اشیاء محفوظ کی گئی ہیں۔ یہاں میں نے وکٹورین فرنیچر کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ اس میں خاص طور پر وہ صوفہ جو صرف دو افراد کے آمنے سامنے بیٹھنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ آج کل ایسے صوفے نہیں بنتے، وکٹورین ناولوں میں جس لَوسیٹ (Love Seat) کا ذکر ملتا ہے شاید وہ یہی ہو۔ مرزا خلیل ایک ماہر گائیڈ کی مانند ہر چیز کی تفصیل بتا رہے تھے۔ یہاں شبلی رہتے تھے، یہ کوٹھی رشید احمد صدیقی کی ہے۔

سرسید احمد خان نے اپنی نگرانی میں جو درس گاہ تعمیر کی وہ بعد میں یونیورسٹی بنی۔ سٹرچی ہال اور اس سے ملحقہ عمارت اب تک اصل صورت میں ہے، چنانچہ ہر کمرے پر اس کی تعمیر کے لیے چندہ دینے والے صوبے، شخصیت/شخصیات کے نام کا پتھر نصب تھا۔ میں نے بطور خاص نوٹ کیا کہ متعدد کمرے اہل پنجاب کے چندے سے تعمیر ہوئے تھے۔ جب سرسید احمد خاں پنجاب میں آئے تو اہل پنجاب نے کھلے بازوؤں سے انہیں خوش آمدید کہا اور دل کھول کر چندہ دیا تھا شاید اسی لیے انہوں نے بھی خوش ہو کر انہیں ''زندہ دلان پنجاب'' کے خطاب سے نوازا تھا۔

موسم سرما کی تعطیلات تھیں اور یونیورسٹی بند تھی، تاہم مرزا خلیل بیگ نے سب شعبوں کی سیر کرائی۔ یونیورسٹی لائبریری دیکھ کر صحیح معنوں میں میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں ٹرینڈ لائبریرین ہوں، اس لیے میں نے ہر شعبے کو ایک پروفیشنل کی آنکھ سے دیکھا اور جو دیکھا اُس نے متاثر کیا۔ مخطوطات کے شعبے میں بعض نایاب مخطوطات دیکھے۔ میں نے بطور خاص فرمائش کر کے ''تہذیب الاخلاق'' کا پہلا شمارہ دیکھا۔ یہ وہ ''تہذیب الاخلاق'' ہے، جس کا میں نے صرف ذکر سن رکھا تھا، کبھی دیکھا نہیں تھا۔

زندہ یادگاریں

ادب و نقد سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لیے علی گڑھ میں ان زندہ یادگاروں کی بھی کمی

نہیں جنہیں عرفِ عام میں نقاد یا اہلِ قلم کہا جاتا ہے۔ میں نے دو دن کے مختصر سے قیام میں زیادہ سے زیادہ اہم شخصیات سے ملنے کی کوشش کی۔ آلِ احمد سرور، پروفیسر مختار الدین احمد، مسعود حسین خان اور شہریار سے تو لاہور میں جو ملاقاتیں ہو چکی تھیں، ان کی تجدید ہو گئی اور خورشید الاسلام، اسلوب احمد انصاری، پروفیسر ثریا حسین اور قاضی عبدالستار سے لے کر اصغر عباس تک متعدد اہلِ قلم سے ملاقاتیں رہیں۔ یہ سب سنجیدہ مزاج بزرگ تھے۔ یہاں فقرے بازی کے برعکس سنجیدہ علمی اور پروقار گفتگو ہوئی لیکن اس کے باوجود ہر شخصیت کا جداگانہ اسلوب تھا۔

آلِ احمد سرور کی طبیعت اگرچہ خراب تھی لیکن انہوں نے مجھے بہت ٹائم دیا۔ گزک کھلانے کے ساتھ گزک لاہور لے جانے کی نصیحت بھی کی جس پر میں نے عمل بھی کیا۔

پروفیسر مختار الدین احمد سے لاہور اور دہلی میں ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ میں دِرِ دولت پر حاضر ہوا تو مل کر بہت خوش ہوئے، ان کی اہلیہ اور صاحبزادی بھی شریکِ گفتگو رہیں، ان کی صاحبزادی ہمارے ٹیلی ویژن ڈراموں کی مداح نکلیں چنانچہ مجھ سے مختلف ڈراموں، ڈرامہ نگاروں اور اداکاروں کے بارے میں معلومات حاصل کرتی رہیں جو ڈرامے دیکھ رکھے تھے، ان کی توصیف کی جو نہ دیکھ پائیں، ان پر اظہارِ افسوس کیا۔

جب میں نے مسعود حسین خان صاحب کو یہ بتایا کہ میری بیٹی ارم نے اپنے ایم اے اردو کے تھیسس ''اردو میں مقدمہ نگاری کی روایت'' میں ان کی مشہور کتاب ''مقدمہ تاریخ زبانِ اردو'' کا خصوصی مطالعہ کیا ہے تو بہت خوش ہوئے اور کتابیں تحفے میں دیں۔ ڈاکٹر خلیل، مسعود حسین صاحب کے شاگرد رشید ہیں اور اسی شاگردانہ عقیدت کے اظہار کے لیے انہوں نے ''نذرِ مسعود'' مرتب کی جس میں نامور اہلِ قلم نے مسعود حسین خاں کی شخصیت اور فن پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ یہ کتاب پاکستان میں بھی چھپ چکی ہے۔ لاہور میں جب بھارتی کتابوں کی نمائش ہوئی تو میں نے پروفیسر ثریا حسین کا پی ایچ ڈی کا تھیسس ''گارساں دتاسی'' خریدا تھا، اب جو معلوم ہوا کہ وہ بھی یہیں رہائش پذیر ہیں تو مرزا خلیل سے کہا کہ مجھے ان کے گھر لے چلو۔ وہ مل کر بہت خوش ہوئیں۔ پروفیسر ثریا حسین بے تکلفی سے گفتگو کرنے والی گریس فل خاتون ہیں۔ پاکستان میں مقیم اپنے رشتہ داروں کا ذکر کرتی رہیں۔ یہ واحد ہستی تھی جس نے مجھ سے گھریلو نوعیت کے سوالات بھی کیے، جب مجھ سے بیوی بچوں کا پوچھا تو میں نے بتایا دو بیٹیاں، ایک بیٹا اور صرف ایک بیوی، اس صرف ایک بیوی پر بہت ہنسیں۔ میں نے اٹھتے وقت ان کے ڈرائنگ روم میں لگی پینٹنگ کی تعریف کی تو انہوں نے فخریہ بتایا کہ میری بیٹی کا پورٹریٹ صادقین نے پینٹ کیا ہے۔

مجھے پروفیسر خورشید الاسلام سے ملنے کا بھی اشتیاق تھا۔ مرزا خلیل نے بتایا کہ وہ گوشہ نشین ہیں اور لوگوں سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے۔ میں نے کہا، کوئی بات نہیں، چلتے ہیں سلام کر کے واپس آ جائیں گے لیکن خورشید الاسلام صاحب کی دلچسپ شخصیت اور پُرلطف گفتگو نے اس ''سلام'' کو نصف رات تک پھیلا دیا۔ یونیورسٹی کی سیاست، لندن میں قیام، رالف رسل سے ہوتے ہوئے ذاتی واردات اور امورِ قلب تک ہر موضوع پر بے تکلفی سے گفتگو کرتے گئے۔ میں بہت اچھا سامع ہوں اس لیے وقت گزرنے کا اندازہ بھی نہ ہوا۔ جب آدھی رات کو رخصت ہونے لگا تو کہنے لگے ''اب آؤ تو نہ یونیورسٹی جانے کی ضرورت ہے اور نہ مرزا خلیل بیگ کے گھر، سیدھے میرے پاس چلے آنا اس گھر کا دروازہ سدا کھلا ملے گا۔''

مقبول ناول نگار قاضی عبدالستار صدر شعبۂ اردو ہیں۔ ان کا ناول ''دارالشکوہ'' بہت مقبول ہے اور پاکستان میں بھی چھپ چکا ہے۔ تازہ کارنامہ ''غالب'' ہے۔ ان سے ملنے شعبہ میں گیا، نہ جانے کس چھومنتر سے انہوں نے نصف گھنٹے میں شعبہ کے اساتذہ، طلبہ اور طالبات کو جمع کر کے مجھے ان کے سامنے اس طرح پیش کیا جیسے ہمارے ہاں کی پولیس مشہور مجرم کو پریس کانفرنس میں پیش کرتی ہے۔ میں تقریر کا آدمی نہیں اور ذہنی طور پر کسی مربوط گفتگو کے لیے تیار نہ تھا۔ تاہم ان کی فرمائش پر میں نے ''پاکستان میں جدید افسانے اور اس کے مختلف رجحانات'' پر گفتگو کی۔ سامعین نے پاکستان میں ادب و نقد کے حوالے سے بڑے تیز سوالات کیے۔ یہاں اپنی کلاس روم کی تربیت کام آ گئی ورنہ علی گڑھ والوں نے تو اُڑا دیا ہوتا۔ بہر حال یہ محفل بہت دلچسپ ثابت ہوئی، کم از کم میرے لیے۔ اسی بہانے مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ اہلِ دانش پاکستان کے ادب اور ادیبوں کے بارے میں کس نوعیت کی معلومات حاصل کرنے کے خواہاں ہیں، سامعین میں اسلوب انصاری اور پروفیسر ثریا حسین بھی شامل تھیں۔

رات کو دردانہ بھابھی نے زبردست کھانے کا اہتمام کیا تھا جس میں شہریار سے خوب گپ شپ ہوئی۔ اگرچہ شہریار کا کلام بذریعہ ریکھا بہت مقبول ہوا لیکن ''امراؤ جان ادا'' سے قطع نظر بھی وہ بہت اچھے اور مقبول شاعر ہیں۔

علی الصبح ڈولتے رکشے پر سٹیشن کو رواں تھے۔ پرسکون سڑکیں خوابیدہ سی تھیں اور میں بھی۔ مرزا خلیل، بھابھی دردانہ اہلِ علم اور شعبۂ اردو نے جو محبت دی تھی وہ میری چھوٹی سی جھولی کے لیے بہت زیادہ تھی۔ مرزا خلیل سے گلے مل کر رخصت ہوا تو دل بوجھل تھا۔

اوڈیسی کا اختتام

اور اب میری اوڈیسی کا اختتام تھا۔

رحمان نیر اور شمع افروز زیدی ایئرپورٹ تک چھوڑنے آئے بلکہ کلیرنس تک کھڑے رہے کہ سامان کا مسئلہ پیدا ہو تو وہ کچھ بیگ واپس لے جائیں مگر یہاں محبوب ظفر صاحب کے طلسمی ٹیلی فون نے سامان کلیئر کروا دیا۔

دہلی ایئرپورٹ بہت بڑا ہے اور سکیورٹی کا انتظام ہمارے مقابلے میں کہیں زیادہ سخت۔ ڈیپارچر لاؤنج سے ایک لمبی سی سرنگ سیدھی ہوائی جہاز کے دروازے تک لے جاتی ہے۔ یقیناً یہ ''سرنگ'' باہر سے ایک پھیلے بازو جیسی دکھائی دیتی ہوگی۔ اس ''سرنگ'' میں بھی قدم قدم پر سکیورٹی والے واکی ٹاکی لیے ایستادہ یا مسلسل چیکنگ میں مصروف تھے۔ ہیما مالنی کے جسم کو خاکی ساڑھی میں چھپائے ایک سانولی، خواتین کی چیکنگ کر رہی تھی۔ میں نے دعا مانگی کہ اے کاش یہ میری بھی چیکنگ کرے۔ خدا کے بعد بھگوان سے بھی پرارتھنا کی مگر دونوں کے ہاں شنوائی نہ ہوئی، لہٰذا ڈشکروں نے چیکنگ کی اور پھر آخری چیکنگ ہوائی جہاز کے دروازے پر۔

ہم سفر

اب ہم ایئربس A-300 میں تھے۔ میں ایک کھڑکی کے ساتھ بیٹھ جاتا ہوں۔ ایک خاتون تیزی سے میری طرف آتی ہے اور ساتھ والی سیٹ پر بیٹھتے ہی بیلٹ باندھنے لگتی ہے۔ وہ میری طرف دیکھ کر انگریزی میں پوچھتی ہے ''یہ تمہاری سیٹ کی بیلٹ ہے یا میری سیٹ کی؟'' اور یوں ہماری گفتگو شروع ہوگئی۔

میں طبعاً باتونی نہیں اور سفر کی بے معنی گفتگو مجھے سخت ناپسند ہے۔ صحبت ناجنس سے بچنے کے لیے میں کئی گھنٹے خاموش تو بیٹھ سکتا ہوں لیکن بے معنی گفتگو میں شریک نہیں ہو سکتا۔ جو آدمی مردوں سے ہم کلام نہ ہو بھلا ایک عورت سے کیسے گفتگو شروع کر سکتا تھا اور وہ بھی انگریزی میں کہ ہم تو اردو میڈیم کا چلتا پھرتا اشتہار ہیں مگر یہ عورت اتنی دلچسپ کمپنی ثابت ہوئی کہ میں اسے فراموش نہ کر سکا۔ مجھے سفر میں اس سے پہلے بھی ایک اور عجیب و غریب (یا پراسرار) عورت سے گفتگو کا اتفاق ہوا تھا اور میں نے اسے سامنے رکھ کر جب افسانہ ''کاٹھ کی عورتیں'' لکھا تو بہت سے لوگوں نے کہا کہ کیا فنٹاسٹک تھیم ہے، حالانکہ اس افسانے میں ساہیوال تک ساتھ سفر کرنے والی عورت کی گفتگو حقیقی تھی اور اس میں قطعاً رنگ آمیزی نہ کی گئی تھی۔

عورتیں بالعموم بہت بولتی ہیں اور فوراً ہی یا ذاتی قسم کے سوالات کرتی ہیں ورنہ خود ذاتی قسم کی گفتگو پر اتر آتی ہیں مگر یہ غالباً ان عورتوں میں سے تھی جو خاموش نہیں رہ سکتیں۔ ساتھ کی تیسری سیٹ پر ایک امریکی بیٹھا تھا۔ میں چاہوں تو اچھا سامع بن سکتا ہوں شاید اسی لیے وہ زیادہ تر مجھ سے ہم کلام رہی۔ کبھی کبھی امریکن کو بھی لقمہ دے دیتی اور وہ اسی سے خوش ہو جاتا۔

یہ آسام کی تھی۔ عمر پچاس سے کم نہ ہوگی پتلا مثلث نما چہرہ، تیکھی ناک، نوکیلی ٹھوڑی، متحرک آنکھیں اور بہت تیز لہجے میں گفتگو کرتی۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ چالیس منٹ کی فلائٹ میں اس نے اپنے بچپن، جوانی، محبت، شادی اور پھر میاں کا انتقال یہ تمام واقعات مجھے سنا دیئے۔ میاں کے انتقال کے ذکر کے بعد وہ اچانک خاموش ہوگئی، چہرے پر سے ایک بادل سا گزر گیا۔ مجھے اس کی آنکھیں بھیگی بھیگی محسوس ہوئیں۔ میں نے جھجک کر منہ کھڑکی کی طرف کر لیا جہاں آسمان دُھلا دُھلا نظر آ رہا تھا۔

اس دوران میں امریکن نے مجھ سے پوچھا ''کیا نیچے پہاڑ، وادیاں اور خوبصورت لینڈ سکیپ ہے؟'' میں نے جواب دیا ''اول تو تیس ہزار فٹ کی بلندی سے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ویسے بھی نیچے صرف میدان اور کھیت ہیں، اگر لاہور سے اسلام آباد جاؤ گے تو کچھ پہاڑ نما چیزیں بھی دیکھ سکو گے۔''

اس نے پریشان ہو کر پوچھا ''کیا مجھے لاہور میں امریکن سگریٹ مل سکتے ہیں؟''

میں نے کہا ''آپ کے پاس ڈالر ہوں تو سگریٹ تو کجا ہیروئن اور کوکین بھی مل سکتی ہے۔ لاہور میں کسی چیز کی کمی نہیں!''

اتنے میں وہ جیسے یادوں کے حصار سے باہر آ گئی اور کہنے لگی ''مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔ میں اتنی افراتفری میں آئی کہ دوپہر کا کھانا بھی نہ کھا سکی۔'' وہ ایک مسکراہٹ ناآشنا ایئرہوسٹس کو دیکھ کر بولی ''مجھے اتنی بھوک لگی ہے کہ میں اس ہوسٹس کو بھی کچا چبا سکتی ہوں۔''

میں نے کہا ''مجھے کوئی اعتراض نہیں، بشرطیکہ یہ خوش ذائقہ ہو۔'' اس نے اشارے سے اس ہوسٹس کو بلایا اور اسی تیز لہجے میں کہا ''اگر تم ذرا سا مسکرا دو تو اس میں کوئی حرج نہ ہوگا۔'' ہوسٹس ٹک ٹک دیدم سی رہ گئی۔

آسام کے ذکر پر میں نے وہاں کے مشہور منی پور رقص کا ذکر چھیڑا تو اس نے نہ صرف اس رقص کی پوری تکنیک سمجھائی بلکہ ہاتھوں اور آنکھوں سے عملی مظاہرہ بھی کیا۔

اتنے میں سینڈوچز اور چائے کی تقسیم شروع ہوگئی تو اس کے چہرہ پر بچوں جیسی خوشی کی لہر آ گئی۔ اس نے بڑی بے تابی سے منی ٹرے لی اور کھانا شروع کر دیا۔ میں نے اخلاقاً اپنا سینڈوچ پیش کیا تو اسے بھی قبول کر لیا۔ سامنے کی سیٹ پر دو موٹی موٹی عورتیں بیٹھی تھیں۔ کہنی مار کر مجھے ان کی طرف متوجہ کیا اور کہنے لگی ''یہ غالباً ہندو ہیں، اس لیے یہ پی آئی اے کے سینڈوچز نہیں کھا رہیں۔'' اور اگلے ہی لمحے ان دونوں سے کہا ''اگر آپ لوگوں نے نہیں کھانے تو یہ مجھے دے دیں۔'' ان دونوں نے جھجک کر اسے دیکھا، کچھ سمجھیں، کچھ نہ سمجھیں مگر خاموشی سے اپنی اپنی ٹرے اسے تھما دی۔ اس نے مسکرا کر فاتحانہ انداز میں مجھے دیکھا اور سب کچھ صاف کر دیا۔ میں نے کہا ''ہوسٹس سے اور مانگ لیتے ہیں۔''

کہنے لگی ''وہ بھی مانگوں گی، پہلے ذرا ان سے نپٹ لوں۔''

کھا پی کر اسے یاد آیا کہ اس نے مجھ سے تو میرے بارے میں کچھ پوچھا ہی نہیں۔ چنانچہ کہنے لگی ''میں اب تک اپنی باتیں کرتی رہی ہوں، تم سے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ دہلی کیوں گئے تھے؟''

میں نے اپنا نام بتایا، گورنمنٹ کالج لاہور کا بتایا اور یہ کہ غالب سیمینار میں شرکت کے لیے گیا تھا۔

غالب کا نام سن کر اس نے صاف اردو میں غالب کے اشعار سنانے شروع کر دیئے۔ میں نے تعریف کی تو میر کے اشعار بھی سنانے لگی۔ میں نے پوچھا ''یہ شعر کہاں سے سیکھے؟''

کہنے لگی ''بچپن میں سکول میں۔''

جب یہ معلوم ہوا کہ میں نقاد ہوں تو اس نے ایک نقاد کا نام لیا اور پوچھا ''جانتے ہو؟ یہ ایک بیورو کریٹ تھے اور اب مرحوم ہیں۔'' میں نے کہا ''میں ان سے ملا تو نہیں لیکن ان کی ایک کتاب پڑھ رکھی ہے بلکہ میرے پاس بھی ہے۔'' سن کر خوش ہوئی اور کہنے لگی ''یہ میری بہن کے خاوند ہیں۔ میں اسلام آباد انہی کے گھر جا رہی ہوں۔''

گفتگو میں اردو کا لفظ سن کر امریکن بولا ''میرا ایک بھائی بھی اردو بولتا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''وہ کراچی میں خاصا عرصہ رہا تھا۔''

لینڈنگ کا اعلان ہو رہا تھا۔ اس نے پرس میں سے رومال نکال کر منہ صاف کیا۔ آنکھوں میں کاجل ڈالا اور لپ اسٹک درست کی، پھر بولی ''اب میں خود کو انسان محسوس کر رہی ہوں۔''

جہاز لاہور کے رن وے پر ٹیکسی کر رہا تھا، پھر رک گیا۔ میرے ساتھ امریکن نے ہاتھ ملایا۔ اس نے بھی ہاتھ ملایا اور یوں زندگی سے بھرپور ہنستی مسکراتی اور تیز لہجہ میں انگریزی بولنے والی اس آسامی خاتون سے رخصت ہوا۔

یہ عورت بنا بنایا افسانہ تھی۔ چنانچہ میں نے ''چالیس منٹ کی عورت'' کے نام سے جو افسانہ قلم بند کیا، اس میں مجھے اس کے کردار یا مکالموں کے سلسلہ میں خود کچھ بھی نہیں کرنا پڑا کیونکہ یہ بنا بنایا کردار تھی۔ صرف اختتام کی چند سطریں میری ہیں۔ اس سفر کا میرے لیے یہ افسانہ سب سے بڑا تحفہ ثابت ہوا۔ اشاعت کے بعد سے یہ افسانہ پاکستان اور بھارت کے کم از کم درجن پرچوں میں چھپ چکا ہے۔

ٹارن کی واپسی

پاکستانی کسٹم کا کاؤنٹر۔

''اس بیگ میں کیا ہے؟''

''کتابیں!''

''اُس بیگ میں کیا ہے؟''

''کتابیں!''

''اور اُس بوری میں کیا ہے؟''

''کتابیں!''

''اور اُس بڑے سے اٹیچی کیس میں کیا ہے؟''

''کتابیں اور بچوں کے لیے کپڑے۔''

کسٹم والا پریشان ہو کر میری صورت دیکھتا ہے۔

''سامان چیک کرائیے۔''

میں اسے اپنا نام اور کالج کا بتاتا ہوں اور یہ بھی کہ ادیب ہوں اور غالب سیمینار سے واپس لوٹ رہا ہوں۔

وہ کہتا ہے ''اچھا آپ پروفیسر ہیں تو پھر ٹھیک ہے، چلے جائیے۔'' اور چاک سے میرے سامان پر کراس کا نشان لگا دیتا ہے۔

میں سامان سے لدی ٹرالی دھکیل کر چند قدم چلتا ہوں کہ وہ آواز دے کر روکتا ہے۔ ''ایک منٹ پروفیسر صاحب! آپ انڈیا سے شراب تو نہیں لائے؟''

''بھائی میں تو کافی بھی نہیں پیتا، شراب کہاں سے لاؤں گا؟''

وہ ہنستا ہے، میں بھی ہنستا ہوں۔ ایئرپورٹ سے باہر آتا ہوں جہاں بیگم اور جودت مسکراہٹوں کے خیر مقدم ہار لیے موجود تھے۔

وقت کی زقند

پلٹ رہے ہیں غریب الوطن پلٹنا تھا
وہ کوچہ روکش جنت ہو، گھر ہے گھر پھر بھی

میں گھڑی تیس منٹ پیچھے کرتا ہوں، پھر سوچتا ہوں کہ کیا گھڑی واقعی تیس منٹ پیچھے ہو سکتی

⌘⌘⌘⌘⌘⌘⌘⌘⌘

ماریشس

اُڑن طشتری

وہ ہوئے ہم کلام

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں فون اٹھاتا ہوں۔ دوسری جانب نذیر ناجی صاحب ہیں۔ حال چال پوچھنے کے بعد کہنے لگے:

''ڈاکٹر صاحب! اگر آپ کو ماریشس بھیجا جائے تو کیا آپ جانا پسند کریں گے؟''

وہ بتاتے ہیں، وہاں سر سید احمد خان کی صد سالہ تقریبات کے سلسلہ میں ایک سیمینار منعقد ہو رہا ہے۔ انہوں نے پاکستان سے دو نقاد اور دو شاعر طلب کیے ہیں اور یہ کہ مجھے اکادمی ادبیات پاکستان کے نمائندہ کی حیثیت سے ماریشس بھیجا جا سکتا ہے۔ مجھے کچھ نہ کرنا ہوگا۔ بس ایک مقالہ سپردِ قلم کرنا ہوگا...... کیا میں سر سید احمد خان پر مقالہ قلم بند کرلوں گا؟

''ناجی صاحب! مقالہ لکھنا تو کوئی مسئلہ نہیں، سر سید احمد خان ایم اے اردو کے نصاب میں ہے اور عمر بھر کلاسوں کو یہی کچھ پڑھاتے رہے ہیں۔''

''بس! تو پھر طے؟''

اس کے بعد سلیم اختر کیانی صاحب ڈائریکٹر جنرل اکادمی اور مسعود احمد صاحب چیف سٹاف آفیسر سے ٹیلی فونک مذاکرات کے طویل سلسلے کا آغاز ہوا۔ پاسپورٹ، کاغذات، دستاویزات اور ویزے سے متعلق دیگر امور...... حتیٰ کہ ایک دن انہوں نے خوشخبری سنائی کہ سیمینار غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی ہوگیا ہے۔

میں ان لوگوں میں سے ہوں جنہیں راہ چلتے اچھے اتفاقات نہیں لگتے چنانچہ میں نے کبھی خود کو ''تجمل حسین'' نہ جانا، اس لیے التوا کی خبر نے نہ تو پریشان کیا اور نہ ہی ملول! اگرچہ میرے برے اتفاقات کی فہرست میں ایک اور اندراج کا اضافہ ہوگیا، لہٰذا ماریشس کو ذہن سے نکال دیا اور پھر

اچانک مسعود احمد صاحب نے فون کیا۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ کا ویزا لگ گیا ہے، تمام کاغذات تیار ہیں۔ آپ کی فلائٹ بک ہو چکی ہے۔ آپ 27 اکتوبر کو لاہور سے روانہ ہوں گے۔ ناجی صاحب بار بار کہہ رہے ہیں کہ آپ کو دورانِ سفر کسی طرح کی بھی تکلیف نہ ہو، لہٰذا آپ کے آرام کا ہر لحاظ سے خیال رکھا گیا ہے۔''

انہوں نے مزید بتایا۔

''ہماری ایمبیسی بھی اس معاملے میں شریک ہے اور ہائی کمشنر صاحب آپ سے ملنے کے مشتاق ہیں۔ انہیں آپ کی فلائٹس وغیرہ کے بارے میں تمام تفصیلات کا علم ہے۔ کوئی بھی دقت ہو یا کوئی مسئلہ تو ایمبیسی سے رجوع کریں، آپ کی ہر لحاظ سے مدد کریں گے۔''

میں شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مسعود احمد صاحب ''سفر بخیر'' کہتے ہیں۔

کہاں ہے منزل......؟

گھر والے اور دوست پوچھتے تھے ''یہ ماریشس کہاں ہے؟''

''میرا خیال ہے افریقہ میں ہے۔''

''افریقہ میں؟''

''ایشیا اور یورپ میں تو اس نام کا کوئی ملک ہے نہیں، لہٰذا اسے افریقہ ہی میں ہونا چاہیے۔''

''افریقہ؟'' پھر پوچھا جاتا ''کالوں کا علاقہ؟''

''ہاں، علاقہ تو کالوں ہی کا ہوگا۔''

''وہ تو آدم خور ہوتے ہیں۔''

''وہ تو جنگلی جانوروں کو کچا کھا جاتے ہیں۔''

''وہاں کیا کھاؤ گے؟''

''میں بھی کوئی بندہ بشر کھا ہی لوں گا۔''

''ہائیں؟''

''اور کیا اگر کوئی میم ہاتھ لگ گئی، اسے تو خوشی سے چٹ کر جاؤں گا۔'' میم کو سفرنامہ میں ڈالنے سے چٹ کرنا زیادہ بہتر ہے۔

نقاد ہونے کے باوجود میری جنرل نالج اچھی خاصی ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ خود مجھے بھی صحیح علم نہ تھا کہ ماریشس کہاں ہے؟ میں نے چند برس قبل ماریشس کا نام عجب معاملے میں سنا تھا!

ہمارے ایک دوست کے ایک ناکارہ اور آوارہ بھائی نے ماریشس کی ایک لڑکی سے قلمی خط و کتابت کا آغاز کیا جو بتدریج قلمی دوستی سے قلبی تعلقات میں تبدیل ہوگئی۔ لڑکی نے اسے اپنے پاس ماریشس بلا لیا۔ دونوں نے شادی کرلی اور آخری خبریں آنے تک ہنوز، ساحلِ سمندر پر فلمی گانے گا رہے ہیں۔ چلیں اور کچھ نہیں، یہ تو اندازہ ہوگیا کہ ماریشس کی لڑکیاں بھولی بھالی اور دریا دل ہوتی ہیں۔ پاکستان کی معیشت سے ایک پاکستانی کا بوجھ کم ہوا تو اس کا کریڈٹ بھی ماریشس کی اسی حسینہ کو جاتا ہے۔

دنیا کا نقشہ دیکھا، اٹلس دیکھی، گلوب دیکھا مگر ماریشس کا کہیں نام و نشان نہ پایا۔ یا مظہر العجائب اتنا گمنام ملک کہ نقشہ میں بھی ظاہر نہیں کیا جاسکتا۔ واقعی یہ مُنّا سا ملک ہے۔ لاہور جتنا بھی نہیں، افریقہ کے نچلے حصے میں مڈغاسکر کا بہت بڑا جزیرہ ہے۔ اس کے پہلو میں بحرِ ہند میں ایک پِن چبھودی جائے تو شاید یہ بھی ماریشس ظاہر کرنے کے لیے کچھ بڑی ہی ثابت ہوگی، ایسی ہی ایک اور پِن ماریشس کے قریب چبھودیں تو یہ سیشلز ہوگا۔ عالمی مقابلۂ حسن کے انعقاد کی وجہ سے اب یہ ننھا سا جزیرہ عالمی شہرت اختیار کر چکا ہے۔

اوڈیسی

ٹکٹ بلکہ زیادہ بہتر تو یہ ٹکٹوں کا جو پلندہ ملا وہ اتنا الجھا ہوا تھا کہ کچھ سمجھ ہی نہ آیا۔ مسعود احمد صاحب نے پورے سفر کی ایک ایک تفصیل الگ سے لکھ بھیجی تھی جن کے تجزیہ سے یہ انکشاف ہوا کہ یہ سفر چار ہوائی جہازوں کے ذریعے طے ہونا تھا۔ لاہور، کراچی، دبئی اور نیروبی سے مختلف ایئر لائنز کے طیاروں کو ہماری خدمت کا سنہری موقع مل رہا تھا۔

لاہور ہی میں شگون خراب ہوگیا، حالانکہ کسی کالی بلی نے تو کجا کالی لڑکی نے بھی راستہ نہ کاٹا تھا پھر بھی بلڈ پریشر ہائی ہونے کا ماحول بن گیا۔ ایئر ایشیا کے کاؤنٹر پر بیٹھی لڑکی نے بتایا کہ کمپیوٹر لسٹ میں میرا نام نہیں ہے۔ میں اسے ٹکٹوں کا پلندہ دکھاتا ہوں اور بتایا کہ میری یہ سیٹ او کے ہے لیکن اس کا ایک ہی جواب ہے کہ کمپیوٹر لسٹ کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا۔ میں اسے بتاتا ہوں کہ یہ تین کنیکٹنگ فلائٹس والا طویل سفر ہے۔ یہ فلائٹ مِس ہونے کا مطلب ہے کہ نہ صرف میں جانے سے رہ گیا بلکہ ٹکٹوں پر خرچ کی گئی اکادمی کی رقم بھی ڈوب گئی۔ وہ کہتی ہے اسلام آباد سے جہاز آلے، پھر پتہ چلے گا کہ کتنی سیٹیں خالی ہیں اور پھر آپ کو چانس مل سکتا ہے۔ ہوا دراصل یہ کہ ٹکٹ تو اسلام آباد سے بک کیا گیا تھا۔ مسعود احمد صاحب نے یہ سوچا کہ میں جو محض طیارہ پر سواری کی خاطر اسلام آباد آؤں تو میں لاہور ہی

سے سوار ہوجاؤں لیکن ٹریول ایجنسی نے کمپیوٹر میں یہ فیڈ نہ کیا۔

جیسے جیسے مسافروں کی قطار میں اضافہ ہوتا جارہا تھا اسی نسبت سے میرا بلڈ پریشر اور بلڈ پریشر کے پیمانے سے اعصابی تناؤ میں بھی اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ جہاز کی آمد کا اعلان ہوا، مسافر طیارے پر سوار ہونے کے لیے لاؤنج میں جارہے تھے۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ کاؤنٹر والی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی انگلیاں تیزی سے کمپیوٹر کے کی بورڈ پر چل رہی تھیں، بالآخر وہ مسکرا کر کہتی ہے:

''لائیے اپنا ٹکٹ۔''

وہ ماریشس جو دور بحر ہند کے افق میں غروب ہو رہا تھا، بورڈنگ کارڈ کی صورت میں اب میری مٹھی میں تھا۔

ننھے منے بچے تیری مٹھی میں کیا ہے؟

لاہور...... کراچی...... نیروبی...... ماریشس تک کا ہوائی سفر کوئی چودہ گھنٹے کا بنتا ہے جو چار طیاروں کے ذریعے طے ہونا تھا اور ان طیاروں کے انتظار میں مجموعی طور پر بیس گھنٹے مختلف ایئرپورٹس میں گزارنے تھے۔ ابھی اس میں مختلف مقامات کا مقامی وقت شامل نہیں کیا جارہا تھا، میں نے زندگی میں آج تک ایسا لمبا سفر نہ کیا تھا۔ یہ سفر کئی ہزار میل کا تھا، تب میں سمجھا کہ باقی شاعروں اور ناقدین نے ماریشس جانے سے کیوں انکار کردیا۔ تنہا طویل مسافت بذاتِ خود عقوبت ہوتی ہے۔

میں کیونکہ لاہور میں ویگنوں میں دھکے کھاتا اور رکشوں پر ڈسک سلپ گراتا ہوں اس لیے ہوائی جہاز کا سفر میرے لیے پرلطف ہوتا ہے۔ کراچی تا نیروبی امارات کے دو طیاروں میں سفر کیا۔ باقی باتیں تو چھوڑیئے ان کی ایئر ہوسٹسوں میں اچھی خاصی اقوام متحدہ تھی یعنی ہر ایئر ہوسٹس الگ ملک کی انگریز، جرمن، بھارتی، فرانسیسی اور اس کا باقاعدہ اعلان کیا گیا تاکہ مسافر زبان کی دقت محسوس نہ کریں اور بھی کئی خوبیاں تھیں لیکن میں اس تحریر کو پبلسٹی بروشر میں تبدیل نہیں کرنا چاہتا، البتہ عربی کے بعض الفاظ کے معانی ہمارے ہاں مروج الفاظ سے جداگانہ نظر آئے۔ مثلاً طیارہ میں سیٹ بیلٹ کے بارے میں انگریزی اور عربی میں تحریر تھا۔ پڑھا تو آنکھیں کھل گئیں Seat ''مقعد'' اور Seating ''جلوس'' کے لیے تھا، اب ذرا اپنی زبان میں ان الفاظ کے معانی پر غور کیجیے۔ دبئی ایئرپورٹ پر زنانہ واش روم پر Female کے لیے ''السیدات'' لکھا پایا۔ ہمارے لیے سیّد بادشاہ، شاہ صاحب اور سیّدانی جی کلمات احترام ہیں جبکہ عربوں کے لیے یہ محض Male اور Female ہیں۔ جبھی تو ہر نوع کے سیّد بادشاہ ہمارے ہاں پائے جاتے ہیں۔

چن کتھاں گزاری اے رات وے

مقامی وقت کے مطابق، میں رات ساڑھے دس بجے کے قریب نیروبی پہنچا۔ کینیا کو آزادی دلانے والے جوموکینیٹا کے نام سے یہ ہوائی اڈہ منسوب ہے۔ جوموکینیٹا افریقہ کی ان شخصیات میں سے ہے جنھوں نے جدوجہد سے اپنے ملک پر سے مغرب کے تسلط کو ختم کیا۔ حصولِ آزادی کے لیے اس نے جو تحریک شروع کی وہ ''ماؤ ماؤ'' کے نام سے مشہور ہوئی اور انگریزوں کے لیے دہشت گردی کے مترادف تھی۔ بہرحال اب کینیا آزاد ملک ہے اور پاکستان سے دوستانہ مراسم ہیں۔ ہمارے سابقہ محبوب وزیراعظم کے پیارے بیٹے نے وہاں شکر کا کارخانہ لگایا، جس پر بے حیا اپوزیشن نے بیکار میں واویلا کیا۔

مجھے رات ایئرپورٹ پر بسر کرنی اور پھر اگلے روز دوپہر کے ساڑھے بارہ بجے برٹش ایئرویز کے طیارے سے ماریشس روانہ ہونا تھا۔ لوگوں نے کالوں کے بارے میں بہت زیادہ ڈرا رکھا تھا، وہاں کسی سے بات نہ کرنا، کسی کے ہاتھ سے کچھ نہ کھانا، شہر نہ جانا، حبشی کی ٹیکسی میں نہ بیٹھنا وغیرہ وغیرہ۔ الغرض! اچھا خاصا پند نامہ برائے سفر مرتب ہو گیا تھا۔

میں اس خوش فہمی میں تھا کہ شب بسری کے لیے ایئرلائنز نے بندوبست کر رکھا ہو گا لیکن جب سفر چار جہازوں سے ہو رہا ہو اور وہ بھی چار جداگانہ ایئرلائنز سے تو ہمارا ذمہ دار کون بنتا؟ لہٰذا میں نے اس رات اجنبی ملک کے نامانوس ایئرپورٹ پر خود کو لاوارث سامان کی مانند پایا۔ ایئرلائنز کے کاؤنٹر پر کھڑے حبشی سے بات کی، اس نے کمپیوٹر پر انگلیاں دوڑائیں، میرا ٹکٹ دیکھا، پاسپورٹ ملاحظہ کیا اور خوشخبری سنائی کہ میرے نام کی کسی ہوٹل میں کوئی بکنگ نہیں۔

''اب میں کیا کروں؟''

وہ تسلی دیتا ہے۔ انتظار کرنے کو کہتا ہے، کچھ بندوبست ہو جائے گا۔ جب صبح کی فلائٹ پکڑنے کے لیے انسان گھر سے پانچ بجے نکلا ہو، دن بھر ایئرپورٹس پر انتظار کی کوفت برداشت کی ہو، آٹھ دس گھنٹے سفر میں گزارے ہوں تو تھکن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ غالباً اس وقت کی کیفیت بیان کرنے کے لیے تھکن کا لفظ بہت ہلکا ہے، کوئی زیادہ موزوں لفظ ہونا چاہیے۔ بس یوں سمجھیے کہ جی ڈھیر ہو جانے کو چاہتا ہے، کہیں بھی! کسی طرح بھی! ادھر کالوں کے بارے میں جو بھیانک اندیشے لوگوں نے دل میں بٹھا رکھے تھے، وہ بھی اب پھن اٹھا رہے تھے۔ حالانکہ یہ انٹرنیشنل اور مصروف ایئرپورٹ تھی، ایسی بھی نہ تھی کہ چار حبشی آئیں گے، مجھے اٹھائیں گے، تیل سے کھولتی کڑاہی میں ڈالیں گے اور

بھون کر کھا جائیں گے (ویسے بھی نقاد کو کھانا اور پھر ہضم کرنا آسان نہیں)

میں کاؤنٹر کے سامنے خاموش بیٹھ گیا اور پھر تھوڑی سی دیر میں مجھ ایسے چار درویش اور بھی جمع ہو گئے۔ ایسے مواقع پر کوئی کسی کا تعارف نہیں کراتا، خود بخود ہی بات شروع ہو جاتی ہے، سب جداگانہ فلائٹس سے آئے تھے اور اپنی اپنی الگ منزل تھی لیکن سب کا مسئلہ مشترک تھا، رات کہاں گزرے؟ سب پہلی مرتبہ اس علاقہ میں آئے تھے، سب ناتجربہ کار تھے اور سب تھکے، پریشان اور اپنے اپنے اعصاب کے لحاظ سے پُرتناؤ! ان میں سے ایک کراچی کا، ایک اسلام آباد، کا ایک اندرونِ لاہور کا اور ایک آگرہ کا ہندو...... یہ سب میرے مقابلے میں نوجوان تھے یعنی تیس سے کم عمر کے ان میں کراچی والا سب سے زیادہ خوفزدہ تھا۔

''یہ سالا کالا ادھر ہی دیکھے جا رہا ہے۔''

''یہ......اس طرف کیوں آ رہا ہے؟''

''وہ......سپاہی مجھی کو دیکھے جا رہا ہے۔''

ایسے ہی دو چار فقرے بولتا اور پھر گھبرا کر بالکل رستہ تڑانے والے انداز میں اٹھ کر دور کوریڈور کے آخری سرے تک نکل جاتا، جب ادھر اُدھر گھومتا ہوا تھک جاتا تو پھر گھبرایا ہوا آتا۔

''وہ دو کالے......میرے پیچھے لگے ہیں۔''

کراچی والا کراچی میں ڈرے تو بات سمجھ میں آتی ہے لیکن کراچی والا نیروبی میں کیوں ڈرے یا پھر یہ کہ اس بیچارے کی خوف سے کچھ ایسی Conditioning ہو چکی تھی کہ وہ ڈرنے کے علاوہ اور کچھ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کا خوف وائرس کی مانند ہم پر بھی اثر انداز ہو رہا تھا۔ ہم سب اسے تسلی دیتے ہیں، سمجھاتے ہیں، اسے تسلی دینے کے بہانے اپنا ڈر دور کرتے ہیں مگر بے سود، وہ گھبرا کر یہ کہتا ہوا پھر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

''دیکھو! وہ سالا کالا مجھے دیکھ کر ہنس رہا ہے۔''

اس کی نظروں سے اوجھل ہوتی ہوئی پشت کو دیکھ کر میرے دل میں نیا اندیشہ ابھرتا ہے، کہیں یہ کوئی ہیروئن وغیرہ تو نہیں لے جا رہا جو اتنا خوفزدہ ہے۔ پھر میں نے سوچا، یہ پکڑا گیا تو ہم بھی اسی کے ساتھ دھر لیے جائیں گے۔ یقیناً کالوں کی کال کوٹھڑیاں کالوں سے زیادہ خوفناک ہوں گی۔ کالے افریقہ میں کالے حبشیوں کی کال کوٹھڑی...... جیسے کسی جدید شاعر کی آزاد نظم کا عنوان!! جدید شاعری کی نظم کے عنوان کے بجائے ذہن میں صبح کے اخبارات کی سرخیاں ناچنے لگتی ہیں:

یقیناً "Smugler's Gang Cught!","Pakistani Critic Arrested."

خوف بھی موذی مرض کی مانند ہوتا ہے۔

ان چاروں میں سے بھاٹی کا نوجوان سب سے کم عمر تیز اور چلبلا بلکہ کھلنڈرا تھا۔ لاہوریوں سے مخصوص بے تکلفی اور کھلا پن اس میں بھی تھا بلکہ کچھ زیادہ ہی تھا۔ راستے کے تمام جہازوں کی بیشتر ایئر ہوسٹسیں نہ صرف یہ کہ اس نے پھانسی تھیں بلکہ سب کی سب خالی سیٹوں کے پیچھے اس کی ''دل جوئی'' میں بھی مشغول رہیں۔ یہ تو میں نے ''دل جوئی'' لکھا ہے۔ اس نے کسی اور طرح کی کارروائی کی روداد سنائی تھی، بس یوں سمجھیے کہ اپنے یار مستنصر حسین تارڑ کا پاکٹ ایڈیشن تھا۔ ایئر پورٹ پر آئے اسے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا ورنہ دو چار گھنٹے کے قیام کے بعد اس نے تو دو چار کالیاں بھی پھانس لینی تھیں۔ اب یہ بحث طلب امر ہے کہ پھنس جانے کے بعد کالیاں اس کے ساتھ کیا کچھ کرتیں۔ ویسے ایک بات ہے کہ یہ نوجوان ان لوگوں میں سے تھا جو ہر حال میں خوش رہتے اور بری سے بری صورتحال کو بھی پکنک میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ ہمیں بھی علم تھا اور شاید اسے بھی اندازہ تھا کہ یہ سب...... دل کے خوش رکھنے کو ہے لیکن تھکن، انتظار کی کوفت اور گزرتی شب کے ساتھ بڑھتے تناؤ کے ماحول میں اس کی باتیں تیز مصالحہ والی چاٹ کا کام کر رہی تھیں۔ ویسے وہ خود جنوبی افریقہ کے ایک غیر معروف شہر میں چچا کے ہاں تفریحی دورے پر جا رہا تھا جس کی بیٹی سے اس کی شادی طے پا چکی تھی۔ اسلام آباد والا کاروبار اور آگرہ کا ہندو ملازمت کے سلسلہ میں گھر سے نکلا تھا۔ صبح سب کی فلائٹس اور منزلیں الگ الگ تھیں۔ میں ان سب سے عمر میں بڑا تھا۔ ادھر جب یہ معلوم ہوا کہ میں گورنمنٹ کالج لاہور کا ریٹائرڈ پروفیسر ہوں تو سب کے رویئے میں احترام شامل ہو گیا۔

''سر! آپ ہمارے بزرگ ہیں، آپ ان سے بات کریں۔''

''اوتسی ساڈے چاچے ہو جی۔''

''انکل! پلیز کچھ کیجیے نا۔''

''سالے بھوتنی کے چار کالے اِدھر آ رہے ہیں۔''

تو اجنبی ملک کی نامانوس ایئر پورٹ پر بھیگتی رات میں، میں ان سب کا ترجمان بنا دیا گیا۔ وہ جو بھوتنی کے چار کالے آ رہے تھے، وہ سب سالے نہ تھے بلکہ ان میں دو سالیاں بھی تھیں۔ ایئر لائن کا کاؤنٹر اب خالی ہو چکا تھا۔ کاؤنٹر پر جس سے ہماری بات ہوئی تھی وہ آنے والوں کو بتا رہا تھا کہ ہمیں شب بسری کا ٹھکانا چاہیے۔ ایک لڑکی جو گروپ لیڈر قسم کی تھی اور ہر بات پر ہنستی تھی، بولی کہ بندوبست ہو سکتا ہے لیکن یہ غیر سرکاری طور پر ہو گا، غیر سرکاری کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں انہیں رقم ادا کرنا ہو گی اور وہ بھی ڈالرز میں۔

وہ ہمارے لٹکے منہ دیکھ کر ہنستی ہے اور بتاتی ہے کہ دس ڈالر فی گھنٹہ! حبشی اور حبشنیں خواہ کہیں ہی کے کیوں نہ ہوں، مگر سفید اور مضبوط دانتوں کی وجہ سے ان کی ہنسی بہت اچھی ہوتی ہے۔ لڑکی حبشنوں کے معیار کے مطابق بھرپور تھی، چوڑے کندھے، پھیلے کولہے، بڑی بڑی چھاتیاں اور لشکارا مارتی مسکراہٹ، مگر اس وقت اس کے آبنوسی بدن اور سفید ہنسی کا معاملہ نہ تھا بلکہ رات گزارنے کے لیے جتنے ڈالر مانگے جا رہے تھے، تقریباً اتنا ہی میرا زادِ راہ تھا۔

''یہ سالے رات کو ہمیں قتل کر دیں گے۔'' کراچی والا بولا۔

''میں بھی رات بیٹھ کر گزار لوں گا مگر اتنے ڈالر نہ دوں گا۔''

اسلام آباد اور کراچی والا سامان اٹھا کر چلے گئے۔ اگلا گھنٹہ ہم نے اس کالی دلربا سے بحث اور بھاؤ تاؤ میں گزارا، وہ بھی ہنستی جاتی مگر پٹھے پر ہاتھ نہ رکھنے دیتی (محاورتاً) جتنی انگریزی آتی تھی، اس رات خرچ کر دی اور بالآخر سودا پٹ گیا، مبلغ 10 ڈالر پر۔

اگرچہ وہ ہنس رہی تھی مگر اس رقم پر خوش نہ تھی، بہرحال ہم سب نے اس کی آبنوسی ہتھیلی ڈالروں سے ملائم کی۔ باقی تین خوشی خوشی ڈالر دیکھ رہے تھے۔ یقیناً اپنے حصے کی رقم کا حساب لگا رہے ہوں گے۔

شو! شو!!

بولی ''سامان اٹھا کر چلو، لیکن ایک بات اور ہے کہ صبح سویرے یہ کمرہ خالی کر دینا ہو گا۔'' وہ چاروں آگے آگے، سینہ تانے، فاتحین کی مانند اور ہم تینوں سامان اٹھائے، تھکے ماندے، مفتوحین کی طرح، طول کوریڈور ختم ہونے میں نہ آ رہا تھا۔ میرے دل میں اندیشے ابھر رہے تھے۔ یہ کمبخت نہ جانے کہاں لے جا رہے ہیں، یہ نہ ہو کہ کراچی والے کے بموجب واقعی مار پیٹ کر سامان بھی چھین لیں۔ میں نے لڑکی سے پوچھا۔

''اس کمرے میں غسل خانہ ہے؟''

''کیا؟''

''اس کمرے میں واش روم ہے؟''

''کیا؟''

وہ ان الفاظ کے مفہوم سے ناواقف تھی۔ مارے گئے، میں نے دل میں سوچا۔ پتہ نہیں کیسی جگہ لے جا رہی ہے جہاں باتھ روم کی سہولت بھی نہیں۔ چلتے چلتے میری نگاہ واش روم کے بورڈ پر پڑی تو

وہاں "Choo!" لکھا پایا۔ میں نے شوشو کی آوازیں نکالیں، وہ چاروں اثبات میں ہنس دیتے ہیں۔ میں لڑکی کو بتاتا ہوں کہ ہمارے ہاں جب چھوٹا بچہ پیشاب نہیں کرتا تو ماں شوشو کر کے پیشاب کراتی ہے۔ اس پر وہ بہت خوش ہو کر اور بھی ہنستی ہے۔ ہم بھی ہنسی میں شریک ہو جاتے ہیں۔ یوں ہنسنے سے اعصابی تناؤ میں کچھ کمی آ جاتی ہے۔ کوریڈور ختم ہو جاتا ہے۔ نیچے جانے کے لیے سیڑھیاں اتر رہے ہیں۔ یقیناً آج ان کالوں اور کالیوں نے ہمارا بھوجن بنانا ہے۔ نیچے تاریک راستہ ہے۔ ایئرپورٹ کی چہل پہل اور روشنیاں اوپر رہ گئی ہیں، ماحول کسی جاسوسی فلم جیسا بنتا جا رہا ہے۔

مصیبت کے بستر کے ساتھی

اور پھر اچانک وہ رکتی ہے۔ ٹانگ مار کر دھڑ سے دروازہ کھولتی اور خوشی سے اعلان کرتی ہے

"Here we are"

چھ آنکھیں جائزہ لیتی ہیں۔ یہ کمرہ نہیں بلکہ چھوٹا سا ہال ہے جسے ایئر لائن لاؤنج میں تبدیل کر رہی تھی۔ فرش پر رنگ روغن کے ڈبے اور برش بکھرے تھے، صوفے بے ترتیب، فرش مٹی دھول سے اٹا اور جگہ جگہ رنگوں کی ہولی۔ پینٹ اور وارنش کی تیز بو نتھنوں کو چیرتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں خوشبو کے معاملہ میں بہت حساس ہوں، تیز آواز اور تیز خوشبو (خوشبو یا بدبو کی تخصیص نہیں) سخت ناگوار ہوتی ہے اسی لیے عورت کے کلچرڈ ہونے کا اندازہ اس کی پرفیوم سے لگاتا ہوں۔ جتنی تیز خوشبو اتنی لاؤڈ عورت! دو چار سانسیں ہی لیں کہ نتھنوں میں سوزش سی محسوس ہونے لگی۔ میں جو بے اختیار چھینکا تو اس لیے نہیں کہ لاہور میں میری بیگم کو اچانک میری یاد ستانے لگی تھی۔

سامنے بار تھی مگر بوتلیں بے ترتیب اور گرد آلود، وہاں کوک اور سیون اپ وغیرہ کے ٹین بھی رکھے تھے، وہ ہمیں کوک پینے کی دعوت دیتی ہے، مجھے صرف ٹھنڈے پانی کے گلاس کی ضرورت تھی......

مگر وہ عنقا!

وہ ٹانگ مار کر لمبا صوفہ میرے سامنے کر دیتی ہے۔

''یہاں اس پر سو جاؤ۔'' وہ ہنستی ہے ''اور یاد رکھو صبح سویرے، کام کرنے والوں کے آنے سے پہلے سامان لے کر یہاں سے چلے جانا۔'' مزید ہنستی ہے۔

ہم اس کا بلکہ ان سب کا شکریہ ادا کرتے ہیں، سب ہنستے ہوئے خوشی خوشی رخصت ہوتے ہیں...... باہر جا کر ڈالر تقسیم کرنے کو!

نصف شب بیت چکی تھی!

یہ کوئی باضابطہ کمرہ یا خوابگاہ تو تھی نہیں، نہ پلنگ اور بستر تھے، لہٰذا چند گھنٹوں کے آرام (یا پھر مزید بے آرامی) کی خاطر کپڑے بدلنے کی تک نہ تھی۔۔ میں نے پاسپورٹ، ضروری کاغذات اور کرنسی وغیرہ سب کچھ پینٹ کی جیبوں میں ٹھونس لیا۔ جوتے اتار کر صوفہ کے نیچے چھپا دیئے، مبادا پاکستان کا مشہور نقاد ماریشس میں ننگے پاؤں ''دھول'' کھا جائے۔ میں ٹریول لائٹ کا قائل ہوں چنانچہ صرف ایک ہی بیگ تھا۔ اس کے سٹریپس کو کلائی کے ساتھ باندھ کر صوفہ پر لیٹ گیا۔ یہ لیٹنا اتنا ہی تھا جتنا کہ صوفہ پر لیٹا جا سکتا ہے۔ یاد رہے میرا قد چار نہیں بلکہ چھ فٹ ہے۔ ٹانگ لمبی کی تو باہر جا لٹکی، ہاتھ کا تکیہ بنایا تو قبلہ میر صاحب کے اس مصرع کی بلاغت سمجھ میں آئی:

وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

گھٹنے پیٹ کے ساتھ لگائے تو گیند بننے کا احساس ہوا...... درد کی ٹھوکروں کی زد میں گیند! وہ دونوں بھی میری مانند پھولوں کی سیج پر نہ سو رہے تھے۔

لائٹ آف کر دی!

وہم، وسوسے، اندیشے چمگادڑوں کی مانند لاؤنج میں گھس آئے...... کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ویسا نہ ہو جائے۔

''سو گئے ہو؟'' میں نے آواز دی۔

''نہیں۔'' آگرہ کے ہندو نے جواب دیا۔

''یوں کریں، دروازہ اچھی طرح سے بند کر کے اس کے آگے ایک میز لگا دیں۔''

''وہ کیوں؟''

''کھلے دروازے سے تو ہر شخص اندر آ سکتا ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔''

''یوں جب دروازہ دھکیلے گا تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔''

وہ اٹھ کر دروازہ بند کرتا اور پھر اس کے آگے میز لگا دیتا ہے۔ ڈر ہندو مسلم اتحاد کا باعث بن رہا تھا۔

لاہوری بادشاہ مگن تھا۔

ایک تھکن خواب آور ہوتی ہے، ایک تھکن خواب رُبا۔ اٹھارہ بیس گھنٹے کی بے آرامی، تناؤ، سفر کی تکان، اجنبی ماحول کے باعث نیند نہ آ رہی تھی۔ ادھر صوفے پر اِدھر اُدھر کروٹیں بھی نہ بدلی جا سکتی تھیں۔ بہر حال نیند سولی پہ آئے یا نہ آئے لیکن نیروبی میں بھی آ جاتی ہے، ابھی میں نیند کے گہرے

پانیوں میں غوطہ زن نہ ہوا تھا سطح ہی پر تھا کہ اندھیرے کمرے میں ہنسی کی آواز گونجی، پھر دبی دبی زنانہ سرگوشیاں، پھر ہنسی، پھر کھسر پھسر اور پھر ٹیلی فون کی گھنٹی کی کرخت آواز!

میں اچھل کر بیٹھ گیا۔

کمرہ روشن ہوا تو یہ وہی دونوں لڑکیاں تھیں۔ مجھ سے ہنس کر پوچھا

''ابھی سوئے نہیں؟''

دل میں کہا ''خانہ خراب ہو! کیسے سو سکتا ہوں۔'' مسکرا کر کہا ''بس! سونے کو ہوں۔''

وہ دونوں ادھر ادھر آتیاں جاتیاں/ پھریں اپنے جوبن کو دکھلاتیاں، لاؤنج میں کچھ کرتی پھر رہی تھیں۔ میں دوبارہ گیند بن جاتا ہوں، اور بالآخر نیند!

صبح اٹھا تو جتنا کہ صوفہ میں سو کر تازہ دم ہوا جا سکتا تھا، میں بھی اتنا ہی تازہ دم تھا۔ آنکھیں کھولیں تو وہ سامنے تھیں، بال بکھرے سے، قمیص سکرٹ سے باہر لٹک رہی اور جوتوں کے بغیر پاؤں، ساتھ میں دوسری لڑکی بھی ایسے ہی عالم میں، تیری صبح کہہ رہی ہے تیری رات کا فسانہ...... کی تصویر بنی۔

میں نے حیرت سے پوچھا۔

''تم یہاں، اس وقت؟''

وہ دونوں ہنستی ہیں۔ ''ہم تو یہیں سوئی تھیں۔''

''یہاں اس کمرہ میں؟''

''ہاں! ان صوفوں پر۔'' انہوں نے دو صوفے دکھائے۔

دونوں ساتھی بھی اٹھ بیٹھے تھے اور ٹکر ٹکر دیکھ رہے تھے۔ اب میں ساری بات سمجھ گیا۔ وہ دونوں رات کی ڈیوٹی کرتی تھیں اور سونے کے لیے یہاں آ جاتی تھیں ایسے میں ہم جیسے بھولے بھٹکے پھنس گئے، ان سے ڈالر بھی جھاڑ لیے۔

وہ اب بہت مہربان تھی، کہنے لگی ''میں کافی بنا رہی ہوں، اگر چاہو تو کافی مل سکتی ہے۔''

میں دن کے اجالے میں پہلی مرتبہ انہیں غور سے دیکھتا ہوں۔ وہ بیس بائیس برس سے زیادہ کی نہ ہوں گی۔ ایک کے بال سیاہ، دوسری کے مہندی ڈائی کیے ہوئے۔ صبح کے اجالے میں، میں خود کو مرد سمجھ رہا تھا اور ان کی کافی کا کلر دیکھ رہا تھا۔

میرا ایک بے تکلف دوست ساری رام کہانی سن کر غصے سے بولا ''یار! تم تو نرے نقاد ہی ہو۔''

''کیوں؟''

''وہ رات بھر تمہارے ساتھ سوتی رہیں اور تم......؟''

''پہلی بات تو یہ کہ وہ میرے ساتھ نہ سوئی تھیں۔''

''اور دوسری بات؟''

''وہ حبشنیں تھیں۔''

''یہی تو بات ہے، وہ حبشنیں تھیں......''

میں ہنس کر کہتا ہوں ''یار! میں تو مہمان تھا۔ میزبان تو وہ تھیں، لہٰذا ان کا فرض بنتا تھا کہ......''

بہرحال میرے دوست نے آج تک میری خطا کو معاف نہیں کیا۔ شیکسپیئر نے کہا تھا:

"Misery makes strange bed fellos."

نیروبی ایئر پورٹ کی رات نے اس مصرع کے عملی معنی سمجھائے۔

آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھارا!!

اگلی صبح ہم پانچوں پھر ایئر لائن کے کاؤنٹر کے سامنے براجمان تھے۔ ان دونوں نے بتایا کہ ہمیں کسی نے یہ بتا دیا کہ کینیا ایئر لائن کا لاؤنج دوسری منزل پر ہے چنانچہ ہم نے وہاں آرام سے رات گزار لی۔ میں نے اس بات کو پلے باندھا اور واپسی پر کینیا ایئر لائن ہی کے لاؤنج میں بسرام کیا، ساتھ شاندار ''شوشو'' بھی تھا جس میں ہاتھ منہ دھونے کے لیے ایک گلاس میں رنگین لیکوڈ سوپ بھی تھا۔

چاروں نوجوان اپنے اپنے حساب سے تازہ دم تھے اور خوب گپ بازی ہوتی رہی، سب خوش تھے، قہقہے لگا رہے تھے حتیٰ کہ کراچی والا بھی خوف کو جھٹک چکا تھا۔ باری باری سب گلے مل کر رخصت ہوئے۔ اپنی اپنی فلائٹس کے حساب سے، ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے مگر نیروبی کی ایک رات نے ہمیں بے تکلف بنا دیا تھا۔

میں تنہا رہ گیا!

مجھے اکیلا بیٹھے دیکھنے والے کو شاید میرا چہرہ بوریت اور بے زاری کی مصوری نظر آئے لیکن ایسے میں میرا ذہن متجسس اور آنکھیں محض دیکھنے سے بڑھ کر ایکس ریز کا کام کر رہی ہوتی ہیں۔ بیشتر افسانوی مواد ایسے ہی مشاہدات سے حاصل ہوا ہے۔ اس بین الاقوامی ایئر پورٹ پر مسافروں کی بہت ورائٹی نظر آئی۔ اگرچہ سیاہ فام سب سے زیادہ تھے لیکن ان کے ساتھ ساتھ یورپین، ہندو، سکھ اور عربی وغیرہ سب پہچانے جا رہے تھے۔ دھوتی اور کرتے میں وسیع الجثہ داڑھی والا فیلِ بے زنجیر کی مانند جھومتا چلا آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے تین عدد عورتیں سفید برقعے میں ملبوس اور ان کے پیچھے ہر سائز کے درجن بھر بچے۔

کچھ عرصے تک افریقن عورتیں دیکھتے رہنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ استثنائی مثالوں سے قطع نظر، جسمانی لحاظ سے ان میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ چوڑے شانے، پھیلے کولہے، موٹی پنڈلیاں، بھاری ڈیل، خاصی بڑی چھاتیاں، موٹے ہونٹ، چوڑے اور بے حد سفید دانت اور ریڑھ کی ہڈی اختتام پر قدرے باہر کو نکلی جس کی وجہ سے کمر اندر کو خم کھاتی نظر آتی یوں سرین مزید باہر نکل آتے۔ سکرٹ اور بلاؤز میں بیک وقت خربوزے اور تربوز سنبھالے، یہ عورتیں سینہ تانے (محاورتاً نہیں) چلتیں۔ ایسی موٹی تازی بلکہ مشٹنڈی عورتوں کو حبشیوں جیسے مرد ہی قابو میں رکھ سکتے ہیں...... نہ بھائی ہماری تو ہمت نہیں!

عورتیں دیکھنی چھوڑ کے میں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اٹھ کر اپنی فلائٹ کو کمپیوٹر سکرین پر چیک کر آتا۔ میرے سامنے کاؤنٹر پر برٹش ایئرویز کی ماریشس فلائٹ کے لیے مسافر قطاریں بنائے کھڑے تھے۔ میں ایئر ماریشس کا مسافر تھا جسے برٹش ایئرویز نے لے جانا تھا مگر اعلان نہ ہو رہا تھا۔ بارہ بج چکے تھے، کاؤنٹر خالی ہو چکا تھا کہ سوچا چلو ان ہی سے معلومات حاصل کرتے ہیں۔ کالی لڑکی نے ٹکٹ لے کر کمپیوٹر پر انگلیاں چلائیں اور بولی:

"تم نے تو اسی جہاز سے جانا ہے۔"

یہ سن کر مجھے تو آگ لگ گئی۔ میں نے کہا:

"تم عجیب لوگ ہو۔ میں صبح سے یہاں بیٹھا ہوں اور ایئر لائن نے یہ اعلان نہ کیا کہ ایئر ماریشس کے مسافر بھی اسی فلائٹ سے جائیں گے۔"

جہاز روانہ ہونے کو تھا، لڑکی نے مجھے جواب دینے کی بجائے میرا ہاتھ پکڑا اور تقریباً بھاگتی اور ساتھ مجھے بھی گھسیٹتی دوسرے کاؤنٹر پر گئی۔ وہاں میرا پاسپورٹ لے کر کمپیوٹر پر انگلیاں دوڑائیں، پھر مجھے لے کر پہلے کاؤنٹر کی جانب بھاگی۔ کمپیوٹر میں سے بورڈنگ کارڈ نکالا۔ واکی ٹاکی پر آگے کسی سے بات کی کہ اس نام کا مسافر آ رہا ہے، اسے روکا نہ جائے...... دس منٹ کی یہ کارروائی بلڈ پریشر بڑھانے کو کافی تھی۔ میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں "Welcome! but run!"

خاصی دیر کے بعد جب میں پرسکون ہوا تو سوچ کر لرز گیا کہ اگر یہ فلائٹ مس ہو جاتی تو میرا کیا بنتا؟ میری واپسی آٹھ دن بعد تھی۔ میں نیروبی ایئرپورٹ پر آٹھ دن کیسے گزارتا؟ واپسی سے یاد آیا جب ماریشس کی سیر کے بعد واپس نیروبی ایئرپورٹ پر آیا تو دونوں حبشی کاؤنٹر پر تھے، انہوں نے مجھے پہچان لیا۔ مل کر بہت خوش ہوئے۔ ماریشس کا پوچھتے رہے۔ ان میں سے ایک زیادہ شوخ تھا، اس نے اٹھلا کر پوچھا:

"میرے لیے ماریشس سے کیا تحفہ لائے۔" میں نے دل میں کہا "چل اوئے بھیڑی

بوتھی......" اسے کہا "ماریشس میں کوئی خاص چیز نہ ملی۔" بولا "مجھے یہیں سے کچھ لے دو۔" جواب دیا "ڈالر ختم ہو چکے ہیں۔" پھر اسی کے انداز میں کہا "میں تمہارا مہمان ہوں، تمہیں چاہیے کہ مجھے کافی شافی پلاؤ۔" اس نے اس بات کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔

"ہائے۔"

سامنے سنہری بالوں والی لڑکی تھی۔ اس نے پوچھا "کب آئے اور ماریشس کیسا رہا؟" میں خوش ہو کر اسے بتاتا ہوں اور ساتھ ہی پوچھا "تم نے تو مجھے پہچان لیا ہے۔"

"کیسے نہ پہچانتی...... تم نے رات جو گزاری تھی۔"

پیارے قارئین! کیا سفرنامہ میں کالیاں بھی ڈالی جا سکتی ہیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ کالیاں اپنے طور پر سوچتی ہوں کہ یہ پاکستانی بھی کہیں ڈالا جا سکتا ہے؟ چولہے میں!

برٹش ایئرویز کی فلائٹ ویسی ہی تھی جیسی یورپین ایئر لائنز ہوتی ہیں، پہلے پرفیوم کی اور پھر شرابوں کی ٹرالیاں اور پھر کھانے کی۔ میرے ساتھ ادھیڑ عمر کے میاں بیوی بیٹھے تھے۔ گفتگو شروع ہوئی تو خاوند نے بتایا کہ ہم تعطیلات منانے ماریشس جا رہے ہیں۔ انہوں نے ڈٹ کر پی (ایئر لائنز پر کھانے کے ساتھ شراب مفت ملتی ہے) اور ٹرے بھر کر کھانا کھایا، میں نے محض مچھلی اور کوک پر گزارا کیا۔

نیچے بحر ہند اور پینتیس ہزار فٹ کی بلندی پر ہم بوئنگ 747 میں محو پرواز اور پھر چار گھنٹے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ طیارہ لینڈنگ کے لیے نیچے ہو رہا ہے۔ ہم نیچے جھانکتے ہیں۔ بادلوں کی چھٹی چادر میں سے سمندر کا پانی قریب ہوتا اور رنگ بدلتا نظر آتا ہے۔ ساحل سے موجیں ٹکرا رہی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی سرسبز پہاڑیاں۔ ہم تینوں کی زبان سے بیک وقت ایک ہی لفظ نکلتا ہے "بیوٹی فل۔"

بادل ہٹ چکے ہیں، طیارہ اور نیچے ہو رہا ہے۔ سبز کھیت، پام کے پیڑ، میرے منہ سے بے اختیار نکلتا ہے "Its like an opening shot of a beautiful film."

گزشتہ تیس چالیس گھنٹوں کی تھکن، کلفت، بے آرامی اور تناؤ سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ میں خود کو اعصابی لحاظ سے پرسکون محسوس کرتا ہوں۔ نیچے کے بتدریج واضح ہوتے خوبصورت مناظر آنکھوں کو تراوٹ پہنچا رہے تھے۔ پتہ نہیں پہلی نگاہ میں کسی سے محبت ہو سکتی ہے یا نہیں لیکن اگر کسی جگہ سے پہلی نظر میں محبت ممکن ہے تو بلاشبہ میں ماریشس کی محبت میں گرفتار ہو چکا تھا۔

طیارہ لینڈ کرتا ہے! ماریشس کی سرسبز زمین پر پہلا قدم رکھتے ہی خود کو تازہ دم اور خوش محسوس کرتا ہوں، طویل سفر کے بخیر انجام کی وجہ سے نہیں بلکہ خوش منظر ماریشس کی وجہ سے!

⌘⌘⌘⌘⌘⌘⌘⌘⌘

عجب سیر تھی!

میں نے زندگی علامہ اقبال کے مردِ مومن کے مقاصدِ جلیل کے برعکس مقاصدِ قلیل سے بسر کی، لہٰذا مطمئن اور خوش رہا۔ بہترین آرزو وہ ہے جس کی آرزو نہ کی گئی ہو۔ عمر بھر میرا یہی طرزِ عمل رہا لیکن سعیٔ بسیار کے باوجود بھی ایک آرزو سے دل کو خالی نہ کر پایا۔ افق کے پار جانے کی خواہش، فلمی انداز میں نہیں بلکہ سیاح بن کر دور دیس کی سیر جو پروفیسری کی تنخواہ میں ممکن نہیں۔ شاعر نہیں کہ گرمیوں میں سرد مقامات کو مقامات آہ و فغاں قرار دے دوں، صحافی نہیں کہ پسندیدہ حکمران مجھے غیر ملکی دورہ پر ساتھ لے جائے، کسی ایکٹریس کا چمچہ نہیں کہ وہ مجھے اپنے ''خوشیا'' کے طور پر غیر ملکی شوٹنگ میں ساتھ لے جائے۔ جائیں تو جائیں کہاں؟

اور اب میں چار جہاز تبدیل کر کے چھتیس گھنٹے کے سفر کے بعد ماریشس کے خوش منظر جزیرہ میں تھا۔

گر فردوس بر روئے زمین است

ماریشس کو قدرت کا عجوبہ ہی سمجھنا چاہیے۔ دنیا بھر کے جغرافیہ سے منقطع یہ جزیرہ اور اس کے پڑوسی ''سیشلز'' نے بھی غالباً صدیوں پہلے آتش فشانی کے عمل سے آبی نقاب اتار کر دنیا والوں کو مکھڑا دکھایا ہوگا۔ سمندر میں اس طرح اچانک جزیرہ کا ظہور انوکھی بات نہیں۔ پچیس تیس برس پہلے جاپان کے قریب ایک جزیرہ نمودار ہوا تھا۔ 1990ء میں گوادر کے قریب اڑھائی میل کا مُنّا سا جزیرہ ابھر آیا تھا۔ ماریشس کو بھی ڈیڑھ بالشت کا جزیرہ سمجھنا چاہیے کہ محض 75x42 کلومیٹر ہے اور آبادی لاہور شہر جتنی بھی نہیں یعنی کل 12 لاکھ افراد۔

افریقہ میں حکومت کی وجہ سے چھٹی صدی میں عربوں نے اسے دریافت کیا اور یہ بحری

تجارت میں کارآمد ثابت ہوا۔ سولہویں صدی میں ولندیزی، اٹھارہویں صدی تک فرانسیسی اور انیسویں صدی میں انگریز اس پر قابض رہے۔ 12 اکتوبر 1968ء کو آزاد ہوا۔ اب یہاں جمہوری طرزِ حکومت ہے۔

ماریشس گنے کے لیے مشہور ہے۔ یہاں کی اقتصادیات کا انحصار صرف گنے پر ہے اور دیکھا جائے تو گنا ہی اس کی آبادکاری کا سبب بنا۔ یورپین گنے کے کھیتوں میں کام کرنے کے لیے افریقہ اور ہندوستان سے مزدور لاتے تھے۔ 2 نومبر 1834ء کو انگریز ہندوستان سے مزدوروں کی پہلی کھیپ لائے۔ ہندوستان سے بالعموم اڑیسہ، مدراس، آسام بنگال وغیرہ کے صوبوں سے، کچھ چینی بھی لائے گئے۔ مل جل کر رہنے سے جو سماجی روابط ہوئے، وہ شادی بیاہ پر منتج ہوئے۔ یوں ایک ملی جلی قوم وجود میں آ گئی۔ اگرچہ یہ حبشی نہیں مگر سیاہ فام ہیں لیکن کون جانے ان کی رگوں میں کتنی نسلوں کے خون کا آمیزہ ہے۔ آبادی میں ہندو 51 اور مسلمان 17 فیصد، باقی عیسائی، چینی اور افریقی۔

کیونکہ یہاں فرانسیسیوں کا تسلط زیادہ عرصہ رہا اس لیے یہاں فرانسیسی کلچر ملتا ہے۔ سرکاری زبان فرانسیسی ہے۔ علاقوں، سڑکوں، گلیوں، دکانوں اور ہوٹلوں کے نام فرانسیسی۔ انگریزی ثانوی حیثیت کی حامل ہے اور اس کے بعد اردو، پھر ہندی، بنگلہ، تامل، بھوج پوری وغیرہ۔ جزیرے کا فرانسیسی نام "ILe Maurice" ہے۔

اردو زبان کے آغاز کے ضمن میں بالعموم یہ نظریہ پیش کیا جاتا ہے کہ اکبر اعظم کے عہد میں جب ہندوستان کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والی مختلف نسلوں کے لوگ مغل پرچم تلے جمع ہو گئے تو طرح طرح کی زبانوں کے امتزاج سے ایک کام چلاؤ قسم کی بولی نے جنم لیا، یہی اردو تھی۔ میں نے جس نظریئے کو لسانیات کی کتابوں میں پڑھا تھا، ماریشس میں میں نے اس کا عملی نمونہ دیکھا کہ فرانسیسی، انگریزی، اردو، تامل، تیلگو، مراٹھی، بنگلہ اور بھوج پوری وغیرہ کے الفاظ پر مشتمل ایک زبان معرض وجود میں آ گئی جسے ''کریاؤلی'' کہتے ہیں۔ آپ اسے کھچڑی زبان کہہ لیں یا زبانوں کی حلیم، بہرحال صحیح معنوں میں اردو کے آغاز کی مانند تیار ہوئی اور اردو ہی کی مانند صحیح معنوں میں رابطے کی زبان ہے۔

اس بالشت بھر جزیرے میں چاروں طرف ہریالی کا راج ہے۔ ذائقے میں آلو سے مشابہہ سبزی ''شوشو'' کے بارے میں مجھے بتایا گیا کہ یہ اور کہیں نہیں ہوتی۔ اسی طرح بعض نایاب پھول اور کیکٹس بھی باافراط ہیں بلکہ برآمد کیے جاتے ہیں۔ کٹھل بھی میں نے پہلی مرتبہ یہیں دیکھا۔ قدیم زمانے میں مرغابی سے مشابہہ پرندہ ملتا تھا ''ڈوڈو'' مگر یورپین نے اسے اس رفتار سے کھایا کہ اس کی نسل معدوم کر دی۔ ''ڈوڈو'' نے اب ایک طرح سے ماریشس کی علامت کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

اس کے ڈیکوریشن پیسز بنتے ہیں۔ بچوں کی ٹی شرٹس پر یہ نظر آتا ہے۔ گھروں میں تصاویر اور کیلنڈر پر غرضیکہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے قوم مرحوم پرندہ کو بازار میں زندہ کیے ہو۔

مختلف قوموں، مذاہب اور ثقافتوں کی پرامن بقائے باہمی کے لحاظ سے ماریشس مثالی خطہ ہے۔ نسلی، لسانی اور مذہبی تنازعات صفر، جرائم برائے نام، شرح خواندگی 95 فیصد، ہر سطح تک تعلیم مفت۔ اردو، عربی، فارسی اور اسلامیات کی اعلیٰ تعلیم کے لیے بالعموم بھارت بلکہ زیادہ تر علی گڑھ کا رخ کرتے ہیں جبکہ سائنس، میڈیکل اور انجینئرنگ کے لیے فرانس اور امریکہ جاتے ہیں۔

کیونکہ ہندوؤں کو اکثریت حاصل ہے اس لیے الیکشن کے نتیجے میں ہمیشہ ہندو ہی وزیراعظم بنتا ہے لیکن اقتدار کو متوازن کرنے کے لیے صدر مسلمان ہوتا ہے۔ اس وقت کے وزیراعظم نوین چندر رام غلام جبکہ صدر قاسم حاتم ہیں۔ رام غلام بھی قابل غور ہے۔ غلام ہندی لفظ نہیں، ہندی میں اس کے مفہوم کے لیے داس کا لفظ ملتا ہے، غلام عربی لفظ ہے یہ بھی شاید ''کریاؤلی'' کی بدولت ہو۔

میں تقریباً تمام جزیرہ گھوما، کہیں بھی گندگی کے ٹیلے اور کوڑے کے پہاڑ نظر نہ آئے جبکہ ہمارے شہری لینڈ سکیپ کا یہ دائمی حصہ ہیں۔ آلودگی سے پاک ہوا جس میں سمندر کی جانب سے آنے والے جھونکے ہلکا سا نمک ملا دیتے ہیں اور ان سب پر مستزاد یہ کہ بھکاری دیکھنے کو نہ ملے حتیٰ کہ مسجدوں کے باہر بھی نہیں۔

یقیناً قدرت اس جزیرے پر مہربان ہے کہ عجوبے دیکھنے کو ملتے ہیں، ایک ایسا مقام ہے جہاں سات رنگ کی مٹی ملتی ہے۔ مٹی مٹیالی ہوتی ہے مگر ہمارے ہاں، اس مقام پر تو گویا اندردھنش رکھ کر بھول گیا ہو۔ یہ سات رنگ کی مٹی بوتلوں اور ٹیوبز میں بھر کر سیاحوں کے لیے بازار میں فروخت ہوتی ہے۔ Prample Mousses میں ایسا تالاب ہے جہاں کنول کے پتے فٹ ڈیڑھ فٹ قطر کے گویا پانی پر تھال دھرے ہوں۔ افوہ! کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا؟

اور اس خوش منظر جزیرہ پر خیرمقدمی مسکراہٹوں کے ہار لیے بشیر حسین طالب اور فاروق بوچا میرے منتظر تھے۔

علی گڑھ کے تعلیم یافتہ حضرات اور صاحبان علم نے نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کے نام سے ایک ادارہ قائم کر رکھا ہے۔ یہ سرسید احمد خان کی صدسالہ برسی منا رہے تھے اور اس سلسلے میں سرسید سیمینار بھی منعقد ہونا تھا جس کے لیے پاکستان سے میں اور بھارت سے علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر محمود الرحمٰن اور پروفیسر شمس تہرانی مدعو تھے۔

نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کے صدر بشیر حسین طالب، سیکرٹری اسلام بھوگن اور خزانچی فاروق

بوچا ہیں۔

ہماری کار سرسبز کھیتوں میں سے صاف ستھری نہر جیسی سڑک پر گویا تیرتی جا رہی تھی۔ کبھی سمندر نظر آ جاتا اور کبھی درختوں یا جھاڑیوں میں چھپ جاتا۔ گنے کی فصل کٹ چکی تھی اور کھیت خالی تھے مگر پھر بھی سبز!

بشیر حسین طالب اپنے ادارے کے اغراض و مقاصد بتا رہے تھے۔ سرسید احمد خاں سیمینار کی تفصیلات سے آگاہ کر رہے تھے، پھر بولے:

''ویسے تو آپ بخوشی میرے گھر رہ سکتے تھے، آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوتی لیکن ہم نے ''گراں بے'' (Grand Bay) کے ایک بہت خوبصورت ہوٹل میں آپ کے لیے قیام کا بندوبست کیا ہے۔ اس بہانے آپ ماریشس کی خوب سیر کر لیں گے۔'' وہ بتا رہے تھے ''یہ گراں بے'' ماریشس کا اختتام سمجھیں۔''

وہ میرے بارے میں اور سفر کے بارے میں استفسارات کر رہے ہیں۔ مانگ جیسی سیدھی سڑک پر کار فراٹے بھرتی جا رہی ہے۔ پھر طالب صاحب بولے:

''مجھے اندازہ ہے کہ آپ اتنے لمبے سفر کے بعد تھک چکے ہوں گے لیکن اگر آپ پسند کریں تو میرے گھر میں رک کر چائے پی لیں، میری بیوی اور بیٹی آپ سے ملنے کی بے حد مشتاق ہیں۔''

مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

خوبصورتی سے بل کھاتا پہاڑی راستہ، بچوں کی کہانیوں کی کتابوں میں بنے خوبصورت مکانات، پھول اور بیلیں اور پھر طالب صاحب کا خوش ذوقی سے بنا بنگلہ۔ بیگم طالب گریس فل خاتون بہت تپاک سے ملیں۔ ان کی صاحبزادی کالج کی طالبہ تھی اور پھر ایسی ہی باتیں جو ایسے موقعوں پر ہوتی ہیں۔ وہ مجھ سے پاکستان کے بارے میں اور میں ان سے ماریشس کے بارے میں استفسارات کر رہا تھا۔ طالب صاحب ہنس کر بولے:

''ڈاکٹر صاحب! یہ آپ کو تمام معلومات دے دیں گی، یہ جغرافیہ ہی پڑھاتی ہیں۔''

چالیس گھنٹے بعد گھر کی اور ڈھنگ کی چائے ملی تھی، لہٰذا خوش ہو کر پی۔ کمال ہے! میں اب ہر نوع کی تھکن فراموش کر چکا تھا۔ ''گراں بے''، یعنی خلیج غیرملکی سیاحوں کے ہوٹلوں، موٹلوں، قیام گاہوں اور شاپنگ سنٹرز پر مشتمل، اس خوبصورت ساحلی علاقے میں ہر طرف یورپین سیاحوں کی ٹولیاں نظر آتی تھیں، غالباً میں ہی واحد پاکستانی اور ایشیائی باشندہ تھا۔

فرانسیسی نام Ventura والا ہوٹل کشادہ اور پام کے خوبصورت درختوں سے آراستہ، نیلے

پانی والے تالاب سے مرصع اور طرح طرح کے پھولوں سے خوش رنگ، میرا کمرہ تالاب کے عین سامنے تھا جس کا شیشے کا دروازہ اس وقت فلمی مناظر دکھاتا جب سامنے جوانیاں جل میں جوالا جگا رہی ہوتیں۔ انگریزی فلموں میں ڈیڑھ فٹ لمبی جو فرانسیسی ڈبل روٹی دیکھی تھی، یہیں میں نے ناشتہ میں پہلی بار کھائی۔

اجنبی شناسا!

جب طالب صاحب اور فاروق صاحب مجھے لے کر ہوٹل میں پہنچے تو دو اور صاحبان کو اپنا منتظر پایا۔ یہ تھے فاروق رجل اور خالق بوچا (فاروق بوچا کے بھائی) مجھے اس وقت اندازہ نہ تھا کہ یہ دونوں میرے گارڈین اینجل ثابت ہوں گے۔ ایک ہفتے کے قیام میں ان کے خلوص اور محبت نے دل موہ لیا۔ انہوں نے صحیح معنوں میں میری دیکھ بھال کی اور پیکر اخلاص ثابت ہوئے۔

منی اسکرٹ اور جیکٹ میں ملبوس جس سانولی نے مسکرا کر ہمارا استقبال کیا، اس کے چہرہ پر چھائیاں بھی تھیں، گویا نمک مزید تیز کر رکھا تھا۔ اس نے تیز رفتاری سے اور غالباً رٹی ہوئی انگریزی میں قیام وطعام کے بارے میں ہدایات سنائیں۔ میرے ہاتھ پر کمرہ نمبر 12 کی چابی رکھی اور مسکرا کر بولی

"Have a pleasant stay."

ہم کمرہ میں آکر بیٹھے ہی تھے کہ صابر گوڈر اپنی بیگم مریم کے ساتھ ملنے کو چلے آئے۔ مریم صاحبہ کسی فرانسیسی پرچے کے لیے کام کرتی تھیں اور میرا انٹرویو لینا چاہتی تھیں مگر الٹا میں نے ان کا انٹرویو لے ڈالا۔ میں نے پوچھا "ان کالے اور سانولوں میں تمہارا رنگ اتنا سفید کیوں ہے؟"

بولیں "میرے پردادا افغانستان سے آئے تھے۔"

یہ میاں بیوی بھی بہت اچھے ثابت ہوئے اور ان سے خوب گپ شپ رہی۔

رات گئے محفل برخواست ہوئی تو فاروق اور خالق صاحب بولے

"اگر آپ بہت تھکے ہوئے نہیں تو رات کا ماریشس بھی دیکھ لیں۔"

"ضرور، مگر پہلے میں نہا دھو کر کپڑے بدل لوں۔"

نہا کر اپنا عوامی سوٹ پہنا اور پھر ہم روشنیوں سے جگمگاتے ساحل پر گھومتے رہے۔ میں ان سے ماریشس کے بارے میں اور وہ مجھ سے پاکستان کے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہے۔

یورپین سال بھر کسی غلام کی مانند محنت کرتا ہے اور پھر بیوی بچوں یا گرل فرینڈ کے ساتھ حسب استطاعت دو ہفتے کا تفریحی پروگرام بناتا ہے، لہٰذا ان ایام سے وہ پوری طرح سے حظ کشید کرتا

ہے۔ اس کی تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں حظ کیسے کشید کیا جاتا ہے۔ ساحل کی تیز رنگین روشنیوں سے پانی میں رنگوں کی جلترنگ تھی۔ ہاتھوں میں بیئر کین پکڑے نوجوانوں کی ٹولیاں قہقہے لگاتی جا رہی تھیں۔ ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے جوڑے محوِ خرام، محوِ کلام یا پھر محو محو!

خوش وقتی کا سماں تھا۔ ایسے میں کسی کو محو یاس ہونے کی اجازت نہ تھی۔

شکر کے بعد ماریشس کی دوسری بڑی صنعت ٹورازم ہے۔ یہ صاف ستھرا، جرائم سے پاک، مذہبی کشیدگی سے آزاد، پرامن خطہ واقعی دور دیس سے آنے والے سیاحوں کو ان کے پیسے وصول کرا دیتا ہوگا اور اسی سے اس کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے ہاں سیاح کیوں نہیں آتے اور جو آتے ہیں ان میں سے بیشتر ناخوش کیوں جاتے ہیں۔

مہرباں کیسے کیسے......!

فاروق رجل بولے "چلیں کہیں کھانا کھاتے ہیں۔"

انہوں نے کار کی رفتار دھیمی کر دی اور مختلف ہوٹلوں کے سائن بورڈز پڑھنے شروع کیے اور پھر "تاج محل" پر کار روک لی۔

ہندی پٹکے باندھے دو ہندوستانیوں نے کورنش بجا لانے والے انداز میں دروازہ کھولا۔

ڈائننگ روم چھوٹا لیکن خوش ذوقی سے ہندوستانی ماحول پیدا کیا گیا تھا۔ ہم ابھی پوری طرح سے بیٹھے بھی نہ تھے کہ ہوٹل کی مالکہ آگئی اور آتے ہی مجھ سے مخاطب ہو کر پرجوش لہجے میں پوچھا "آپ پاکستان سے آئے ہیں؟"

پیشتر اس کے کہ میں جواب دیتا، پھر بولی "آپ لاہور سے آئے ہیں بلکہ آپ کو لاہور ہی کا ہونا چاہیے۔"

میں ایک نظر اس کے چہرہ پر ڈالتا ہوں اور جو دیکھتا ہوں، وہ کافی سے زیادہ ہے۔ بوٹا سا قد، کھلتی رنگت، روشن آنکھیں، کتابی چہرہ، دیئے کی لو کی مانند چمکتے ماتھے پر بندیا۔ وہ بے حد خوش نظر آ رہی تھی۔

"جی! بس لاہور ہی سے آیا ہوں مگر آپ نے کیسے اندازہ لگایا؟"

"یہ شلوار قمیص لاہور والے ہی پہنتے ہیں۔ یہ تو آپ لوگوں کی پہچان ہے۔" وہ اسی پرجوش لہجے میں بولی "دراصل میرا لاہور آنا جانا رہتا ہے۔ مجھے لاہور بہت پسند ہے۔ اگر آپ میرا گھر دیکھیں تو وہاں تمام ڈیکوریشن کی چیزیں پاکستان کی ہیں۔" اس نے آواز دے کر اپنے شوہر کو بلایا، ہمارا

تعارف کرایا، پھر پوچھا۔

''اس علاقے میں آپ کا آنا کیسے؟''

میں اپنے بارے میں مختصراً بتاتا ہوں اور یہ کہ سرسید احمد خان سیمینار میں آنا ہوا ہے۔

ہم پانچوں کھڑے بے تکلف دوستوں کی مانند باتیں کر رہے تھے، پھر بولی ''کیا لینا پسند کریں گے؟''

میں رات کو اول تو کھانا کھاتا نہیں، اگر کھاتا ہوں تو کچھ ہلکا پھلکا کھا لیتا ہوں۔ فاروق اور خالق صاحب نے بریانی وغیرہ کا آرڈر دیا۔ میں نے ابلے چاولوں کے ساتھ قیمہ طلب کیا۔ گزشتہ دو دن سے ڈھنگ کا کھانا نہ کھایا تھا، لہٰذا چٹ پٹے قیمہ پر پودینے کی چٹنی ڈال کر اسے مزید تیز کیا تو زبان نے گمشدہ ذائقے کی بازیافت کی۔ ان دونوں نے میرا قیمہ لیا مگر بولے ''بہت تیز مصالحہ ہے۔''

وہ پھر آ گئی۔ ہوٹل کی اچھی مالکہ کی مانند اس مرتبہ وہ کھانے کی داد طلب کرنے آئی تھی۔ میں نے خوب تعریف کی مگر فاروق صاحب بولے ''اس میں مصالحہ بہت تیز ہے۔''

ہنس کر بولی ''میں نے خود تیار کیا ہے۔ مجھے معلوم ہے لاہور والے تیز مصالحے پسند کرتے ہیں، اسی لیے میں نے مصالحہ اور تیز کر دیا۔''

''بہت اچھا کیا۔ میں نے تو اس میں بھی پودینے کی چٹنی شامل کر کے اسے اور تیز کر لیا تھا۔''

وہ ہمارے ساتھ بیٹھ گئی اور باتیں کرتی رہی، اس نے بتایا کہ پہلے وہ لوگ جنوبی افریقہ میں تھے، پھر یہاں آ کر یہ ہوٹل خریدا، کئی لاکھ میں، صرف ایک مہینہ پہلے!

''مجھے قیمہ کھلانے کے لیے!''

وہ خوش دلی سے قہقہہ لگاتی ہے۔

تین چار دن بعد پھر رات کے کھانے کا پروگرام بنا تو ہم اور کسی ہوٹل میں جا ہی نہ سکتے تھے، چنانچہ تاج محل کا رخ کیا۔ آج وہ بے حد دیدہ زیب تھی کہ دیدہ زیب ساڑھی میں تھی۔ مجھے دیکھا تو خوشی سے لپکی اور ناراضگی کے لہجے میں بولی

''آج آپ پینٹ کوٹ میں کیوں ہیں؟ قمیص شلوار کیوں نہیں پہنی؟ وہ تو آپ کو بہت اچھی لگتی ہے۔''

میں نے کہا ''یہ بات مجھے لکھ دو تو میں ابھی ہوٹل میں جا کر کپڑے بدل لیتا ہوں۔''

اس پر سب نے قہقہے لگائے۔ آج وہ پہلے سے بھی زیادہ خوشگوار یا پھر باتوں کے موڈ میں تھی۔ اپنے بارے میں بہت سی باتیں کر گئی۔ دوران گفتگو بتایا ''میرا ایک سولہ سال کا بیٹا باہر پڑھنے

گیا ہے۔''

''ہائیں! سولہ سال کا بیٹا؟'' میں حیرت سے بولا ''آپ تو خود پندرہ سولہ سال کی لگتی ہیں۔''

اس کی ہنسی دیدنی تھی!

پھر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی ''اگر لاہور آنا ہوا تو آپ سے ملنے آؤں گی!'' میں نے وزیٹنگ کارڈ دیا۔ ''ضرور آیئے۔''

باہر نکلے تو فاروق رجل بولے ''ہم چار دن سے آپ کے ساتھ ہیں، ہمیں تو کارڈ دیا نہیں اور اسے فٹ سے کارڈ تھما دیا۔''

''آپ نے کپڑوں کی تعریف کی ہے۔''

''ہاں! یہ غلطی تو یقیناً ہوئی۔'' خالق صاحب بولے۔

''چلیں! آپ دونوں بھی لے لیں کارڈ، کیا یاد کریں گے۔''

یہ لکھنا تعلّی نہ سمجھا جائے۔ دہلی میں بھی ایک ہندو عورت نے میری شلوار قمیص کی تعریف کی تھی بلکہ دیکھا جائے تو یہ لباس بطور پاکستانی ہماری شناخت بن چکا ہے۔ اس لیے اگر کوئی عورت لباس کی تعریف کرتی ہے تو بطور عورت (ہندو، مسلم، یورپین کی تخصیص نہیں) لباس کے بارے میں اپنی دلچسپی کا اظہار کرتی ہے، اس سلسلے میں مرد کا وجیہہ ہونا ضروری نہیں۔ میرے بارے میں تو یہی کہا جا سکتا ہے۔ البتہ ایک عورت کو میں نہ سمجھ سکا۔

مہمان نواز

میں ہر روز کسی ادارہ یا تقریب میں مدعو ہوتا جہاں بیک وقت متعدد مردوں اور عورتوں سے تعارف ہوتا، کبھی وہ زیادہ بولتے کبھی میں، اسی طرح جیسا کہ ایسے موقعوں پر بالعموم ہوتا ہے۔ ایسی ہی ایک تقریب کے بعد ''وہ'' مجھے بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گئی۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ کہاں ٹھہرے ہیں؟''

میں نے ہوٹل کا نام بتایا۔

''میں آپ کو ہوٹل لے چلتی ہوں۔''

''آپ تکلیف نہ کریں، میرے پاس گاڑی ہے۔''

''میرے پاس بھی گاڑی ہے، آپ کو میں لے چلتی ہوں۔''

اور میرے منع کرتے کرتے اس نے میری کار کے ڈرائیور کو فارغ کر دیا، وہ سارا راستہ

دلچسپ باتیں کرتی رہی، پھر بولی۔

"آپ میرے گھر میں شفٹ ہو جائیں۔"

میں نے اسے بتایا کہ میرا ہوٹل بہت خوبصورت ہے، مجھے وہاں کوئی تکلیف نہیں۔ میرے قیام کے سلسلے میں ہوٹل کو خاصی معقول رقم بطور ایڈوانس ادا کی جا چکی ہے۔

"یہ تو اور بھی اچھا ہے۔" وہ خوش ہو کر بولی "پیسوں کی بچت ہو جائے گی، آپ کو میرے گھر میں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ میرا خاوند گیا ہوا ہے۔ آپ بڑے آرام سے میرے ساتھ رہ سکتے ہیں۔"

میں معذرت کرتے ہوئے اس کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

"شکریہ چھوڑیں، میں آئی ہوں تو آپ کا سامان لیتی چلتی ہوں۔"

میں اسے سمجھاتا ہوں کہ کیوں میرے لیے اس کے ساتھ ٹھہرنا ممکن نہیں۔

مگر اس نے تو ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی کہ سامان اٹھاؤ، میرے ساتھ چلو، اور سب سے بڑی بات یہ کہ خاوند ملک سے باہر گیا ہے۔ جب میں نے دیکھا کہ میں کسی طرح سے بھی نہیں مان رہا تو بولی۔

"اچھا آپ کی مرضی! میں نے تو سوچا تھا کہ جو دو چار دن آپ یہاں ہیں، گھر کا آرام ملتا، گھر کا اچھا کھانا کھا لیتے۔" پھر بولی "اچھا ایک شرط پر چھوڑتی ہوں۔"

"وہ کیا؟"

"اگلی مرتبہ ماریشس آئیں تو کسی ہوٹل میں نہیں ٹھہرنا، میرے گھر میں ٹھہریں گے۔ وعدہ؟"

"انشاءاللہ۔" یہ انشاءاللہ پاکستانیوں والی تھی۔

مجھے دوران سفر دو ایسی عجیب عورتیں ملیں جنھوں نے دو افسانے دیئے۔ ایک دہلی سے لاہور پی آئی اے کی فلائٹ پر ہم سفر تھی۔ "چالیس منٹ کی عورت" اور دوسری لاہور سے کراچی جاتے ہوئے ریل میں ساہیوال تک کی مسافر، "کاٹھ کی عورتیں" کا پہلا حصہ اسی عورت کی دین ہے۔ میں اتنا بے وقوف نہیں جتنا بعض اوقات میں خود کو ظاہر کرتا ہوں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس کے مسلسل اصرار کے آگے میرا خوشی خوشی ہتھیار ڈالنے کو جی چاہتا تھا، اگر میں اس کے گھر چلا جاتا تو وہاں قیام کے چار پانچ دن یادگار ثابت ہونے تھے، کس لحاظ سے؟ یہ میں نہیں جانتا، لیکن کم از کم ایک افسانہ تو ضرور مل ہی جاتا۔ ہوسکتا ہے افسانہ طویل ہو کر ناول میں تبدیل ہو جاتا۔ کون جانے؟

مِنی بھارت

اگر ماریشس میں سے فرانسیسی زبان ختم کر دی جائے تو ماریشس اور بھارت کے دیگر صوبوں

بالخصوص گوا اور کیرالہ میں کوئی خاص فرق نظر نہ آئے گا۔ آبادی کی اکثریت کے آباء ہندوستان سے آئے تھے اس لیے ہندو، مسلمان، عیسائی سبھی کے لیے اب بھی بھارت وطن کے مترادف تھا۔ اس پر مستزاد وہ حضرات جو علی گڑھ یا دیگر بھارتی یونیورسٹیوں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آئے، اسی لیے ساڑھی، بندیا، ہندی، مندر، فلمیں، گانے، کھانے ہر لحاظ سے بھارت کا ماحول تھا۔ انڈیا کی کئی فلموں کی شوٹنگ یہاں ہو چکی ہے۔ یورپین کے ساتھ ساتھ بھارتی سیاح بھی کثیر تعداد میں یہاں آتے ہیں۔ کاروں میں کیسٹس بھارتی فلموں کی، ٹیلی ویژن پر راج انڈین چینلز کا۔

بھارتی حکومت بھی اس پر خصوصی توجہ دے رہی ہے۔ مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی طرح بھارت اندرا گاندھی کلچرل کمپلیکس تعمیر کر رہا ہے جو یقیناً شاندار عمارت ہوگی۔

1998ء کے اوائل میں ماریشس کے وزیراعظم رام غلام کو علی گڑھ یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا تھا۔

تجارت پر بھارت کا کنٹرول، دکانیں بھارتی کپڑے، مصنوعات، الیکٹرانکس اور اشیاء خورد ونوش سے بھری نظر آتیں۔ اب تک پاکستان کا ذکر نہیں ہوا تو وہ بھی سن لیجیے۔

ہم کپڑے کی دکان پر خریداری کے لیے گئے۔ باریش مسلمان دکاندار کو جب معلوم ہوا کہ میں پاکستانی ہوں تو بہت خوش ہوا۔ کپڑے سے اس کی دکان بھری پڑی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"یہاں پاکستانی کپڑا نظر نہیں آ رہا۔"

بدمزہ ہو کر بولا "پاکستانیوں نے ساری مارکیٹ گندی کر دی ہے۔" فرش پر پڑی چادروں کی طرف اشارہ کر کے بولا "ہمارے مسلمان بھائیوں نے سیمپل کچھ اور بھیجا اور مال یہ تھرڈ کلاس۔" اس نے بتایا "یہاں پاکستانی بیڈشیٹس، تکیوں کے غلاف، تولیے، پردے اور بیڈ کورز بہت پسند کیے جاتے ہیں لیکن معاف کیجیے آپ کے ٹریڈرز اتنے بے اصول ہیں کہ کوئی ان سے ڈیل کرنے کو تیار نہیں۔"

میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ میں اس بھولے ماریشس کو کیا بتاتا کہ کرپشن میں ساری دنیا میں ہمارا دوسرا نمبر ہے:

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

سر سید احمد خاں سیمینار!

مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ بہت بڑا ایجوکیشنل کمپلیکس ہے۔ اس کے شاندار آڈیٹوریم میں

31 اکتوبر 1998ء کو اس تقریب کا انعقاد تھا جس کے لیے میں ہرج مرج کھینچتا ہوا ماریشس آیا تھا۔ صدر مملکت اور وزیراعظم دونوں ہی تشریف لا رہے تھے۔ اس تقریب کے انعقاد میں اسلامک کلچرل سنٹر کا تعاون بھی شامل تھا۔ سٹیج سیکرٹری معروف شاعر یوسف عبداللطیف تھے۔ بھارتی سفیر، صدر اور وزیراعظم سٹیج پر جبکہ پاکستانی سفیر سامعین کے ساتھ! ماریشس کے صدر قاسم حاتم صاحب کو شاعری سے بہت دلچسپی ہے، جب انہیں معلوم ہوا کہ پاکستان اور ہندوستان سے شعراء بھی آ رہے ہیں تو انہوں نے قصر صدر میں مشاعرہ اور عشائیہ کا اہتمام کر دیا لیکن جب معلوم ہوا کہ ہم جیسے خشک ناقدین ہی ہوں گے تو مشاعرہ کے ساتھ ساتھ عشائیہ بھی منسوخ۔ یہ خود انہوں نے اپنی تقریر میں فرمایا۔ اچھے صدر تھے! غالباً وہ اس بات سے واقف نہ تھے کہ ناقدین بھی اچھا کھانا کھا سکتے ہیں! وزیراعظم رام غلام کے ساتھ ان کی خوبصورت دھرم پتنی وینا رام غلام بھی تھی ا

صدر، وزیراعظم اور بھارتی سفیر کی تقاریر ویسی ہی تھیں جیسی ایسے مواقع پر ہوتی ہیں لیکن مجھے اس بات کی خوشی ہوئی کہ برصغیر میں نشاۃ ثانیہ کی جو لہر اٹھی اس میں سرسید احمد خاں کا کردار سراہنے کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کے افکار کا بھی حوالہ دیا گیا جبکہ بھارتی سفیر ایم ترپاٹھی نے ''سیکولرازم'' پر زیادہ زور دیا۔ انہوں نے بتایا کہ ایم اے او کالج علی گڑھ کا پہلا گریجویٹ مسلمان نہیں بلکہ ہندو تھا اور یہ کہ سرسید نے یہ درس گاہ محض مسلمانوں کے لیے نہیں بنائی تھی۔ دونوں بھارتی سکالرز نے بھی تقریباً اسی قسم کی گفتگو کی۔ ہمارے یہاں سرسید احمد خان، ان کی تحریک اور علی گڑھ یونیورسٹی کے بارے میں بہت کام ہوا ہے۔ کیا واقعی کالج کا پہلا گریجویٹ ہندو تھا؟ اس ضمن میں ریسرچ کی ضرورت ہے۔

تقریب میں اسرارالحق مجاز کا لکھا ہوا ''ترانہ علی گڑھ'' بھی گایا گیا، میں نے اس کی ایک کاپی سنبھال لی، وہ درج کر رہا ہوں۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے سابق طلبہ اور اس ادارہ سے علمی دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لیے یہ ترانہ ''سوغات'' سے کم نہیں۔

ترانہ علی گڑھ (از مجاز)

یہ میرا چمن ہے میرا چمن، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں
سرشار نگاہِ نرگس ہوں، بستۂ گیسوئے سنبل ہوں
جو طاق حرم میں روشن ہے وہ شمع یہاں بھی جلتی ہے
اس دشت کے گوشے گوشے سے اک جوئے حیات اُبلتی ہے
یہ دشتِ جنوں دیوانوں کا، یہ بزمِ وفا پروانوں کی
یہ شہرِ طرب رومانوں کا، یہ خلدِ بریں ارمانوں کی

فطرت نے سکھائی ہے ہم کو افتاد یہاں پرواز یہاں
یہ میرا چمن ہے میرا چمن، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں

اس بزم میں تیغیں کھینچی ہیں، اس بزم میں ساغر توڑے ہیں
اس بزم میں آنکھ بچائی ہے، اس بزم میں دل تک جوڑے ہیں
ہر شام ہے شامِ مصر یہاں، ہر شب، شبِ شیراز یہاں
ہے سارے جہاں کا سوز یہاں اور سارے جہاں کا ساز یہاں
ذرات کا بوسہ لینے کو سو بار جھکا آکاش یہاں
خود آنکھ سے ہم نے دیکھی ہے، باطل کی شکستِ فاش یہاں
یہ میرا چمن ہے میرا چمن، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں

جو ابر یہاں سے اٹھے گا وہ سارے جہاں پر برسے گا
ہر جوئے رواں پر برسے گا، ہر کوہِ گراں پر برسے گا
ہر سرو سمن پر برسے گا، ہر دشت و دمن پر برسے گا
خود اپنے چمن پر برسے گا، غیروں کے چمن پر برسے گا
ہر شہرِ طرب پر گرجے گا، ہر قصرِ طرب پر کڑکے گا
یہ ابر ہمیشہ برسا ہے، یہ ابر ہمیشہ برسے گا

بڑے لوگوں کی تقاریر دلپذیر کے بعد چائے کا وقفہ جس میں صدر مملکت نے سرسید احمد خاں اور علی گڑھ یونیورسٹی کے بارے میں تصاویر اور فوٹوگرافی کی نمائش کا افتتاح کیا۔

میں نے نوٹ کیا کہ ہمارے برعکس وہاں سکیورٹی کا کوئی خاص انتظام نہ تھا۔ ہمارے محبوب قائدین جب عید کی نماز کے بعد عوام سے عید مل رہے ہوتے ہیں تو دراصل وہ سکیورٹی اہلکار ہوتے ہیں جن سے گلے مل رہے ہوتے ہیں۔ ادھر میں نے دیکھا کہ صدر صاحب تنہا کھڑے تصویریں دیکھ رہے ہیں۔ میں ان کے پاس گیا۔ اپنا تعارف کرایا۔ پاکستان کا نام سن کر بہت خوش ہوئے۔ میں نے ان کی تقریر کا حوالہ دے کر انہیں بتایا کہ افسوس میرے ساتھ پاکستانی شعراء نہ آ سکے ورنہ آپ کا مشاعرہ والا شوق خوبصورت طریقے سے پورا ہو جاتا۔

چائے کے بعد دوسرے اجلاس میں محمود الرحمٰن صاحب وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی،

پروفیسر شمس تہرانی اور میرے مقالات تھے۔

مقالہ شروع کرنے سے پہلے میں نے کہا "مجھ سے یہاں بار بار پوچھا جاتا رہا کہ میرا طویل سفر کیسا رہا تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ جب میں لاہور سے چلا تو ایک نوجوان تھا اور اب آپ دیکھ لیں میرا حلیہ!"

میں نے ان کے جزیرہ کی تعریف کی (مگر عورتوں کی نہیں) رواداری پر مبنی جمہوری فضا کو سراہا اور سرسید کے حوالہ سے اس تقریب کے انعقاد کرنے والوں کی مساعی کی داد دی۔ سامعین نے دل کھول کر داد دی اور پھر اپنا مقالہ پیش کیا بعنوان "کیا آج سرسید احمد خاں کی ضرورت ہے؟"

سرسید احمد خاں کے حوالہ سے یہ منفرد تقریب ثابت ہوئی، غالباً وہ لوگ ایسی تقاریب کے پیاسے تھے کیونکہ سامعین نے مقالات کی کھل کر داد دی، تاہم میں یہ نوٹ کیے بغیر نہ رہ سکا کہ دونوں بھارتی مقررین نے زیادہ زور ان باتوں پر دیا جن پر بھارتی حکمران زور دیا کرتے ہیں بلکہ پروفیسر شمس نے تو قرآن مجید اور گیتا میں مماثلتیں بھی تلاش کر لیں۔

تقریب کے بعد سامعین میں سے کئی لوگ مجھے آ کر ملے۔ مقالے کو سراہتے ہوئے انہوں نے بطورِ خاص اس پر اظہارِ مسرت کیا کہ مجھ پاکستانی کی وجہ سے ایک طرح کا توازن پیدا ہو گیا۔

اس سیمینار کی میڈیا میں بہت کوریج ہوئی، یوں میری بھی گرم بازاری ہوگئی کہ ہر روز کسی نہ کسی اخبار کا نمائندہ انٹرویو لینے کو پہنچا ہوتا، میری انگریزی گفتگو کو فرانسیسی میں منتقل کر لیتے۔

چھپڑ اور سمندر

ہم گرم میدانوں کے باشندے ہیں اس لیے ہمیں پہاڑ اچھے لگتے ہیں اور سمندر بھاتے ہیں۔ ہر چند کہ میں پیشہ ور مسافر نہیں مگر جب بھی سفر کیا تو ساتھ دوڑتے کھیتوں کی یکسانیت جلد ہی اکتاہٹ پیدا کر دیتی ہے جبکہ پہاڑی سفر میں ہر اندھا موڑ اچنبھا لے کر آتا ہے۔ پہاڑ، جھرنے، وادیاں اور اُڑتے بادل اپنا حسن رکھتے ہیں، اسی طرح سمندر کا جوش اور لہروں کا خروش مسحور کر دیتا ہے۔

میں جب بھی کراچی جاؤں قبلہ مشفق خواجہ کے ساتھ کلفٹن پر غروب آفتاب کا منظر ضرور دیکھنے جاتا ہوں۔ ہر چند کہ کراچی پر بحیرہ عرب، سمندر کم اور چھپڑ زیادہ لگتا ہے۔

"گراں بے" کے ہوٹل خاصے مہنگے ہوں گے کیونکہ یہاں غالباً میں ہی کالا تھا ورنہ سب یورپین، ہاتھ میں بیئر کین پکڑے، اپنے انداز واطوار کے مطابق مزے کرتے۔

پہلی صبح کو ناشتے کے لیے جا رہا تھا کہ ہوٹل کی منیجر سے ملاقات ہوئی۔ لمبی دبلی، سفید اور منی سکرٹ "ہائے" وہ ہاتھ ملاتے ہوئے بولی۔

"میں نیا پنچھی ہوں"۔ میں اسے بتاتا ہوں۔

"کہاں سے آنا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"پاکستان"۔ میں اسے بتاتا ہوں اور ساتھ ہی کہتا ہوں "شاید تم پاکستان کے بارے میں کچھ نہ جانتی ہوگی؟"

"پاکستان" وہ یوں دہراتی ہے گویا اس کا ذائقہ محسوس کر رہی ہو، پھر اچانک جیسے اسے یاد آ گیا "اوہ! پاکستان بے نظیر بھٹو کا پاکستان؟"

"ہاں! بے نظیر بھٹو والا ہی پاکستان"۔

وہ مجھے بتاتی ہے کہ گزشتہ برس ٹیلی ویژن ڈرامے کی ریکارڈنگ کے لیے ایک یونٹ آیا اور ایک مہینہ ہمارے ہوٹل میں رہے۔

اگلا ہفتہ ہر صبح اس سے ملاقات ہوتی، وہ کہتی "ہائے" میں کہتا "ہائے ہائے!"

سکون کا دائرہ

ماریشس اور ہمارے وقت میں زیادہ فرق نہیں اس لیے میں لاہوری وقت کے مطابق یعنی 8 بجے ناشتے کے لیے تیار ہو جاتا اور حسبِ عادت کم سے کم کھا کر فارغ ہو جاتا۔ پہلی صبح بھی یہی ہوا۔ سوچا چلو اِدھر اُدھر سیر کرتے ہیں چنانچہ ہوٹل سے نکل کر یوں ہی چلنا شروع کر دیا۔ پانچ منٹ کے بعد میں نے خود کو ایک بے حد خوش منظر مگر چھوٹی سی خلیج کے سامنے پایا۔ گہرے سبز پانی والی یہ خلیج کسی جھمکے یا آویزے سے مشابہہ تھی۔ چھوٹی چھوٹی کشتیاں رواں تھیں، کچھ لوگ تیر رہے تھے، کچھ مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ ہوا خوشگوار جبکہ آسمان حسینہ کی آنکھ جیسی نیلمیں چمک لیے، میں جیسے ٹھٹھک کر رہ گیا۔ آنکھیں منظر کے خوشگوار تاثرات اعصاب تک منتقل کر رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد میں خود کو سکون کے دائرے میں محسوس کرتا ہوں۔ میں درخت کے تنے پر بیٹھ جاتا ہوں۔ بیٹھ کیا جاتا ہوں، بیٹھا رہ جاتا ہوں۔ میرے ارد گرد لوگ آ جا رہے ہیں۔ ادھر سامنے رائل روڈ پر ٹریفک جاری ہے، نہ میں کسی کی طرف متوجہ ہوں نہ کسی کو میرے وجود کا احساس ہے۔ میں منظر سے الگ نہیں بلکہ خود کو منظر کا حصہ محسوس کر رہا ہوں، عجب انمول احساس تھا کہ کوئی احساس نہ تھا۔ میں موج تھا کہ سنگِ ساحل، آبی پرندہ کہ ماہیٔ آب۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا، بس سحر زدہ سا بیٹھا رہا۔ اس دن کے بعد میں نے ہر صبح وہیں گزاری بلکہ جلد سے جلد ناشتہ کر کے وہاں پہنچنے کی کوشش کرتا۔ ماریشس کی یہ صبحیں میری معدودے چند خوشگوار یادوں کے خزانہ کا حصہ بن چکی ہیں۔ کچھ ایسے ہی عالم میں میں نے امریکہ میں، ویران ساحل پر اٹلانٹک سے مکالمہ کیا تھا۔

واپسی پر سڑک کے کنارے ایک چھوٹا سا مندر نظر آیا، اندر دولت کی دیوی لکشمی اور علوم و فنون کی سرپرست دیوی سرسوتی کے ساتھ سیاہ شولنگ بھی نظر آ رہا تھا۔ مندر خالی تھا۔ نہ پجاری، نہ داسی، نہ دیوداسیاں، اندر دیوتا اور باہر میں کھڑا انہیں گھورتا!!

یہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے اور ماریشس کے پیدائشی ہونے کے باوجود ان سب کی اصل ہندوستان ہی ہے، اس لیے مذہبی عقائد کے لحاظ سے ان میں اور بھارتی ہندوؤں میں کوئی فرق نہیں۔ اس لیے کثیر تعداد میں چھوٹے بڑے مندر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایک دیوی دیوتا کے استھان سے لے کر متعدد دیوی دیوتاؤں والے۔

ماریشس میں عام آبادی سے دور ایک سرد آتش فشاں کا تقریباً ایک کلومیٹر دہانہ، صدیوں کی بارشوں سے ایک خوبصورت جھیل میں تبدیل ہو چکا ہے۔ ہندوؤں نے بھارت سے گنگا جل لا کر اس جھیل میں ڈال دیا، یوں یہ گنگا تالاب بن گیا۔ اب یہ ماریشس کے ہندوؤں کے لیے ایک پوتر تیرتھ بن چکا ہے اور دور سے یاتری آتے ہیں۔ بعض عقیدت مند تو میلوں کا پہاڑی راستہ پیدل طے کرتے ہیں۔ سرسبز پہاڑیوں میں پیالہ سی یہ جھیل واقعی اساطیری محسوس ہوتی ہے۔ ارد گرد درختوں پر بندر ہنومان جی کی کمی بھی پوری کر دیتے ہیں۔

جھیل کے پہلو میں ایک بڑا مندر جس کے درمیان میں شیولنگ اور ارد گرد ہنومان، سرسوتی، گنیش اور رادھا کرشن کی مورتیاں سچ مچ کے رنگین ملبوسات میں۔

ہمارا گروپ درجن بھر مرد وزن پر مشتمل تھا۔ ساتھ ایک ہندو عورت بھی تھی، خاموش اور شرمیلی سی کیونکہ میں بھی خاموش اور شرمیلا سا ہوں اس لیے ہم دونوں ہی زیادہ تر محو کلام رہے، مجھے ایک سہولت یہ بھی تھی کہ اس کی انگریزی بھی میری انگریزی جیسی تھی۔

مندر میں داخل ہونے سے پہلے میں نے اس سے کہا۔

''ذرا ان دیوی دیوتاؤں کے بارے میں مجھے بتاتی رہنا۔''

لیکن اس سے پہلے میں نے ہی بولنا شروع کر دیا۔ وہ بولی ''آپ کو تو سب کچھ معلوم ہے، میں آپ کو کیا بتلاؤں۔'' ہم دیوی دیوتاؤں کے ساتھ تصویریں بناتے رہے، پھر اس نے اچانک ہی عجب سوال کیا۔

''اگر آپ ہندو ہوتے تو کس کے پجاری ہوتے؟''

میں نے جواباً کہا ''لکشمی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں کیونکہ ادیب ہوں اس لیے میں سرسوتی ہی کا پجاری ہو سکتا تھا۔''

اس نے ہنس کر پوچھا:

''اور بجرنگ بلی؟''

''نہ بابا! مجھے تمہارے ہنومان سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

دراصل میرا بچپن بمبئی، پونہ اور انبالہ میں گزرا ہے۔ سیاسی حالات جو بھی رہے ہوں مگر بچوں کی اپنی دنیا ہوتی ہے۔ چنانچہ ہندو ہم جماعت لڑکوں کے گھروں میں آنا جانا تھا اور ان ہی کے ساتھ مندروں اور گوردواروں میں ''پرساد'' اور دیسی گھی میں تر بتر حلوہ (کڑاہ) بھی کھا لیتے تھے۔ بعد میں علمی سطح پر عالمی اساطیر کا مطالعہ کیا تو ہندو اساطیر سے مزید واقفیت ہو گئی۔

میں موضوع سے دور ہو رہا ہوں لیکن اس دلچسپ امر کی طرف توجہ دلانی ضروری سمجھتا ہوں کہ تسخیر قمر والے زمانے میں صرف بھارت ہی دنیا کا واحد ملک ملتا ہے جہاں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے ساتھ چار ہزار برس پرانی اساطیر کے مطابق روزمرہ کی زندگی بسر ہو رہی ہے۔ اس سے عام بھارتی کی زندگی میں جو تضادات پیدا ہوتے ہیں اور جن مسائل اور الجھنوں کو جنم دیتے ہیں ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ آلودہ ترین دریا ہونے کے باوجود گنگا پوتر ہے اور پاپیوں کے پاپ دھوتی ہے۔ بندر دیوتا ہے، بڑ، پیپل اور تلسی پوتر ہیں اور بہار کے برہمن اچھوتوں کے خون اور کھوپڑیوں پر مندروں یا اہم عمارات کی بنیادیں استوار کرتے ہیں۔

ویسے آپس کی بات ہے بت پرستی میں ہم توحید پرست بھی کسی سے کم نہیں۔ ہمارے ہاں بھی لات و منات ہر دور میں بھیس بدل کر آتے رہتے ہیں اور ہم دلوں میں صنم خانہ آباد کیے رہتے ہیں، غیر مرئی بتوں کو نظر نہ آنے والے سجدے کرتے ہیں، اسی لیے علامہ اقبال کو کہنا پڑا:

تیر دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

گووندا اِن ماریشس

میں کوئی دس بجے رات کو واپس آیا تو ہوٹل کے ہال میں سے سازوں کی جھنکار کے ساتھ گیت کے بول ابھرے، بیرے نے استفسار پر بتایا کہ اندر موسیقی کا پروگرام ہو رہا ہے۔

اندر گیا تو چالیس پچاس سامعین کے جھرمٹ میں گووندا بیٹھا گا رہا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اتنا بڑا اسٹار اور ماریشس کے ایک ہوٹل میں گانا گائے لیکن اس کی شکل نہ صرف گووندا جیسی تھی بلکہ ہنسنے کا انداز تو خالص گونوندی تھا۔ میں نے سوچا، کیا پتہ یہ گووندا کا جڑواں بھائی ہو اور کنبھ کے میلہ میں اس سے بچھڑ گیا ہو۔ وہ فلمی دنیا کا شہزادہ ہو، یہ موسیقی کا۔ فلم کے کلائمکس کے منظر میں ماں آ کر بازو پر کھدے

ہوئے نشان سے پہچان کرانہیں بتائے گی کہ تم ایک دوسرے کے دشمن نہیں بلکہ سگے بھائی ہو۔دشمن تو وہ لمبی مونچھوں والا وِلن ہے۔دراصل یہ مقامی سنگر تھا۔

مجھے خوشی اس بات کی ہوئی کہ ماریشس کا سنگر ہمارے شاعروں اور نصرت فتح علی خان کی غزلیں گا رہا تھا۔سامعین نے فرمائش کر کے ابن انشاء (کل چودھویں کی رات تھی) اور قتیل شفائی (گھونگھر وٹوٹ گئے) کا کلام سنا۔میں نے واپس آ کر قتیل صاحب کو بطور خاص بتایا کہ آپ ماریشس میں بھی مقبول ہیں۔اکثر اوقات کاروں میں نصرت فتح علی کی کیسٹس چل رہی ہوتیں۔

بہر حال یہ محفل موسیقی خاصی رات گئے تک جاری رہی۔

کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا

ڈیڑھ بالشت کا ماریشس ہر لحاظ سے ٹورازم کے لیے آئیڈیل ہے۔قدرتی مناظر کی دلکشی، امن وامان کی بہترین صورت، خوش اخلاق افراد، صاف ستھرا ماحول، جرائم اور جراثیم سے پاک ہونے کے ساتھ ایک اضافی خوبی یہ ہے کہ اس کا موسم ہمارے موسم کے برعکس یعنی آسٹریلیا کی مانند ہے۔

میں اکتوبر میں وہاں گیا تھا، ہمارے ہاں گرمی سردی بیچ کے اس مہینہ میں موسم معتدل ہوتا ہے مگر ماریشس میں گرمی کا آغاز تھا۔

مجھے اس کا اندازہ یوں ہوا کہ عنایت حسین ایدن صاحب نے رات کے کھانے پر گھر بلایا تو ان کی بیگم نے آم پیش کیے۔

آم لذیذ تھے۔میں نے پوچھا ''یہ کولڈ سٹوریج کے ہیں؟''

''جی نہیں، ہمارے باغ کے ہیں۔یہ پہلے پکے آم ہیں جو میں آپ کو کھلا رہی ہوں۔''

''اکتوبر میں تازہ پکے آم۔یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟''

انہوں نے بتایا، ہمارے ہاں گرمیاں شروع ہو چکی ہیں۔

''یہ تو آسٹریلیا کا موسم ہے۔''

''موسم کے لحاظ سے ہم آسٹریلیا والی پٹی میں آتے ہیں۔''

تو صاحبو! افریقہ کے پہلو میں، بحر ہند کا جزیرہ، بلحاظ موسم آسٹریلیا کا ہم پلہ۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ یورپ کے ٹورسٹس سردی سے بھاگ کر اور ایشیائی گرمی سے گھبرا کا ماریشس کا رخ کر سکتے ہیں۔یقیناً قدرت ماریشس پر مہربان ہے۔قدرت پھلوں اور نایاب پھولوں کے ساتھ اور بھی کئی طرح سے مہربان ہے۔

میں نے ابتداء میں لکھا ہے کہ شاید یہ جزیرہ آتش فشانی عمل اور زلزلوں کے ذریعہ سے معرض وجود میں آیا ہو۔اس پر روشنی تو جیولوجی کے ماہرین ہی ڈال سکتے ہیں لیکن وہاں ٹھنڈے آتش فشاں پہاڑ دیکھنے پر تو کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔

ہوا یہ کہ بشیر حسین طالب اور ان کی اہلیہ نے ایک پورا دن سیر وتفریح کے لیے وقف کیا۔ کھانے پینے کا سامان لے کر ہم نے بلندیوں کا سفر شروع کیا۔ہم ایک پہاڑ کی سرسبز چوٹی پر رکتے ہیں اور یا مظاہر العجائب! سامنے کوئی ایک کلومیٹر دائرہ کا آتش فشانی دہانہ تھا۔نیچے نگاہ کی تو لگا قلابازی کھا کر نیچے گر جاؤں گا، نیچے، نیچے اور بہت ہی نیچے، سرکشیدہ درختوں اور ہریالی کے پیالہ میں بارش کے پانیوں نے چھوٹی سی جھیل بنا رکھی تھی۔میں سحر زدہ سا کھڑا دیکھتا رہ گیا۔

مسز بشیر صاحبہ بتا رہی تھیں کہ جزیرہ پر ایسے سرد مگر پرفضا بیس آتش فشاں ملتے ہیں۔انہوں نے بتایا کہ لاکھوں برس سے یہ سرد ہو چکے ہیں اور بارشوں اور ہواؤں نے انہیں خوش منظر پہاڑوں میں تبدیل کر دیا ہے بلکہ یہاں امرود بہت اچھا اُگتا ہے۔

میں نے کہا ''یہ لاکھوں برس سے خوابیدہ ہیں تو فی الحال تو ان کے بیدار ہونے کا خدشہ نہیں؟''

ہنس کر بولیں ''اگلے نصف گھنٹہ تک تو نہیں۔''

''خدا کا شکر ہے۔'' میں اطمینان کی طویل سانس لیتا ہوں۔

میں خوابیدہ آتش فشاں کی تصویر بناتا ہوں مگر کیمرہ اس کے جلال و جمال کے سامنے بے بس ہو گیا۔

مسز بشیر جغرافیہ کی استاد تھیں سو ہماری بھی کلاس لے رہی تھیں۔انہوں نے بتایا ''ایسی کئی جھیلیں ہیں۔سب سے بڑی جھیل کا پانی شہر کو سپلائی ہوتا ہے۔''

اس دن مختلف خوبصورت مقامات اور مناظر دیکھے۔ایک یادگار تصویر بھی بنی۔ہم کنول کے پھولوں کے چھوٹے سے تالاب کے ساتھ کھڑے باتیں کر رہے تھے، ہم سے ڈرے بغیر ایک بندر آ کر تالاب کے کنارے منڈلانے لگا، میں نے کیمرہ تیار رکھا، جونہی وہ پانی پینے جھکا، میں نے شٹر دبا دیا۔

پہاڑی، جنگل، کشیدہ قامت درخت، خوشگوار ہوا، سمندر، ہریالی، مہربان دھوپ اور اچھے سنگی۔انسان کو بھلا اور کیا چاہیے؟

ماریشس دیکھ کر ورڈز ورتھ کا فطرت سے روحانی رابطہ سمجھ میں آتا ہے، لاہور جیسے غلیظ شہر میں نہیں۔

اورتو اور ماریشس کے پہاڑ بھی بہت زیادہ بلند نہ ہونے کے باوجود اور برف کی اجلی دستار فضیلت پہنے بغیر بھی اپنے اندر ایک اچنبھا رکھتے ہیں مثلاً ایک پہاڑ کی چوٹی کھڑے انگوٹھے جیسی تو دوسرے کو دیکھ کر یوں محسوس ہو گویا انسانی سر نے سنگی روپ دھار لیا ہے۔ اس چوٹی کے بارے میں پریوں اور گوالے کی داستان عشق مشہور ہے ویسی ہی جیسے جھیل سیف الملوک کے بارے میں ہمارے ہاں ہے۔

دراصل انسانی تخیل جھرنے کی مانند ہے۔ اس ذہنی عمل نے عوامی سطح پر فوک لور کی تخلیق کی تو زیادہ ترفع پا کر مائی تھولوجی کی! شہر کے وسط میں ایک ایسا مقام ہے جہاں بڑ کے بہت سے درختوں کی ''داڑھیاں'' زمین میں گڑ کر درختوں میں تبدیل ہو گئی ہیں اور ان ہی کو کاٹ کر ان میں روشیں بنا کر اسے اچھے خاصی پارک میں تبدیل کر دیا گیا ہے، میں نے بہت کوشش کی مگر اس مقام کا حسن کیمرہ کی گرفت میں نہ لا سکا۔

مسجد میں کرسیاں

اب جو میں لکھنے جا رہا ہوں اسے پڑھ کر عام نوعیت کا مُلا اگر تکفیر نہ کرے تو کم از کم لاحول تو یقیناً ہی پڑھے گا۔ میں اور خالق بوچا شہر میں گھوم رہے تھے، وہ کہنے لگے ''جمعہ کی نماز کا وقت ہو رہا ہے، چلیں نماز پڑھتے ہیں۔''

ہمارے سامنے سنہری گنبد والی دومنزلہ مسجد تھی، شہر کے مرکز میں واقع یہ مسجد خوبصورت بھی تھی اور فراخ بھی مگر پیشہ ور گداگروں کے بغیر۔

مسجد کے دروازہ پر کرسیاں اور سٹول پڑے تھے تا کہ اطمینان سے بیٹھ کر جوتے اتارے جا سکیں، میں نے حسب روایت جوتے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیے۔

''یہ جوتے لے کر آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' خالق صاحب نے پوچھا۔

''اندر۔''

''کیوں؟''

''کوئی چوری نہ کر لے۔''

انہوں نے تعجب سے پوچھا ''مسجد میں جوتے چوری ہو سکتے ہیں؟''

''مسجد ہی میں تو جوتے چوری ہو سکتے ہیں۔''

وہ میری بات نہ سمجھے ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

میں انہیں بتاتا ہوں کہ ہماری مسجدوں میں پرانی سے پرانی جوتی باہر چھوڑنے کا بھی رسک نہیں لیا جاتا، اسی لیے مسجد میں ہم اپنی جوتیوں کی زیادہ اور نماز کی حفاظت کم کرتے ہیں۔

خالق صاحب کہنے لگے ''یہاں ایسا نہیں ہوتا، ہم نے تو یہ کبھی سنا بھی نہیں کہ مسجدوں سے جوتیاں بھی چوری ہو سکتی ہیں۔''

میں خفت کا مارا انہیں کیا بتاتا کہ میں خود بھی اس تجربے سے گزر چکا ہوں اور ماریشس میں اس کا اعادہ نہیں چاہتا۔

جس طرح جوتے اتارنے کو سٹول رکھے تھے، اسی طرح وضو کے لیے بھی سٹول تھے، اوپر تولیوں کی قطار۔

وسیع مسجد نمازیوں سے پُر تھی۔ دوسری منزل پر جانے کے لیے زینہ کے سامنے کھڑے ایک بزرگ نمازیوں کے ہاتھوں پر عطر مل رہے تھے۔ مسجد کے ایک کونے میں کرسیوں پر وہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے جو کسی وجہ سے رکوع، سجود کے قابل نہ تھے۔ میں بھی ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ دراصل میں ڈسک سلپ کا مریض ہوں اور میرے لیے رکوع میں جھکنا، سجدہ کرنا اور قعدہ میں بیٹھنا تکلیف دہ عمل ہے۔ اس لیے میں مسجد میں کرسیاں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ کمر خمیدہ بزرگوں کے ساتھ ایک دو نوجوان بھی نظر آئے جو چوٹوں کی وجہ سے کرسیوں پر بیٹھنے پر مجبور تھے۔ اس مسجد کے علاوہ بھی میں نے جو مساجد دیکھیں ان سب میں بھی کرسیاں نظر آئیں، گویا طے شدہ لائحہ عمل کے تحت مساجد میں کرسیاں رکھی جاتی ہیں تا کہ وہ لوگ بھی باجماعت نماز ادا کر سکیں جو شاید عام حالات میں گھر میں نماز ادا کرنے پر مجبور ہوتے۔

میرا خیال ہے، چار پانچ سو نمازی یقیناً ہوں گے۔

خطبہ مقامی بولی ''کریاؤلی'' میں ہے۔ دیوار پر نظریں دوڑاتا ہوں تو سورۂ لقمان کی 33-34 آیات کا فرانسیسی میں ترجمہ نظر آتا ہے اور ساتھ لکھا ہے Saint Coran اپنے ہاں مساجد میں آیات کی خطاطی کے بعد فرانسیسی میں آیات کا ترجمہ دیکھنا اور ایک نامانوس بولی میں خطبہ سننا عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔ میں اپنے مانوس ماحول سے ہزاروں میل کے فاصلہ پر انجان زمین پر اجنبی لوگوں میں بیٹھا ہوں مگر مجھے اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ دراصل یہی دین کی وحدت ہے مگر اس کا احساس پاکستان میں نہیں بلکہ باہر جا کر ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں جمعہ کو لاؤڈ اسپیکروں پر جو کچھ ہوتا ہے، اس سے سب آگاہ ہیں لیکن میں نے نوٹ کیا کہ خطبہ نہایت مختصر تھا۔ چنانچہ پون گھنٹہ میں نماز پڑھ کر فارغ بھی ہو گئے، ہماری طرح

نمازیوں نے پگڑیوں اور ٹوپیوں کا بھی اہتمام نہ کیا تھا، بیشتر ننگے سر تھے۔
نماز پڑھ کر باہر آیا تو جوتے جہاں اتارے تھے وہیں پڑے تھے۔ کمال ہے!

مُلّا اور اسلام

ایک ہفتہ کے قیام میں میری تمام دوپہریں کسی علمی، ادبی یا مذہبی ادارے کے اراکین سے ملاقات یا تقاریب میں بسر ہوتیں جبکہ رات کہیں نہ کہیں کھانے پر مدعو ہوتا۔ جیسے جیسے میری آمد کا چرچا بڑھتا گیا مدعو کرنے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ایک دن پیغام ملا، ایک امام مسجد آپ سے ملاقات کے بہت ہی زیادہ خواہش مند ہیں، اگر آپ پسند کریں تو وہ رات کو کھانے پر بلانا چاہتے ہیں۔

ایمان کی بات ہے، میں اس طبقے سے الرجک ہوں۔ اگر پاکستانی مُلّا ہوتا تو میں آلودگی سے محفوظ رہنے کے لیے دور ہی سے سات سلام کرتا لیکن ماریشس کے مولوی صاحب سے مل کر میں اسلام، مسلمانوں اور مساجد کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا تھا، چنانچہ میں نے ان کی دعوت قبول کر لی۔

اکبر ادریس مسجد کے پہلو میں سادہ سی اقامت گاہ میں رہائش پذیر تھے۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے ممالک کے بارے میں استفسارات کرتے رہے۔ ان سے جو کچھ سنا وہ مجھے اچھا لگا۔ انہوں نے بتایا کہ ماریشس میں تقریباً پونے دوسو مساجد اور سوا دوسو دینی مدارس ہیں۔ کوئی شخص بھی امامت بطور پیشہ نہیں اپناتا بلکہ تمام امام ملازمت یا ذاتی کاروبار کرتے ہیں، حکومت امامت کے معاوضہ کے طور پر ہر پیش امام کو چار ہزار روپے ماہانہ ادا کرتی ہے۔ ادریس صاحب بھی سکول میں مدرس تھے۔ اسی طرح مجھے 50 سی سی موٹر سائیکل پر داڑھی والے ایک بزرگ دکھائے گئے جو اسمبلی کا رکن ہونے کے ساتھ ساتھ ساتھ اپنے علاقہ کی مسجد کے امام بھی تھے۔ کوئی امام محض امام نہ تھا بلکہ سبھی پڑھے لکھے اور بعض کے بارے میں معلوم ہوا کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی تھے۔

گہوارۂ امن

میں نے جتنے لوگوں سے بھی گفتگو کی، سب سے بطور خاص یہ پوچھا گیا، کیا یہاں مذہبی فسادات نہیں ہوتے؟ سب سے نفی میں جواب ملتا۔ میرا اگلا سوال ہوتا، کیوں نہیں۔ اس کا بھی مشترکہ جواب ملا۔ تعلیم کی وجہ سے۔ سبھی پڑھے لکھے ہیں، ذاتی سوچ سمجھ رکھتے ہیں، اس لیے کسی مذہبی یا سیاسی لیڈر کے بہکانے میں نہیں آتے۔

فاروق رجل نے بتایا، کوئی چالیس برس پہلے ایک بہت ہی خوفناک مسلم عیسائی فساد ہوا، جس میں بہت زیادہ جانی اور مالی نقصان ہوا تھا۔ اس کے بعد سے لوگوں کو عقل آ گئی، وہ دن اور آج کا دن مذہبی لحاظ سے ہم امن وسکون سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔

''اور جرائم، ڈاکے، قتل، اغوا، ریپ؟''

''برسوں میں ایک آدھ جرم ہوتا ہے۔''

میں انہیں بتاتا ہوں کہ آپ لوگ کتنے خوش قسمت ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ!

خوش منظر لینڈسکیپ، صاف ہوا، چاروں طرف سمندر کا نیلمیں زمرد پانی، جرائم سے پاک، رواداری پر مبنی معاشرہ، عمومی خوشحالی (تین ہزار ڈالر فی کس اوسط آمدنی) مفت تعلیم اور بھلا کیا چاہیے؟

ہمیں ہمارے خودغرض، نام نہاد ''راہنماؤں'' نے گمراہ کیا۔ طالع آزما سیاستدان سوہنی دھرتی کے لیے آکاس بیل ثابت ہوئے اور مذہبی دہشت گردوں نے مساجد میں بے گناہ نمازیوں پر گولیاں برسا کر دنیا کے سامنے مذہب کا جو تاثر پیش کیا وہ قابل افسوس ہے، ادھر یہ ننھا منا جزیرہ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، بدھوں کے لیے عافیت کا جزیرہ ہے۔

میں نے استفسار کیا ''الیکشن کے زمانہ میں تو لیڈر لوگ الیکشن جیتنے کے لیے ہر حربہ آزماتے ہیں۔ کیا وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اشتعال نہیں دلاتے؟''

جواب ملا ''سلیم صاحب! یہ تعلیم یافتہ اور باشعور لوگوں کا جزیرہ ہے، ہم کیا اپنی عقل نہیں رکھتے جو دوسروں کے بہکانے میں آ کر لڑائی جھگڑا شروع کر دیں۔ بولنے والے بولتے رہتے ہیں لیکن ان کی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔''

جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ دو چار پاکستانی مذہبی رہنماؤں نے یہاں کا دورہ کیا تو میں لرز گیا۔

''بچو! اب تمہاری خیر نہیں!''

اردو! کتابیں!!

بعض اوقات خوشی اچانک ملتی ہے۔

حسین ایڈن صاحب سے اردو مرکز میں ملاقات ہوئی، اچھی گفتگو رہی، وہ کہہ رہے تھے ہمیں پاکستانی کتابیں اور رسالے نہیں ملتے اس لیے آپ کے ادب اور ادیبوں کے بارے میں ہمیں زیادہ معلومات نہیں، کہنے لگے:

"اب دیکھیے نا! میں نے آپ کی کوئی کتاب نہیں پڑھی حالانکہ آپ نے اتنا کام کر رکھا ہے۔ البتہ گزشتہ دنوں مجھے "ماہِ نو" کا ایک پرچہ ملا تو اس میں آپ نے اپنے شاگرد طاہر تونسوی پر جو خاکہ "گرم لہو کی دھمال" قلم بند کیا، وہ پڑھا، بہت اچھا خاکہ لکھا ہے آپ نے۔"

اس کے بعد گفتگو طاہر تونسوی کے علاوہ اور بھلا کس موضوع پر ہو سکتی تھی۔

مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ خوش منظر ماحول میں خوش نما عمارت ہے۔ اس میں اردو زبان کی تدریس اور نصاب سازی کے ادارے نے مجھے مدعو کیا۔ ادارے کے ڈائریکٹر اتم بسوریال، زبانوں کے شعبے کے صدر قاسم ہیرا اور صدر شعبۂ اردو حسین ایڈن صاحب سے مفید گفتگو رہی۔ انہیں نصاب سازی اور بالخصوص بی اے کی سطح تک کے طلبہ کو پڑھائی جانے والی اردو زبان و ادب کے بارے میں پاکستانی طریق کار جاننے سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ اردو نصاب میں پاکستانی مصنفین کی کتابیں بھی شامل کرنا چاہتے تھے لیکن ان کی رہنمائی کی کوئی صورت نہیں اور نہ ہی کتابیں دستیاب ہیں۔

میں نے کہا "کتابوں کی فراہمی کا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ تمام ادیب اور ناشر میرے دوست ہیں۔ میں بے شمار کتابیں دلوا سکتا ہوں، اصل مسئلہ ترسیل کا ہے، کتاب سے زیادہ اخراجات ٹکٹوں کے ہیں۔"

ان کی بہت بڑی لائبریری میں تمام کتابیں ہندوستان کی مطبوعہ اور ہندوستانی مصنفوں کی تھیں۔ مجھے وہاں اپنی کتاب 'انشائیہ کی بنیاد' نظر آئی تو جہاں مجھے بے حد خوشی ہوئی وہاں ان لوگوں پر بھی کچھ رعب پڑا ہوگا مگر "انشائیہ کی بنیاد" ہندوستانی ایڈیشن نکلا جو کسی ناشر نے میری اجازت کے بغیر شائع کر رکھا تھا۔

پھر تاج محل!

ماریشس میں قیام کا آخری دن یادگار ثابت ہوا۔ صبح کا نکلا تمام دن کی مصروفیات کے بعد شام کو ہوٹل پہنچا۔ غسل سے تازہ دم ہو کر کپڑے بدلنے کے بعد رات کے کھانے پر پہنچنا تھا۔ مجھے خاصی تاخیر ہو چکی تھی اور میں بہت جلدی میں تھا۔

ریسپشنسٹ کے پاس چابی لینے گیا تو لاؤنج کو موٹے موٹے، سرخ و سپید پھولے گالوں والے، مردوں اور ویسی ہی موٹی عورتوں سے بھرا پایا، ان کا سامان بکھرا پڑا تھا۔ بیئر کین تھامے غٹ غٹ پی رہے تھے، زور زور سے باتیں کر رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے۔

ریسپشنسٹ جس کے چہرہ پر چھائیوں نے عجب نقشے بنائے تھے، مجھے دیکھ کر سخت

نروس ہوئی۔

"مائی کی پلیز!"

"کمرہ تو بک ہو گیا۔"

"اور میرا سامان؟"

"وہ اِدھر ہے۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میرے کپڑے وپڑے سب کچھ دفتر کی کرسی پر دھرا تھا۔ اتنے میں منیجر آ گئی، وہی جس سے ہر روز ملاقات ہوتی تھی، وہ سراپا معذرت تھی۔

"ڈاکٹر اختر! آئی ایم ایکسٹریملی سوری......" وہ بتا رہی تھی کہ نہ جانے کیسے غلطی سے میرے کمرہ کی بکنگ میں ایک دن کم درج ہو گیا اور اب تمام کمرے سیاحوں کو دیے جا چکے ہیں۔

"تو میرا کیا بنے گا؟"

"ڈاکٹر اختر! ڈونٹ وری......"

اس نے میرے منع کرنے کے باوجود میرے کپڑے، کتابیں سب کچھ اٹھا کر اپنی گاڑی میں رکھا، دروازہ کھولا اور ساتھ بٹھا کر لے چلی۔ اگر اس کی منی سکرٹ خطرناک حد تک اوپر اٹھتی گئی تو اسے اس کا احساس نہ تھا، ویسے مجھے بھی کوئی احساس نہ تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "ڈاکٹر اختر! میں آپ کو بہت اچھے ہوٹل میں کمرہ دلوا دیتی ہوں اور ایک مرتبہ پھر اس تکلیف کے لیے معذرت کرتی ہوں۔"

میں اب مطمئن ہو چکا ہوں، لہٰذا اپنے متجسسانہ مزاج کے مطابق اس سے کہتا ہوں

"تم مجھے ماریشس کی نہیں لگتی ہو۔"

"کیسے جانا؟"

"تم تو گوری چٹی ہو، یورپین کی طرح۔"

وہ خوش دلی سے قہقہہ لگاتی ہے۔ "نہیں! ہوں تو ماریشس ہی کی لیکن میرا زیادہ تر وقت یورپ میں گزرا ہے۔ میرا خاوند فرانسیسی ہے۔"

وہ نہایت بے تکلفی سے اپنے بارے میں بتاتی جاتی ہے، میں باہر دیکھتا ہوں۔ "یہ ہم کدھر جا رہے ہیں؟ ہائیں! یہ تو تاج محل کا راستہ ہے۔" میں خوشی سے چلاتا ہوں۔ "ہم تو تاج محل میں پہنچ گئے ہیں۔"

وہ حیرت سے پوچھتی ہے۔ "تم تاج محل کو کیسے جانتے ہو؟"

"ایسے ہی، بس ایسے ہی!!"

اندر تاج محل کی مالکہ بغلگیر ہونے کے انداز میں بے حد خوشی سے ملتی ہے۔ اب جبکہ میں محفوظ ہاتھوں میں ہوں تو منیجر مطمئن ہو کر خوشی خوشی رخصت ہوتی ہے۔ میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ اس کے ہوٹل میں میرا بہت اچھا وقت گزرا۔ اسے مزید خوشی ہوتی ہے۔

تاج محل میں اپنے کمرہ کی کھڑکی کھولی تو سمندر جیسے کمرے میں آ گیا۔ وہ مجھے بتا رہی تھی کہ کمرے تو اور بھی خالی تھے لیکن یہ اس ہوٹل کا سب سے بہترین کمرہ ہے، نظارے کے لحاظ سے! کمرے کے باہر اور اندر کا نظارہ بیوٹی فل تھا۔

وہ کھانے کا پوچھتی ہے۔

''رات کا کھانا باہر ہے۔''

''اور ناشتہ؟''

میں اپنے مختصر ترین ناشتہ کے بارے میں بتاتا ہوں۔

وہ صبح کو خود ناشتہ کی ٹرے لے کر آتی ہے، میک اپ کے بغیر، دھلی دھلائی، ٹی شرٹ اور جینز میں وہ سکول کی بچی لگتی ہے، کسی بڑے ہوٹل کی مالکہ نہیں۔ میں نے اسے غلط نہ کہا تھا، تم تو خود سولہ سال کی لگتی ہو۔ میں بالعموم صبح ناشتہ میں دو سادہ ٹوسٹ لیتا ہوں اور گھر سے باہر کھانے میں اور بھی محتاط ہو جاتا ہوں مگر اس دن یہ سوکھے ٹوسٹ فرنچ ٹوسٹ میں تبدیل وہ گئے (میں اس سے زیادہ دور کی تشبیہ نہیں سوچ سکتا۔)

پیارے قارئین! اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ماریشس کی ہیر نے پاکستانی رانجھے کو اپنے ہاتھوں سے چوری کھلائی ہوگی..... تو ایسی کوئی بات نہیں۔ میں سلیم اختر ہوں، مستنصر حسین تارڑ نہیں!

آرائشِ خمِ کاکل

ماریشس کے قیام کی آخری رات۔

ایک بہت بڑے اور فرانسیسی نام والے ہوٹل میں ہم مندوبین کے اعزاز میں شاندار عشائیے کا اہتمام کیا گیا۔ سوئمنگ پول کا پانی روشنیوں میں جھلملا رہا تھا۔ ماریشس کی تقریباً سبھی قابل ذکر ہستیاں موجود تھیں۔ پول سے ذرا فاصلہ پر یورپین ٹورسٹ بڑی دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے بلکہ بعض نے تو تصویریں بھی بنانی شروع کر دیں۔ محبت بھری گرم جوشی سے ہمارے بارے میں کلماتِ خیر ادا کیے جا رہے تھے۔ سووینئر زدیئے گئے اور پھر مِنی مشاعرہ۔

میرے کان اگرچہ تقریریں اور (اردو، انگریزی، فرانسیسی میں) نظمیں سن رہے تھے مگر

آنکھیں اس لڑکی کو دیکھ رہی تھیں جو انتظامات کے سلسلے میں اِدھر اُدھر اونچی ایڑی پر ٹک ٹک کرتی پھر رہی تھی۔ کالا نمک بعض اوقات کتنا کشش انگیز ہو سکتا ہے اس کا اندازہ اسے دیکھ کر ہوا۔ باقی چیزوں کی کشش کا اندازہ بھی ہو رہا تھا، بس میر حسن کے اس شعر میں (تصرف کے بعد) کا منظر تھا:

اِدھر سے اُدھر آتیاں جاتیاں
پھریں اپنے جوبن کو دکھلاتیاں

وہ ہماری میز پر کئی مرتبہ آئی اور میں اس کے بالوں سے مبہوت سا ہو کر رہ گیا، اتنے زیادہ سیاہ اور اتنے چمکیلے بال کہ ان پر نائلون کا گمان ہو، خیر سیاہ چمکیلے بال اتنے نایاب نہیں۔ جس چیز نے مجھے متاثر کیا وہ آرائشِ گیسو کا اسلوب تھا۔ بے حد چھوٹی چھوٹی مینڈھیاں آپس میں گندھی شانوں پر بکھریں۔ عجب دیدنی منظر تھا۔

تقریب کے بعد فاروق رجل، خالق بوچا اور مصور حسین ایڈن (جنہوں نے مجھے ایک خوبصورت پینٹنگ کا تحفہ دیا) کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ وہ پھر پاس سے گزری، میں نے ان سب کی توجہ اس کے بالوں کی طرف مرکوز کی۔

''کیا خوبصورت بال ہیں۔''

پیشتر اس کے کہ میں منع کرتا، فاروق رجل نے شرارت سے مسکرا کر اسے مخاطب کیا۔

''ہیئر! دس جنٹلمین وانٹس ٹو......''

وہ خوشدلی سے مسکرا کر پوچھتی ہے ''یس سر!''

وہ متوقع نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی اور شرارت بھری نظروں سے مسکراتے ہوئے باقی مرد لوگ بھی مجھ ہی کو دیکھ رہے تھے۔ اب سچ بولے بغیر گزارہ نہ تھا۔

میں نے پوچھا ''یہ بال اصلی ہیں کہ وِگ ہے؟''

ہنس کر بولی ''یہ میرے ہی ہیں، کیوں کیا خرابی ہے؟''

''نہیں! نہیں! خرابی نہیں۔ میں نے تو اتنے خوبصورت بال دیکھے ہی نہیں۔ ایسے سیاہ چمکیلے اور ایسا خوبصورت ہیئر اسٹائل......'' میں جس طرح عام زندگی میں تیز تیز بولتا ہوں اسی طرح میں نے تیز بول کر پانچ منٹ کے اندر قصیدہ در مدح گیسوئے سیاہ وطرح دار کہہ ڈالا۔ تعریف ہر عورت کو اچھی لگتی ہے خواہ وہ ماریشس کی لڑکی ہی کیوں نہ ہو (سوائے بوائے فرینڈ کے وہ بھی اگر ہوا تو) وہ تعریف سن کر صحیح معنوں میں کھلی جا رہی تھی۔ جتنے الفاظ میں نے قصیدہ کہنے میں صرف کیے اتنے ہی الفاظ میں اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔ وہ ہنستی بھی اچھی لگ رہی تھی!

تقریب کے اختتام پر ہم سب ایک دوسرے سے رخصت ہوتے ہیں۔ ہوٹل اتنا بڑا تھا کہ میں باہر جانے کا راستہ بھول گیا اور کھڑا سوچ رہا تھا کہ کون سا راستہ باہر لے جائے گا۔ وہ ادھر سے گزری، مجھے کھڑے دیکھا تو آ کر پوچھا ''کیا ہوا؟''

میں بتاتا ہوں ''باہر کا راستہ نہیں مل رہا۔''

وہ کہتی ہے ''چلو میں چھوڑ آتی ہوں۔''

میں کہتا ہوں ''تم مصروف ہو، مجھے راستہ سمجھا دو۔''

وہ میرا ہاتھ تھام لیتی ہے۔ ''نہیں میں کار پارکنگ تک چھوڑ آتی ہوں۔''

وہ مجھ سے میرے بارے میں پوچھتی ہے۔ ظاہر ہے کہ پاکستان، لاہور، سرسید احمد خاں اور سیمینار اس کے لیے نئے نام ہیں۔ پھر اپنے بارے میں بتاتی ہے۔ ماں ہے، بہنیں ہیں، ہوٹل اچھا ہے، تنخواہ معقول ہے۔

کار پارکنگ پر کھڑی وہ خاصی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہتی ہے۔ وہ میری کار کے ڈرائیور پر نگاہ ڈالتی ہے جو دروازہ کھولے منتظر کھڑا ہے۔

''اچھا رخصت!''

میں مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہوں۔ وہ میرا ہاتھ تھام کر پنجوں کے بل اونچی ہو کر گال پر پیار کرتی ہے۔ ''یو آر اے رئیل جنٹل مین۔'' بھرپور مسکراہٹ ''یو ہیو میڈ مائی ڈے۔ ار۔ نو...... ڈے بٹ نائٹ۔'' بھرپور ہنسی۔

وہ مڑتی ہے۔

میں جاتی کو دیکھ رہا ہوں، اسے اور اس کے خوبصورت سیاہ چمکیلے بالوں کو، بلکہ ابھی تک دیکھ رہا ہوں۔ اندیشہ ہائے دور و دراز!

⌘⌘⌘⌘⌘⌘⌘⌘

ڈنمارک

گہرے نیلے پانیوں کی جل پری

''بہار، دُھند کا پردہ اُٹھا رہی ہے
دعوتِ نظارہ دیتے خوبصورت مناظر دکھانے کو
سفر شرطِ حیات ہے
گردشِ خون مدھم ہے
سورج کا بلاوا، مہک پھولوں کی
گرما کی نرم گام ہوا
اٹھو! باہر نکلو، بادبان تان لو
زندگی سفر ہے''
(ہانس کرسچین اینڈرسن)

بڑا بول

''اگر ارم کی شادی ملک سے باہر ہو جائے تو کیا اسے باہر بھیج دو گے؟'' پروفیسر حق نواز نے ایک مرتبہ پوچھا تھا، جس پر میں نے ترت جواب دیا ''ملک سے باہر؟ میں تو اسے اقبال ٹاؤن سے بھی باہر بھیجنے کا روادار نہیں۔'' بڑا بول آگے آیا، ارم بیاہ کر ڈنمارک چلی گئی اور اب میں اسی سے ملنے جا رہا تھا۔

میں ویران سڑک پر، کوٹھی میں ڈنمارک کے سفارت خانے کے سامنے کھڑا ہوں، فروری کی آخری تاریخیں ہیں مگر رات کے پچھلے پہر خاصی خنکی ہے۔ ٹھنڈی ہوا سے جسم میں جھرجھری سی دوڑ جاتی ہے۔ دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈال لیتا ہوں۔ آسمان پر نگاہ ڈالتا ہوں۔ ستارے چمک رہے

ہیں، کہکشاں جورات کے آغاز میں آسمان کے درمیان میں ہوگی، اب سفیدے کے سرکشیدہ درختوں میں الجھی ڈور کی مانند ہے۔ پورا منہ کھول کر جماہی لیتا ہوں، کچی نیند آنکھوں سے پانی بن کر بہہ رہی ہے۔ جس بیٹی کو باپ اقبال ٹاؤن سے باہر بھیجنے کا سوچ بھی نہ سکتا تھا، اسے ملنے ڈنمارک جانے کے جتن کر رہا تھا۔

ڈنمارک چھوٹا ملک ہے۔ اسی مناسبت سے چھوٹا سا سفارت خانہ مگر پابندیاں سب سے زیادہ۔ ہفتہ میں صرف دو دن ویزے کے سلسلہ میں درخواستیں لی جاتی ہیں۔ ایک دن میں بمشکل اٹھارہ بیس امیدوار بھگت سکتے ہیں۔ اگر دو دن میں کچھ نہ بنا تو پھر تشریف لائیے اگلے ہفتہ۔ لوگ تین چار بجے صبح سویرے قطار میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس لیے مجھ جیسا شخص بھی جس نے کبھی صبح اٹھ کر اس امر کی بذاتِ خود تصدیق نہ کی کہ کیا واقعی سورج مشرق ہی سے نکلتا ہے یا اہلِ مشرق کو بے وقوف بنانے کی یہ بھی مغربی استعمار کی ایک سازش ہے، اذانوں سے پہلے سفارت خانہ کے سامنے پہنچ گیا مگر یہ دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ مجھ سے بھی پہلے درجن بھر لوگ موجود تھے۔ باتیں شروع ہوئیں تو ایک دو نوجوانوں نے بتایا کہ وہ کھاریاں اور جہلم سے آئے ہیں، رات بھر سفر کیا، اب سیدھے سفارت خانے آئے ہیں۔

بالشت بھر ملک

میں جس برس (1996ء) ڈنمارک گیا، اسی برس اخبارات میں دو خبریں چھپیں۔ دنیا کے پچاس کرپٹ ترین ممالک کی فہرست شائع ہوئی جس کے بموجب پاکستان نمبر 2 اور ڈنمارک سب سے آخر میں یعنی پچاسویں نمبر پر تھا۔ ایک اور جائزہ یورپ کے مہنگے ترین ممالک کے بارے میں تھا، یہاں ڈنمارک سرفہرست تھا۔ اس میں یہ بات بھی شامل کرلیں کہ ڈنمارک میں ہر شخص پچاس فیصد انکم ٹیکس ادا کرتا ہے (تاجروں کے لیے لمحۂ فکریہ) ہمارے چھیالس روپے فی ڈالر کے مقابلے میں ان کے پونے چھ کرونا ڈالر کے مساوی تھے۔ اس سے وہاں کی اقتصادیات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ڈنمارک یورپ کے نسبتاً چھوٹے ممالک میں شمار ہوتا ہے، یوں سمجھیے کہ پنجاب جتنا بھی نہ ہوگا۔ اُدھر امریکہ، برطانیہ اور کینیڈا جیسی شہرت بھی نہیں۔ شاید اسی لیے مدت تک پاکستانی اسے دریافت نہ کرسکے۔ یہ تو کہیں چھٹی ساتویں دہائی میں جہلم، کھاریاں اور سیالکوٹ کے چند کولمبس غلطی سے وہاں جا پہنچے۔ جب پاکستانیوں نے یہ پرامن اور خوشحال خطہ دریافت کیا تو پھر اگلے بیس برس میں کثیر تعداد میں ڈنمارک جا پہنچے۔ تب وہاں کی حکومت کو ہوش آیا کہ اگر چندے یہی صورتحال رہی تو یہ

ایشیائی ڈنمارک کی غالب اکثریت بن جائیں گے، چنانچہ براہ راست آبادکاری ممنوع قرار پائی۔ اب صرف شادی کی صورت ہی میں آباد ہوا جاسکتا ہے۔

پروفیسر حق نواز اور ٹی وی پروڈیوسر شوکت زین العابدین کے بھائی الفت حسین بھی ستّر کی دہائی کے آبادکاروں میں شامل تھے۔ ڈنمارک کی شہریت حاصل کیے مدت ہو چکی ہے۔ بچوں نے وہیں تعلیم حاصل کی۔ اب یہ گھرانہ اہل زبان کی مانند ڈینش بولتا ہے۔ 1994ء کی سردیوں میں الفت حسین دونوں بیٹوں تبسم حسین اور قیصر عباس کے لیے پاکستان سے بہوئیں لے گئے۔ میری بیٹی ارم اور حق نواز کی بیٹی شبنم۔ اور اب دو برس بعد بیٹی سے ملنے کے لیے میں پی آئی اے کے جمبو جیٹ میں آٹھ گھنٹے کی مسلسل پرواز کے لیے پرتول رہا تھا۔

بسیرے دی تگڑی جورو

جن اصحاب نے پانچویں اور چھٹی دہائی میں باقاعدگی سے انگریزی فلمیں دیکھی ہیں، انہیں یاد ہوگا کہ یورپ کے بارے میں بعض قدیم تاریخی فلموں میں وائکنگ (Viking) کی فلمیں بھی ہوتی تھیں۔ سر پر دو ''سینگوں'' والے خود پہنے، قوی الجثہ اور دراز قد، بے جگری سے لڑتے، برطانیہ اور فرانس کے کلچرڈ لوگوں کے مقابلہ میں یہ وحشی سمجھے جاتے تھے اور فلموں میں وحشی ہی دکھائے جاتے تھے۔ نازک اندام دوشیزاؤں کو اٹھا لے جاتے اور ان کے ساتھ وہ سب کچھ کر گزرتے جو نازک اندام دوشیزاؤں کے ساتھ نہ کرنا چاہیے، کھانے پر یوں ٹوٹ پڑتے کہ ایک ہاتھ میں شراب کا جگ تو دوسرے میں مُسلّم ران۔ یہ وائکنگ آج کے سیکنڈے نیویا کے قدیم باشندے تھے اور ان علاقوں کے لوگ اسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی لمبی تڑنگی عورتیں کافی سے زیادہ تنومند ہیں۔ یورپ کے دیگر ممالک یا امریکہ میں خاوندوں کے ہاتھوں بالعموم بیویاں پٹتی ہیں جبکہ ڈنمارک، ناروے اور سویڈن میں معاملہ برعکس ہے یعنی خاوندوں کی دھنائی ہوتی ہے بلکہ چند برس قبل تو ڈنمارک کے ایسے ہی مظلوم شوہروں نے ''بیوی سے بچاؤ'' قسم کی ایک تنظیم بھی بنا ڈالی تھی۔ غالباً عورتوں کی جینز میں وائکنگ اثرات ہنوز قوی تر ہیں۔ میں ڈنمارک کی چوڑے شانوں، مضبوط ہاتھوں اور پختہ پنڈلیوں والی عورتوں کو سائیکل پر دیکھ کر سوچتا، ان میں کوملتا جیسی کوئی بات نہیں، اگر یہ خاوند کی ڈھول جھاڑنے پر آتی ہوں گی تو احتیاطاً ایک آدھ پسلی بھی جھاڑ دیتی ہوں گی۔ میرا ایک افسانہ ہے ''بسیرے دی جورو'' خاوند کو پیٹنے والی بیوی کے بارے میں ہے اور اس افسانہ میں بھی میں نے ''بسیرے دی تگڑی جورو'' کا سلسلہ وائکنگ ہی کے ساتھ ملایا تھا۔ بس عورتوں کے چکر میں کچھ زیادہ ہی دور نکل گیا، ویسے بھی شوہر

خورمیموں سے سفرنامہ کا آغاز کوئی اچھا شگون نہیں۔ ہاں! وہی پرانا فارمولا، سفرنامہ کی ہنڈیا میں ان کا تڑکا ضرور لگایا جاسکتا ہوگا لیکن میں کبھی بھی اچھا کک نہ تھا، لہٰذا سفرنامہ نگار کو اسی کے منصب پر رہنے دیا جائے، اسے داروغۂ مطبخ نہ بنایا جائے۔

گہرے سمندروں کی نیلی جنت

میں تپتے گرم میدانوں کا باسی ہوں جہاں میلوں چلتے جاؤ مگر لینڈ سکیپ میں تبدیلی نظر نہ آئے گی اسی لیے مجھے پہاڑوں کے سلسلے، ان کے پہلو سے پھوٹتے جھرنے، خوابیدہ نشیب اور گہری وادیاں مسحور کرتی ہیں اسی طرح تاحدِ نگاہ پھیلا سمندر، اس کی گہرائی اور اس میں متحرک متنوع مخلوق اور لہروں کا خروش ہانٹ کرتا ہے۔ موقع ملے تو فرازِ کوہ سے ابر برشگال کا مکالمہ سن سکتا ہوں اور تنہا ساحل پر لہروں سے باتیں کرسکتا ہوں۔

ڈنمارک مجھے اس لحاظ سے بہت اچھا لگا کہ یہاں اور کسی چیز کی تو کمی ہوسکتی ہے مگر سمندر کی نہیں۔ ڈنمارک بذاتِ خود 527 جزائر پر مشتمل مجمع الجزائر ہے۔ بعض جزیرے بڑے تو بعض چھوٹے بلکہ بعض بالکل ننھے منے سے، کسی بڑے جزیرہ کی اولاد کی مانند، سمندر کی نیلی ردا پر چھوٹے بڑے دھبوں اور چھینٹوں کی مانند! سب سے بڑا جزیرہ محض 2700 مربع میل ہے جبکہ چند میلوں کے چھوٹے چھوٹے جزیرے بھی کثیر تعداد میں ہیں۔ 445 جزیرے تو سمندر کی اولاد ہیں جبکہ بقیہ 82 جزائر بڑی بڑی جھیلوں، وسیع پانی والے دریاؤں اور آبنائے وغیرہ میں ہیں۔ جزائر کا یہ تنوع سمجھنا سفرنامہ کو جغرافیہ کے سبق میں تبدیل کردے گا، لہٰذا اس سے باز رہتا ہوں۔

چہار اطراف سے پانی میں گھرے ڈنمارک میں خشکی صرف 16625 مربع میل ہے۔ آبادی نصف کروڑ سے کچھ زائد اور یہ آبادی بھی صرف ان بیس فیصد جزائر پر ہے جو اتنے بڑے ہیں کہ آبادی کا بوجھ برداشت کرسکیں لیکن بقیہ اسّی فیصد غیر آباد جزائر، بے نام، بے زیست اور لاتعلق، لہروں کے خروش میں مگن، صرف نقشے میں وجود رکھنے والے جبکہ بعض بالشت بھر کے تو نقشے میں بھی ظاہر نہ کیے جاسکیں۔ سردیوں میں انچوں نہیں بلکہ فٹوں کے حساب سے برفباری ہوتی ہے۔ ایسی برفباری جس کا ہم 40-50 کی گرمی میں زیست کرنے والے افراد تصور بھی نہیں کرسکتے...... اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں:

مگر تیرے تصور سے فزوں تر ہے وہ نظارہ

سردی کے شباب میں جھیلیں، دریا بلکہ بعض اوقات تو سمندر بھی برف کی چادر اوڑھ کر تہ آب خوابیدہ ہو جاتا ہے۔ یوں سمندر نیلی پوشاک اتار کر سفید چولا پہن لیتا ہے۔ تاحد نگاہ برف کا

سمندر جس میں بعض اوقات جہاز تک پھنس جاتے ہیں۔ اسی سفید سمندر میں ڈنمارک کے متعدد غیر آباد جزیرے بھی یخ بستگی کے عالم میں ٹھٹھر ٹھٹھر کر زیست کرتے ہیں، پھر گرمی دستِ شفقت پھیرتی ہے۔ سمندر پر سے برف کے چھلکے اتر جاتے ہیں، تب جزیرے نمایاں ہوجاتے ہیں۔ یخ زمین جھرجھری لے کر بیدار ہوتی اور خوش نما پھولوں والی سبز چادر اوڑھ لیتی ہے۔ آبی پرندوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ یہ فطرت کے سیاح ہیں۔ کیمرہ، دوربین، ٹرانسسٹر اور کوک سے بے نیاز! انہیں قلم کی بھی حاجت نہیں کہ انہوں نے میری مانند بور سفرنامہ بھی قلم بند نہیں کرنا......

پُل !!

ڈنمارک کو مجمع الجزائر یا جزیروں کا ملک کہنا غلط نہ ہوگا لیکن وہاں کے لوگوں نے ملک کو جزیروں میں منقسم نہ رہنے دیا بلکہ جہاں تک ممکن ہوسکا پلوں کے ذریعے جزائر کو باہم ملانے کا مشکل کام کر دکھایا مشکل اس لیے کہ زمین کی وجہ سے دریا پر پل بنانا نسبتاً آسان جبکہ ستون یا اور کسی طرح کی سپورٹ کے بغیر پل بنانا بہت مشکل ہے۔ امریکہ میں نیویارک اور نیوجرسی کی سٹیٹس کو ملانے والا Suspension برج اس انداز کی فنی مہارت کی خوبصورت مثال ہے۔ یہ پل جس کا نام جارج واشنگٹن برج ہے، تیز بہاؤ والے فراخ دریائے ہڈسن پر تعمیر ہوا تھا۔ سسپنشن برج کو الٹی محراب یا معکوس D سمجھ لیجیے، امریکہ میں اس انداز کے متعدد پل تعمیر ہوئے ہیں سو ڈنمارک میں بھی اس کا انداز 1.06 میل لمبا lille Baltsbro پل 1970ء میں تعمیر کیا گیا۔ یہ Jutland اور Funen کو ملاتا ہے۔ 1943ء میں تعمیر کیا گیا 1335 گز لمبا Monsbroen پل بھی فنی مہارت کا نمونہ ہے۔

ڈنمارک جیسے ملک میں جو ہر طرف سمندر سے گھرا اور جھیلوں سے بھرا ہو زمین کا مسئلہ ہمیشہ رہتا ہے، چنانچہ 1864ء میں سمندر سے زمین حاصل کرنے کے منصوبہ کا آغاز ہوا یوں خاصی زمین سمندر سے چھین لی گئی۔ یہ میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اس امر کا احساس کرایا جاسکے کہ عزم و ہمت اور علم سے انسان سب کچھ کرسکتا ہے۔

پرواز ہے دونوں کی......

اسلام آباد سے کوپن ہیگن کی مسلسل آٹھ گھنٹے کی فلائٹ پی آئی اے کے معیار کے لحاظ سے بری نہ تھی، تاہم بیٹھے بیٹھے ٹانگیں اکڑ جاتی ہیں اور گھٹنے بوجھل ہوجاتے ہیں۔ ایسے میں جی چاہتا ہے کہ آنکھیں موند کر سر کسی کے کندھے پر ٹیک دیا جائے۔ اگر کسی کے کندھے کی سہولت حاصل نہ ہو تو پھر

سیٹ کی پشت پر ہی سہی۔ اکڑی ٹانگیں پھیلا دی جائیں اور کوئی (کوئی بھی) تلووں کو سہلائے اور یوں اینٹھے اعصاب سے تھکن نچوڑ لے۔

اتفاق سے نہ کوئی اچھا ہم سفر اور نہ ہی حسین مسافر...... بوریت ہی بوریت! جیمز بونڈ کی "Golden Eye" چل رہی ہے...... ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو، کے مصداق دلچسپ حصے حذف کیے گئے ہیں۔ مزید بوریت! میں کھڑکی سے باہر دیکھتا ہوں تمیں ہزار فٹ کی بلندی سے نیچے کچھ نظر نہیں آتا۔ بادل بھی نہیں۔ ہوائی جہاز ساکن سا محسوس ہوتا ہے اور پھر کہیں صدیوں بعد ایئر ہوسٹس کی غیر شخصی آواز "Ladies and Gentlemen we are about to land at Copen Hagen where........" میری مشتاق آنکھیں کھڑکی سے چپکی ہیں۔ طیارہ بتدریج نیچے ہوتا جا رہا ہے، پھر آسمان کی نیلاہٹ کی جگہ سمندر کی نیلاہٹ لے لیتی ہے۔ طیارہ کسی دیومالائی پرندہ کی مانند بازو پھیلائے لمحہ بہ لمحہ نیچے آتا جا رہا ہے، اب رن وے پر اور پھر ساکت۔

مگس...... باغ میں

حسب روایت ہم سب پاکستانی طیارے کے دروازے کھلنے سے پہلے ہی گویا عالم اضطراب میں کھڑے ہو جاتے ہیں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ جب تک دروازہ نہ کھلے ہم باہر نہیں جا سکتے اور بالآخر باہر نکل ہی جائیں گے۔ ہمیں روک کر ایئر ہوسٹسوں نے ہم سے کیا حاصل کرنا ہے......؟

سب پاکستانی ایک طرف جمع کیے جاتے ہیں، پھر حکم ملا سب اپنے اپنے پاسپورٹ اپنے ہاتھوں میں رکھیں۔ ہر ایک کا پاسپورٹ گویا محدب شیشے پر رکھ کر دیکھا جاتا ہے اور کیوں نہ دیکھیں کہ یہ پی آئی اے کی فلائٹ ہے اور ہم سب پاکستانی ہیں، اس لیے کچھ بھی کر گزریں گے مگس کو باغ میں جانے نہ دو!

کوپن ہیگن کا ایئر پورٹ جو باہر سے خاصا چھوٹا نظر آتا تھا، اندر داخل ہونے پر وسیع و عریض نظر آیا۔ ایئر پورٹ کیا اچھی خاصی انارکلی آباد تھی۔ میں نے سامان ٹرالی پر لادا اور چلا Exit کی جانب...... مگر نہیں، ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں، کے مصداق آخری مرحلہ امیگریشن پر ایک کارڈ کا پُر کرنا ہے جس میں اپنے اور فلائٹ کے کوائف درج کرنا ہوتے ہیں۔ مجھے تبسم نے یہ کارڈ لاہور بھیج دیا تھا تاکہ رش کی وجہ سے تاخیر نہ ہو، لہٰذا میں نے اپنا کارڈ کاؤنٹر پر دیا اور مڑنے کو تھا کہ ایک نوجوان نے اپنا کارڈ میرے آگے کر دیا۔ میں اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہوں "مجھے انگریزی نہیں آتی، اسے بھر دیں۔" سمارٹ نوجوان نے ہمفری بوگارٹ اور انگرڈ برگ مین کی مشہور فلم "کاسابلانکا" کے پوسٹر والی

بش شرٹ پہن رکھی تھی، ساتھ ہی نئی جین اور لش لش کرتے شوز...... مگر میرا بھائی، سادہ سے کارڈ پر نام پتہ جیسی چار باتیں لکھنے سے قاصر تھا۔ اگرچہ ایسے میں ہر شخص جلدی میں ہوتا ہے لیکن میں نے خاموشی سے اس کا کارڈ پُر کر دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ نوجوان ان لاتعداد نوجوانوں کی مثال تھا جو کھاریاں اور جہلم کے مضافات اور گاؤں میں پلتے ہیں۔ رشتہ داروں میں سے کوئی ڈنمارک جا پہنچا، بچے جی کی شادی اس ان دیکھی کزن سے ہو گئی جو کوپن ہیگن میں پیدا ہوئی اور پنجابی کے مقابلے میں ڈینش زیادہ روانی سے بولتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے صحبت ناجنس ثابت ہوتے ہیں۔ ان رشتوں سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ واقعی شادیاں آسمانوں پر ہی ہوتی ہیں ورنہ کہاں کھاریاں اور کہاں کوپن ہیگن۔

میں بھیڑ میں راستہ بناتا جا رہا ہوں، مین گیٹ اور پھر باہر...... جہاں ارم، تبسم، ان کے والد الفت حسین اور والدہ پروین، بھائی قیصر اور اس کی دلہن شبنم، بہن ناہید، نورین اور شوہر افضل، بیٹی عبیرہ اور الفت حسین صاحب کے دوست ایوب صاحب مع فیملی...... ہاتھوں میں گلدستے اور لبوں پر خیر مقدمی مسکراہٹوں کے پھول لیے، جس بیٹی کو میں علامہ اقبال ٹاؤن سے باہر بھیجنے کا روادار نہ تھا، اس سے دو سال بعد کوپن ہیگن کے ایئر پورٹ پر گلے مل رہا تھا۔ سب مجھ سے سفر، گھر اور لاہور کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ میں رندھے گلے سے ہوں ہاں کر رہا ہوں۔ جوانی میں، میں نے خود کو جذباتی لحاظ سے خاصہ سرد اور سخت بنا رکھا تھا مگر اب بڑھتی عمر، دائمی بلڈ پریشر اور نیوروپیتھی نے زود حس بنا دیا ہے۔ ارم کو گلے لگایا تو آنسو نہ روک پایا۔

خوابیدہ شہر!

ڈنمارک اور اس کے دارالحکومت کی عمر اور تاریخ ہزار برس بھی نہیں۔ کوپن ہیگن کا ڈینش نام Coben Haven ہے۔ قدیم زمانہ میں یہ بحری تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا "کوبن ہیون" کا مطلب ہے تاجروں کا آسمان/ جنت! آبادی پندرہ لاکھ نفوس پر مشتمل۔ ایک لاکھ کے قریب پاکستانی، پاکستانیوں کے بعد افریقہ کے ملک صومالیہ اور ترکی کے مسلمان، مگر کل تعداد چند ہزار سے زائد نہیں۔ چند سو ہندو اور سکھ خال خال!

کار سڑک پر مچھلی کی مانند تیرتی جا رہی ہے۔ میں باتیں بھی کر رہا ہوں اور باہر بھی دیکھ رہا ہوں۔ جو دیکھ رہا ہوں اس سے مجھ پر کوئی خاص رعب نہیں پڑتا۔ نیویارک اور مین ہٹن کو چھوڑیئے جہاں سکائی سکریپر ایک دوسرے کا آئینہ نہ بنیں تو پھر آسمان، بادلوں اور طیاروں کے مناظر شیشوں کی کھڑکیوں میں منعکس ہوتے ہیں۔ یہ کوپن ہیگن تو مجھے پچھلے پہر کی دھوپ میں اونگھتا ہوا محسوس ہو رہا

تھا۔ صاف ستھری سڑکوں پر کاریں گویا سلوموشن میں ہوں۔ نہ اسکوٹروں کے سائلنسر کا شور، نہ ویگنوں کی ریسیں، نہ ریڑھوں کی کھڑکھڑاہٹ، نہ گھوڑوں کی لید اور نہ ٹرکوں اور لاریوں کا سیاہ کثیف اور بدبودار دھواں...... نیویارک تو دور کی بات یہ تو اپنے لاہور جیسا بھی نہ نکلا...... مجھ لاہوری کو لگا میں کرفیو لگے شہر سے گزر رہا ہوں۔

سائیکل! سائیکل!!

ڈنمارک کو اگر سائیکل کنٹری، کوپن ہیگن کو سائیکل سٹی اور ڈینش قوم کو سائیکل نیشن کہیں تو یہ غلط نہ ہوگا۔ غلط کیا یہ تو اتنا درست ہوگا کہ سب کچھ سن کر بھی یہ احساس باقی رہ جائے گا! ''حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا'' پورے یورپ بلکہ پوری دنیا میں ڈنمارک کی یہ منفرد خصوصیت ہے کہ یہاں سبھی سائیکل سوار ہیں چنانچہ سڑکوں کے متوازی جداگانہ سائیکل ٹریک بنائے گئے ہیں۔ اسی لیے جہاں افراد جسمانی لحاظ سے فٹ رہتے ہیں وہاں پٹرول کی بچت اور آلودگی سے پاک صاف ہوا اور ستھرا ماحول بونس میں۔ پطرس بخاری ڈنمارک آئے ہوتے تو انہوں نے سائیکل پر مضمون کسی اور ہی اسلوب میں قلم بند کیا ہوتا چلیں سائیکل پر توجہ نہ دیتے مگر سائیکل سوار سے صرفِ نظر بھی ممکن نہ ہوتا۔ میں عمر بھر سائیکل سوار رہا ہوں اور اسی لاہور میں سارا سارا دن سائیکل پر لاہور کا گز بنا پھرتا تھا۔ پھر کمر کی کثرت کار کی وجہ سے ڈسک سلپ ہوئی۔ تب سے سائیکل چھنی، آوارہ گردی ختم ہوئی اور خانہ نشینی کا آغاز ہوا، لہٰذا ڈنمارک کی سائیکلیں اور ان سائیکلوں کی سواریاں دیکھ کر میری آنکھوں کی خوشی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے...... اور کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا؟

بھرے بازوؤں والی، سڈول چمکیلی رانوں والی، پنڈلیوں کی ڈوبتی ابھرتی مچھلیوں والی، ٹی شرٹ میں پھنسی چھاتیوں والی، ہوا میں اڑتے سنہری بالوں والی...... مجھے اندازہ نہ تھا کہ سائیکل اتنے جمالیاتی مناظر مہیا کرسکتی ہے۔ ایسے جمالیاتی مناظر جن میں شرابور جنس عجیب مینا کاری کرتی ہے۔ مرزا غالب نے کلکتہ میں وکٹورین عہد کی ٹخنوں تک لمبی سکرٹ والی میمیں دیکھیں تو عمر بھر انہیں بھلا نہ پایا، اگر وہ آج کے ڈنمارک میں بکنی والی حسینہ کو سائیکلنگ کرتے دیکھتا تو بے اختیار نعرہ زن ہوتا:

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے

نظارہ پرست غالب نے یہ بھی کہا تھا:

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

غالب نے ڈنمارک میں دوسرے مصرع میں ''رخ'' کی جگہ ''تن'' لکھا ہوتا۔ پردہ پوشی کی بجائے پردہ سوختنی کا کام کرنے والی نگاہ مست نے واشگاف حسن سے نہ جانے کیسے کیسے اندیشہ ہائے دور دراز وابستہ کرنے تھے۔ غالب نہیں مگر اس کا مداح سیاح غالب ہی کا مصرع دُہرا رہا تھا:

حسنِ بے پردہ خریدارِ متاعِ جلوہ ہے!

خوش منظر

الفت حسین، خوش منظر ماحول میں، ایک دیدہ ہاؤسنگ پراجیکٹ میں نیلے رنگ کے چار منزلہ بلاک کی تیسری منزل میں رہتے تھے۔ ان کے فلیٹ کی بالکنی سے نیچے جھانکنے پر، پچھواڑے میں، سرسبز و شاداب گھاس کا سمندر۔ جس میں تیز ہوا سے گھاس کی سبز موجیں ابھرتی اور ڈوبتی رہتیں، ہرے سمندر میں کھیلتے بچے راج ہنسوں کے راج دلارے لگتے۔ تیز ہوا سے جھولتی سبز گھاس میں بچوں کے اُڑتے سنہرے بال! مجھے پہلی مرتبہ اندازہ ہوا کہ تازہ گھاس کی مہک کے اعصاب پر کتنے خوشگوار اثرات ہوتے ہیں۔ رات کی خاموشی میں جب تیز ہوا گھاس میں سرسراہٹ پیدا کرتی تو عجب طرح کی آواز میں تبدیل ہوجاتی۔

ہم پاکستانی گندے ماحول میں پیدا ہوتے ہیں اور ''صفائی نصف ایمان ہے'' جیسی احادیث کے باوجود گندگی کے خوگر ہوجاتے ہیں اتنے کہ اپنی گلی محلّہ کو خود بھی ہر ممکن طریقہ سے گندا کرنے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ مثالیں دینے کی ضرورت نہیں۔ گھر کی کھڑکی کھول لیجیے، تازہ ترین بدبودار ہوا سے ثبوت مل جائے گا۔ اس کے برعکس ڈنمارک میں، میں یہ دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ وہاں زمین کے خالی قطعوں پر اگر پھول نہ کھلے تھے تو گھاس اُگی تھی۔ سفید، سرخ، گلابی اور زرد رنگ کے گلاب اور گہرے سبز رنگ کی بیلیں دیواریں ڈھانپے ہوئے تھیں، شاید ہی کوئی ایسا گھر ہو جس کی کھڑکیوں یا بالکنیوں میں پھولوں کی بیلیں، گملے یا گلدستے نظر نہ آئیں۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں بچوں کے گندے پوتڑے لٹکے ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے ایک دوست سے پھولوں کی فراوانی کا ذکر کیا تو متاثر ہوئے بغیر فرمایا ''ان...... یورپین نے یہ سب کچھ اسلام سے لیا ہے۔'' بجا فرمایا میرے یار نے۔ ہم نے اپنی تمام خوبیاں دوسروں کو دے کر اپنے لیے گندگی، کرپشن، بددیانتی، سازش، جھوٹ اور ملمع سازی پسند کر لی۔

بلّو دا گھر

ارم کے سسر الفت حسین ڈنمارک میں پاکستانی آبادکاروں کے اولین لہر سے تعلق

رکھتے ہیں۔ حاجی اور باریش ہونے کے باوجود مزے کے آدمی اور بلا کے فقرے باز ہیں۔ حق نواز اور الفت حسین دونوں ہی حسِ مزاح کے حامل ہیں۔ میں جن دنوں وہاں تھا تو ان کا تکیہ کلام تھا ''بِلّو دا گھر''۔ ''کہاں جا رہے ہیں؟'' ''بِلّو دے گھر۔'' ''کہاں سے آ رہے ہیں؟'' ''بِلّو دے گھر۔''

الفت حسین ان کمیاب لوگوں میں ہیں جو مذہبی ہونے کے باوجود بھی کھل کر قہقہہ لگا سکتے ہیں اور اپنی نیکی کو دوسروں کے اعصاب پر سوار نہیں کرتے۔ المختصر یہ مرد نیکوکار بیوی، بیٹیوں، بیٹوں اور بہوؤں کے ساتھ یوں ہنستے کھیلتے اور گپ لڑاتے گویا حلقۂ یاراں میں ہوں۔ میں نے زیادہ تر سیر الفت صاحب کے ساتھ کی اور انہیں پُر بہار اور ہم سخن پایا۔ میرے اپنے گھر کا ماحول بھی بے تکلفانہ اور آزادانہ ہے۔ میں نے بیوی اور بیٹے، بہو اور بیٹیوں کو ہمیشہ دوست سمجھا، نہ میں مجازی خدا بنا اور نہ اولاد کے لیے ''آدم بو'' چلانے والا دیو...... مگر الفت حسین اس سلسلہ میں مجھ سے بھی بڑھ کر ثابت ہوئے اسی لیے خوشحال، مسرور اور مطمئن زندگی بسر کر رہے ہیں۔

قران السعدین

میرا چھوٹا بھائی خالد امریکہ میں رہتا ہے بلکہ اب وہ امریکی بن چکا ہے۔ چند برس قبل میں نے گرمیاں اس کے پاس گزاری تھیں۔ (ملاحظہ کیجیے میرا سفرنامہ امریکہ ''اک جہاں سب سے الگ'') اب جو میرا ڈنمارک جانا طے ہوا تو خالد نے جولائی کی دو ہفتے کی تعطیلات یورپ میں گزارنے کا پروگرام بنایا چنانچہ میرے ڈنمارک پہنچنے کے تین دن بعد خالد، بی بی اور چاروں بچے کوپن ہیگن آ گئے یوں کئی برس بعد ہم بھائی ملے۔ ارم بے حد خوش تھی کہ ابو اور چچا دونوں ہی اس کے گھر میں تھے۔ ننھی فرح اور اس سے بڑا فیروز اب بچپن کی حدود سے نکل آئے تھے جبکہ فوزیہ کالج میں پڑھ رہی تھی۔ فصیح کو شروع سے تیراکی سے دلچسپی تھی وہ اپنے سکول کے معروف تیراکوں میں شمار ہوتا تھا۔ میں نے پوچھا، کیا کر رہے ہو ان دنوں؟ خوش ہو کر بتایا ''پڑھائی کے علاوہ لائف گارڈ کا کام بھی کر رہا ہوں۔'' میں نے اسے ''بے واچ'' لائف گارڈ بننے کی دعا دی، جواب میں اس کی ہنسی دیدنی تھی۔ خالد سے اس کے ٹور کے بارے میں بات چیت ہونے پر اندازہ ہوا کہ مغرب میں سیاحت کے لیے کتنی سہولتیں حاصل ہیں۔ خالد نے ڈنمارک، فرانس، مراکو اور یونان جانا تھا۔ یہ پندرہ دن کا پروگرام تھا۔ ہر ملک میں ریل یا طیارہ کی سیٹیں اور ہوٹل تو بک تھے ہی ٹیکسی تک بھی دستیاب تھی۔ کہتے ہیں کہ مغرب والے ایک ٹوتھ پیسٹ لیتے ہیں اور دنیا کی سیر کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں تو یہ ٹریول ایجنٹس اور ٹور آپریٹرز کی

بدولت ہی ممکن ہو سکتا ہے۔

جل پری سے ملاقات

آپ آگرہ جا کر سب سے پہلے کیا کریں گے؟...... تاج محل دیکھیں گے، پیسا جا کر؟...... لیننگ ٹاور دیکھیں گے...... قاہرہ جائیں گے تو اہرام ہی دیکھیں گے۔ دنیا کے بعض بڑے، قدیم یا تاریخی شہروں کی بعض عمارات نے یوں عالمی شہرت حاصل کی کہ وہ ایک طرح سے ان شہروں کی شناخت کا باعث بن گئیں مگر کوپن ہیگن کی علامت کوئی قدیم تاریخی عمارت نہیں بلکہ ''جل پری'' (Little Mermaid) کا مجسمہ ہے جس کا اگر امریکہ کے آزادی کے مجسمہ کی طویل قامت سے مقابلہ کیا جائے تو یہ جل پری، آزادی کے مجسمہ کی بیٹی بلکہ پوتی نظر آئے گی لیکن کیا دلربا پوتی ہے!

اوڈینس (Odense) ڈنمارک کا چوتھا بڑا شہر ہے۔ اسی شہر میں ہانس کرسچین اینڈرسن نے زیست کی اور بچوں کے لیے وہ لازوال پری فسانے قلم بند کیے جنہیں عالمی سطح پر سراہا گیا۔ یہ ایسی کہانیاں ہیں جو ہمارے اندر خوابیدہ بچے کو بیدار کر دیتی ہیں اور ہم اسی تحیر اور مسرت سے کہانی پڑھتے ہیں جو کبھی ہماری خاصیت تھی مگر جسے علم، معلومات اور دنیاداری نے ہم سے چھین لیا۔ میں نے جل پری کی کہانی عمر کے اس دور میں پڑھی تھی جو اعصابیت، جذباتیت اور ان کے پیدا کردہ دن سپنوں سے مخمور ہوتا ہے۔ مدتوں مجھے جل پری اور رائیڈر ہیگرڈ کی ''شی'' نے ہانٹ کیا اور اب ساٹھ سے متجاوز ہونے کے بعد میں جل پری کے سامنے آیا تو کتابِ عمر رفتہ کے فرسودہ مگر فراموش ناکردہ صفحات گویا لو دینے لگے۔

ہانس کرسچین اینڈرسن ایک طرح سے ڈنمارک کی علامت سمجھا جاتا ہے اس کے آبائی شہر میں اس کا مکان یادگار کے طور پر محفوظ ہے۔ اسی شہر میں اس کا مجسمہ نصب ہے۔ اس کا ایک مجسمہ کوپن ہیگن میں بھی ایستادہ ہے۔ ویسے ڈنمارک نے عالمی شہرت یافتہ اور بھی کئی شخصیات پیدا کیں جیسے وجودیت کے فلسفے کا بانی کیر کے گار۔ جدید مصوری کا اہم پیش رو کوننگ۔ 1913ء میں مجسمہ ساز ایڈورڈ اریکسن نے ''لٹل میرمیڈ'' کا مجسمہ بنایا تو ساحل سمندر پر بکھرے پتھروں میں سے ایک بڑے پتھر پر جل پری ''بٹھائی'' گئی اور ہنوز وہیں بیٹھی ساحل سے دور افق کی جانب تکتی ہے، بچھڑے محبوب کو کھوجتی آنکھیں...... گردشِ شام و سحر کے درمیان!

مصوری اور سنگ تراشی کے بارے میں میری معلومات صفر ہیں لہٰذا مجسمے کی ماڈل کے بارے میں کچھ بتانے سے قاصر ہوں لیکن اتنا یقین ہے کہ وہ ماڈل یقیناً متناسب جسم اور تن نازک کی مالک ہونے کے ساتھ ساتھ بھولی بھالی صورت والی بھی ہوگی۔ ماڈل کی طرف اس بنا پر دھیان جاتا

ہے کہ مغرب میں پینٹنگ اور مجسّمے کے لیے تخیل کے برعکس زندہ جسم پر انحصار کیا جاتا ہے۔ بہر حال اس مجسّمے کی بدولت ماڈل امر ہوگئی...... تجھ میں پیدا کچھ نہیں دیرینہ روزی کے نشاں۔

جس طرح امریکہ کے آزادی کے مجسمہ سے طرح طرح کے استعارے، جنسی کنائے، لطیفے اور پھبتیاں منسوب ہیں، ''لٹل میرمیڈ'' بھی ان سے محفوظ نہیں بلکہ ایک مرتبہ تو کوئی دل جلا اس کی گردن ہی کاٹ کر لے گیا جس پر سارا ڈنمارک کراہ اٹھا! جولائی کی وہ دھوپ جو لاہور میں حبس کے ساتھ سمجھوتہ کر کے کثیف بدبودار پسینہ خارج کرتی ہے، ڈنمارک میں مہربان حسینہ کی مانند تھی۔ ساحل سیاحوں سے بھرا تھا اور وہ مناظر جو یورپ میں ساحلوں پر دیکھے جا سکتے ہیں، عام بھی تھے اور با افراط بھی۔ مغربی سارا سال جی جان سے محنت کرتے ہیں، لہٰذا وہ ویک اینڈ اور دو ہفتے کی وکیشن ہر ممکن طریقہ سے خوشگوار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سیر و سیاحت کو بالعموم جوڑے آتے ہیں مگر اکیلے اور اکیلیاں بھی معقول تعداد میں دستیاب ہوتی ہیں۔ یوں یہ سیاحت رومان اور شادی تک کا باعث بھی بن سکتی ہے جبکہ ہماری سیاحت زیادہ سے زیادہ سفرنامہ دے سکتی ہے جس میں جلے دل کے پھپھولے پھوڑے جا سکتے ہیں۔ پیارے قارئین! میں ساحل کے مناظر کی مزید تفصیلات سنسر کر رہا ہوں۔ آپ کا اخلاق درست رکھنے کے لئے میں فلم سنسر بورڈ کا رکن رہ چکا ہوں اس لیے اب اخلاق سدھار بذریعہ سنسر کی عادت ہو چکی ہے۔

کسی طرح دار ماڈل کی مانند جل پری بھی کیمروں کے نرغہ میں تھی۔ اردگرد چھبیلے پتھروں پر بیٹھ کر تو خیر سبھی تصویریں بنواتے ہیں، کچھ من چلے اس سے لپٹ کر تو کچھ جذباتی منہ چوم کر بھی تصویریں بنوا رہے تھے۔ اس کے اردگرد بھانت بھانت کے سیاحوں کی ٹولیاں، کیمرے گلے میں لٹکائے، پرنٹڈ ٹی شرٹس، رنگین بش شرٹس، جین، جیکٹ، نیکر، بکنی ہر لباس، انداز اور وضع کے سیاح! خاموش جل پری سب کو بے بصر آنکھوں سے تکا کرتی، مسکرائے بغیر، اسے جس کا انتظار ہے وہ ان سیاحوں میں نہیں ملے گا، وہ تو وقت کے گہرے پانیوں پر حباب آسا تھا۔

واپسی پر گھاس کے ایک قطعے پر ایک زندہ جل پری ٹانگ پر ٹانگ رکھے مطالعہ میں محو پائی۔ اس کمبخت کو غالباً یہ اندازہ نہ تھا کہ وہ تو خود قابل مطالعہ کتاب ہے یا پھر اسے احساس تھا اور اسی لیے سبز گھاس پر چتر کاری کا منظر پیش کر رہی تھی۔

تشنگی

اِدھر اُدھر گھومتے سیاح ہاتھوں میں بیئر کین لیے تھے۔ میں کس سے پیاس بجھاؤں؟ تشنہ لبی

اور تشنہ نگاہیں مل جائیں تو پیاس کی شدت حدت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ویسے تشنہ نگاہوں کے لیے نظاروں اور مناظر کی کمی نہ تھی، تاہم میں ذاتی طور پر اس بات کا قائل ہوں کہ تشنہ نگاری کی بھی کچھ حدود ہونی چاہئیں۔ مثال پیش ہے: ہم بچوں کے ساتھ چڑیا گھر گئے تھے، اس کے ساتھ ہی ایک جگہ مشینوں کے ذریعہ سے دودھ دوہنے کا عملی مظاہرہ ہوا جسے بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں نے بھی بہت دلچسپی سے دیکھا۔ وہاں سے اٹھ کر جا رہے تھے کہ میرے قدم اور میری نظر بیک وقت ٹھٹھکی۔ بنچ پر بیٹھی نوجوان اور خوبرو لڑکی نے اپنی ٹی شرٹ اٹھا دی...... ہائیں! یا مظہر العجائب! میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں۔ اس نے گود میں چند ماہ کے بچے کو دودھ پلانا شروع کر دیا۔ لڑکی نے گردن پیچھے کر کے بنچ کی پشت پر سر ٹکا دیا۔ اس کی نیم وا آنکھیں کسی کو نہ دیکھ رہی تھیں، وہ اردگرد چلنے والے لوگوں سے لاتعلق، ممتا کا فریضہ ادا کر رہی تھی اور مکمل انہماک سے...... ایک ثانیہ کو میں نے یہ سب دیکھا اور پھر ماں کے احترام میں نظریں جھک جاتی ہیں!

⌘⌘⌘⌘⌘⌘⌘⌘

چین

منجمد لمحے

پلس پوائنٹ

ڈنمارک چھوٹا سا ملک ہے اور اسی مناسبت سے کوپن ہیگن چھوٹا مگر پرسکون شہر ہے۔ چھوٹا تو یوں سمجھیے کہ بلحاظ آبادی لاہور تو کجا یہاں تو فیصل آباد اور ملتان جتنی بھی آبادی نہیں، فراخ سڑکوں پر نہ تو کوئی بے معنی جلوس نکلتے ہیں، نہ کاروں کی طویل قطاریں اور ٹریفک جام، نہ ڈیزل کا غلیظ دھواں، سڑکوں پر برائے نام پولیس۔ ہمارے برعکس ٹریفک قوانین کا بالعموم احترام کیا جاتا ہے، اس لیے چالان بھی بہت کم اور یوں پولیس کی رشوت بھی کم کم! ویسے بھی چھوٹا ملک بڑی پولیس کا نخرہ برداشت نہیں کرسکتا، یہ تو ہم ہیں جو پولیس کو سونے کا نوالہ کھلاتے ہیں۔

گزشتہ برس تیل کا بحران پیدا ہوا تو تمام یورپ نے احتیاطی تدابیر اختیار کیں مگر پٹرول ڈنمارک کا مسئلہ نہیں، اکثریت سائیکل سوار ہے۔ ویسی ہی سائیکل سواری، ڈسک سلپ کا مرض پالنے سے پہلے جیسی میں نے لاہور کی سڑکوں پر کی تھی۔ میری سائیکل کی شان ہی نرالی تھی بس یوں سمجھ لیجیے کہ اگر پطرس نے اس پر سواری کی ہوتی تو سائیکل پر ان کا مضمون کسی اور ہی اسلوب میں قلم بند ہوا ہوتا۔ گھنٹی کے علاوہ میری سائیکل کی باقی ہر چیز بجتی تھی۔ یہ ہے مختصر ترین الفاظ میں میری سائیکل کی تعریف! کوپن ہیگن میں جب ہر طرف سائیکلیں ہی سائیکلیں اور پھر انہیں چلانے والیاں دیکھیں تو سائیکل بطور جنسی استعارہ سمجھ میں آئی۔ جل پری کے دیس میں سائیکل سوار مچھلیاں! ریفلیکٹرز کی وجہ سے رات کو ان سائیکل کے پیڈل چمکتے، ریفلکٹرز نہ ہونے کے باوجود بھی دن کو سڈول پنڈلیوں کی ڈوبتی ابھرتی مچھلیاں لشکارے مارتیں۔ سائیکل کسی کمان جیسے جسم کی جیومیٹری کیسے نمایاں کرتی ہے، یہ نکتہ کوپن ہیگن نے سمجھایا۔

سائیکل کے ساتھ ساتھ پبلک ٹرانسپورٹ کا بھی بہترین نظام ہے، لہٰذا بالعموم کار استعمال

نہیں کی جاتی۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ اسمبلی کے اراکین، وزراء حتیٰ کہ بعض اوقات وزیراعظم تک بھی سائیکل یا بس میں دفتر جاتے ہیں۔ سرکاری کار اسی وقت استعمال کرتے ہیں جب بکارِ سرکار ہوں۔ وزیراعظم کی سائیکل سواری سے یاد آیا کہ ہمارے مقبول عالم محبوب ضیاء الحق صاحب نے بھی ایک مرتبہ سائیکل کو سواری کا شرف بخشا تھا۔ بدخواہ دشمنوں نے یہ افواہ اڑا دی کہ اس مقصد کے لیے ان کی سکیورٹی اور دیگر لوازم پر لاکھوں اُٹھ گئے۔

مجھے ممالک غیر سے پاکستان کا موازنہ پسند نہیں، تاہم! ایسی باتیں خواہ مخواہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں کہ ہمارے وزراء، افسران بالا، اعلیٰ حکام اور اسی نوع کے دیگر سرکاری اہلکار جس طرح سے سرکاری ٹیلی فونز کا بے دریغ اور کاروں کا بے دردی سے استعمال کرتے ہیں اس سے مغل شہزادوں کی فضول خرچیاں یاد آجاتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ کرپشن میں عالمی سطح پر پاکستان دوسرے تو ڈنمارک پچاسویں نمبر پر ہے۔

معاف کیجیے! سائیکل پر میں ذرا زیادہ ہی دور نکل گیا۔ ٹریفک کے شور اور دھوئیں کی غلاظت سے پاک صاف ستھری سڑکیں سکون کا گہوارہ نظر آتی ہیں۔ گھومنے پھرنے کے دوران کہیں غنڈہ گردی نہ دیکھی، حالانکہ بعض اوقات ایسے ویسے لباس میں لڑکی دیکھ کر میرا بھی غنڈہ گردی کو جی مچل اٹھتا۔ چلیں خالص غنڈی گردی نہ سہی لاہوری طریقہ پر اوئے ادئے تو کیا ہی جا سکتا تھا۔ اب یہ سطریں لکھتا ہوا سوچ رہا ہوں بیچارے نقاد نے کیا کسی کو چھیڑنا اسے تو نوخیز شاعرات چھیڑ کر بے وزن شاعری کے مجموعوں پر توصیفی مقالات قلم بند کرا لیتی ہیں۔ ویسے آپس کی بات ہے کہ میں یہ بھی سوچتا اگر جوابِ آں غزل کے طور پر ان لمبی تڑنگی اور کسی کسائی لڑکیوں نے مجھے چھیڑ دیا تو؟

ہم آدھی رات کو گھر جا رہے تھے کہ مِنی سکرٹ میں تنہا لڑکی بے خوف و خطر بس سٹاپ پر کھڑی نظر آئی، امن و تحفظ کے اس احساس سے امریکہ اور برطانیہ کے باشندے بھی آگاہ نہیں، بالخصوص امریکہ جہاں کالے دن دیہاڑے گردن دبوچ لیتے ہیں اسی لیے نیویارک، شکاگو اور واشنگٹن جیسے معروف شہر جرائم کے اعداد و شمار میں سرفہرست نظر آتے ہیں۔

آتشِ گل:

تمام یورپ کی طرح ڈنمارک بھی خوش منظر ہے، پھول ہی پھول اور گھاس ہی گھاس کچی اور گندی زمین نظر نہ آئے۔

تبسم کہنے لگے: ’’چلیں آپ کو روز گارڈن دکھلائیں۔‘‘

نام کی مناسبت سے "Rosen Haven" فلکِ گل ثابت ہوا۔ سو سے زائد اقسام کے گلاب، سلیقہ اور قرینے سے کیاری بند۔ باغ کیا تھا میر حسن کا شعر زندہ تھا:

چمن آتشِ گل سے دہکا ہوا
ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا

تبسم، ارم اور شبنم کی تصویریں بنا رہا تھا اور میں سیاہ گلاب کی تلاش میں کیاریاں جھانک رہا تھا۔ نہ جانے مجھے سیاہ گلاب کی جستجو کیوں ہے؟ کہیں اس لیے تو نہیں کہ سیاہ گلاب کو بختِ سیاہ کی علامت بنانا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے سیاہ گلاب ہوتا ہی نہ ہو اور یہ میرے Morbid تخیل کی اختراع ہو کہ سرخ پر سیاہ کو ترجیح دیتا ہوں۔ میں ٹین ایجر تھا تو نیلا رنگ پسند تھا، جوان ہوا تو سفید بھایا اور اب سیاہ۔ سیاہ لباس میں ملبوس لڑکیاں بھی اسی لیے اچھی لگتی ہیں۔ کوپن ہیگن سے پہلے میں لاس اینجلس کے روز گارڈن میں بھی سیاہ گلاب تلاش کرتا رہا مگر نہ پایا، لہٰذا اسے فیل کر دیا۔

سیاحوں کا جمعہ بازار

خاموش اور پرسکون بلکہ قدرے خوابیدہ سے کوپن ہیگن کی ''واکنگ سٹریٹ'' صحیح معنوں میں زندگی سے بھرپور نظر آئی، یہ اور اس سے ملحق سڑکیں اور گلیاں سیاحوں سے گویا چھلک رہی تھیں۔ راج ہنسوں کے مجسموں والے چوک میں جوڑوں کا ہجوم وہ سب کچھ کر رہا تھا جس کی حسرت میں مشرقی جوڑے عمر بتا دیتے ہیں۔ یہاں مختلف ملکوں، نسلوں اور رنگوں کے سیاح نظر آئے، خوش، اپنے آپ میں مگن، گاتے، رقص کرتے، کھاتے (کم کم) پیتے (زیادہ زیادہ)

مغرب کے نوجوانوں، طلبہ اور غربا میں سیاحت بذریعہ کمائی خاصا مقبول طریقہ ہے۔ لڑکیاں اس فن میں طاق ہوتی ہیں، لہٰذا گرل فرینڈ/گٹار/موقلم/کیمرہ/اشیائے فروخت کی صورت میں کوچ کا سامان باندھ لیتے ہیں، چنانچہ یہاں بھی متعدد ایسے نوجوان نظر آئے جو گا کر یا ساز بجا کر خرچ پورا کر لیتے ہیں اور گرل فرینڈز بونس میں۔ ایک موٹا جاپانی جاپان کا کوئی قدیم ساز بجا رہا تھا۔ عجب مدھر دھن تھی، لوگ دائرہ بنائے ہوئے گویا سانس روکے سن رہے ہوں۔ کالا ہندوستانی اپنی ہی بین پر ناگ کی مانند لہرا رہا تھا، ایک جانب حبشیوں کے ڈرمز کا وائلڈ ردھم۔ بعض اپنے اپنے ملک کی اشیاء فٹ پاتھوں پر سجائے، موٹے رنگین منکوں والے ہار، انٹیک جیولری، افریقہ کے قبائلی ماسک، شوخ رنگوں والے زنانہ لباس، طرح طرح کی تصاویر، کھلونوں جیسی قدیم وضع کی گھڑیاں، کراکری الغرض سیاحوں کا جمعہ بازار سج رہا تھا۔ اس بازار میں کتنے سیاح اور کتنی سیاح برائے فروخت ہوں گی، یہ جداگانہ قصہ

ہے۔ بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں، کے مصداق میں نے اس بین الاقوامی جمعہ بازار کی اتوار کو سیر کی اور کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا!

UD SLAG

ڈنمارک کا نرم اور خوشگوار موسم سو ڈیڑھ سو دن سے زیادہ نہیں رہتا لہٰذا جہاں مقامی باشندے اس سے ہر ممکن طریقہ سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتے ہیں، وہاں سیاح بھی بھرپور طریقہ سے حظ اٹھاتے ہیں۔ مجھے مردوں کا تو علم نہیں مگر عورتوں کے بھرپور طریقہ سے حظ اٹھانے کا مطلب ہے شاپنگ۔

عورت دنیا کے کسی خطے کی کیوں نہ ہو، وہ شاپنگ کے بغیر خود کو گرسنہ اور تشنہ محسوس کرتی ہے۔ جنسی محرومی کی پیدا کردہ فرسٹریشن اور اعصابی تناؤ دور کرنے کے لیے شاپنگ کا نسخہ تیر بہدف ثابت ہوتا ہے۔ شاپنگ متبادل جنسی آسودگی کا لاشعوری انداز ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ یوں خاوند کو مالی زک پہنچا کر لاشعوری طور پر انتقام بھی لیا جاتا ہے، لہٰذا جب بیوی ضرورت سے زیادہ شاپنگ کرے تو خاوند کو اپنا جنسی آڈٹ کرانا چاہیے۔

سیاحت کے موسم کی وجہ سے کوپن ہیگن کے تمام قابل ذکر اور ناقابل ذکر سٹورز نے کلیئرنس سیل شروع کر رکھی تھی۔ جدھر جاؤ "UD SALG" کے بورڈز آویزاں نظر آئے۔ سیاحت کی گرم بازاری کے باعث مہنگی بیئر سستی ہو جاتی ہے اور سستی لڑکی مہنگی! تمام کوپن ہیگن "Ud Salg" میں تبدیل ہو چکا تھا۔

ایک ہم ہیں کہ

شاپنگ کو مزید پرکشش بنانے کے لیے سیاحوں کو خریداری پر سیلز ٹیکس کی چھوٹ ملتی ہے۔ خریدار سٹور کو ٹیکس ادا کرتا ہے۔ سٹور خریدار کو کوپن دیتا ہے جس پر اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ خریدار نے اتنی رقم کی خریداری پر اتنا سیلز ٹیکس ادا کیا ہے۔ ایسے تمام کوپن سنبھال کر رکھے جاتے ہیں، واپسی کے وقت ایئرپورٹ پر کسٹم کلیرنس اور بورڈنگ کارڈ لے لینے کے بعد تمام کوپن دکھانے پر ایئرپورٹ کے اندر بینک سے ٹیکس کی رقم واپس مل جاتی ہے۔ تبسم کی بہن نورین کو اس کا علم تھا چنانچہ میں نے خریداری کے تمام کوپن سنبھال کر رکھے۔ واپسی والے دن پی آئی اے کا طیارہ حسب روایت سات آٹھ گھنٹے لیٹ تھا۔ ہم آدھی رات کو ایئرپورٹ پہنچے تو کسٹم والے صاحب نے بتایا، رات زیادہ ہو چکی

ہے اس لیے بینک بند ہو چکا ہے۔ اس نے ایک فارم دیتے ہوئے کہا کہ میں یہ فارم پُر کر کے بینک کے باہر رکھے سفید باکس میں ڈال دوں، بعد میں ادائیگی ہو جائے گی۔

لاحول ولا...... میں نے سوچا، میں غیر ملکی، آج کے بعد شاید عمر بھر یہاں آنا نہ ہو، میری کوئی سفارش نہیں، نہ میں وی آئی پی کہ پاکستانی سفارت خانہ بطورِ خاص میری طرف توجہ دے۔ بددلی سے فارم پُر کیا اور اپنی دانست میں سفید باکس میں نہیں بلکہ اندھے کنویں میں فارم اور تمام کوپن پھینک کر چلا آیا اور واپس آ کر بھول گیا۔ میں تو بھولا مگر وہ نہیں بھولے۔ مہینہ بعد ایک خط ملا، میرا شکریہ ادا کیا گیا کہ میں ان کے ملک میں آیا، ساتھ ڈالرز کا چیک، چند دنوں بعد ایک اور چیک ملا، لکھا تھا مزید جانچ پر آپ کی مزید رقم نکلی، سو یہ چیک قبول ہو۔

یہ میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اگر آپ ڈنمارک جائیں تو سٹور سے ٹیکس فری کوپن ضرور حاصل کر لیں اور دوسرے اس لیے بھی کہ ہمیں یورپ کی عریانی، فحاشی، بے حیائی، شراب اور زنا تو نظر آتا ہے وہاں قواعد وضوابط کا کتنا احترام ہوتا ہے اس سے سبق حاصل نہیں کرتے۔ میں نے یہ واقعہ ایک محفل میں سنایا تو ایک صاحب چمک کر بولے ''یہ انہوں نے اسلام سے حاصل کیا ہے۔''

میں انہیں سمجھاتا ہوں کہ کارِ خیر سودا نہیں جسے دکان سے خرید لائے۔ یہ تو عمل کی اخلاقیات ہے۔ ہم کیسے نادان ہیں ہم نے اعلیٰ اقدار یورپ کے حوالے کر دیں اور خود عقل و خرد، اخلاق، کردار اور قاعدہ و قانون سے تہی دست ہو بیٹھے۔ خاصی بحث ہوئی مگر وہ لوگ قائل نہ ہوئے۔ سچ ہے:

مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر!

پیارے وطن کے مالک اور ان کے کارندوں نے جب پیسہ حاصل کرنا ہوتا ہے تو عوام کو گویا گنا بیلنے والی مشین میں ڈال دیتے ہیں لیکن اس کے برعکس حکومت سے اپنا جائز پیسہ لے کر دکھا دیں۔ اے جی، کسٹم، انکم ٹیکس اور ڈی سی آفس تو خیر بدنام ہیں ہی پرچوں کی مارکنگ کے بعد ذرا پنجاب یونیورسٹی سے رقم کا چیک وصول کر کے دکھا دیں، ہم مان جائیں گے۔ نامی گرامی دانشور پروگرام کرنے کے بعد چیک کے لیے ریڈیو پاکستان میں دھکے کھاتے نظر آتے ہیں۔ اس ذلت کی وجہ سے میں نے تو برسوں سے ریڈیو پاکستان جانا ہی بند کر دیا ہے۔ ریڈیو پاکستان ہنوز میرے کئی چیکوں کا مقروض ہے۔ نادہندہ سیاستدان نہیں حکومت بھی ہے۔

......تمام اچھی باتیں!

ایک اور واقعہ بھی سن لیجیے!

میرے پاس ڈنمارک میں قیام کے لیے پندرہ دن کا ویزا تھا۔ سب مُصر ہوئے کہ اتنی دور سے اتنا کرایہ خرچ کر کے آئے ہو ویزے میں توسیع کروالو، میں نے کہا ڈنمارک کا ویزا آسانی سے نہیں ملتا تو اس میں توسیع کیسے ہوگی۔

تبسم نے کہا، ہم جا کر درخواست دے دیتے ہیں، کام نہ ہوا تو نہ سہی۔ درخواست دینے میں کیا حرج ہے۔

امیگریشن کا دفتر دیکھا تو طبیعت خوش ہوگئی۔ ایک طرف ریک میں وہ تمام فارم ترتیب سے رکھے جن کی کسی کو بھی ضرورت ہو سکتی تھی۔ میز پر پین وغیرہ رکھے تھے۔ مشین سے اپنی باری کا نمبر نکالیں۔ آپ کا نمبر، کاؤنٹر پر روشنی میں چمکے تو اٹھ کر کاؤنٹر پر آ جائیے۔ لمبی چوڑی قطار کی زحمت ختم، یہ میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ ہم جانوروں کے غول کی مانند ہیں: ہمیں قطار بندی سے سخت نفرت ہے۔

ہمارا نمبر روشن ہوتا ہے۔ ہم دونوں کاؤنٹر پر جاتے ہیں۔ گفتگو ڈینش میں ہو رہی ہے، لہٰذا تبسم ہی بات کر رہا ہے۔ میں خود کو ویزا توسیع کے سلسلہ میں ہونے والے انٹرویو کے لیے ذہنی طور پر تیار کر رہا ہوں۔ افسانہ نگار ذہن مزید قیام کے جواز کے لیے خوبصورت وجوہ، متنوع بہانے اور جاندار افسانے سوچ رہا ہے۔

تبسم میرا پاسپورٹ دیتا ہے، وہ اس پر سٹمپ لگاتا ہے۔

''چلیں۔''، تبسم نے کہا۔

''اب کس کے پاس جانا ہوگا؟''

''کسی کے پاس بھی نہیں۔''

''میرا انٹرویو نہیں لیں گے؟''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''ویزے میں ایکسٹنشن ہوگئی ہے۔''

''تین منٹ میں؟''

''تین منٹ میں۔''

یقیناً یورپ نے تمام اچھی باتیں مسلمانوں سے حاصل کی ہیں۔

پیارے قارئین! اگر ہم پاکستان میں ہوتے تو مندرجہ ذیل سانحات وقوع پذیر ہو سکتے:

1- کلرکوں نے ہڑتال کر رکھی ہوتی (کیوں؟ معلوم نہیں)

2- متعلقہ کلرک اپنی سیٹ پر نہیں (خریداری کے لیے انار کلی گیا ہے)
3- کلرک تو موجود ہے لیکن اسے فائل نہیں مل رہی۔
4- کلرک کا سالا ساتھ لا کر کام تو کرا لیا گیا مگر متعلقہ افسر میٹنگ میں ہے۔
5- پھر اس کے بعد ایک افسر۔
6- اور پھر اس کے بعد ایک اور افسر۔

یوں بھول بھلیوں میں گردش کرتے رہتے ہیں حتیٰ کہ جانے کا دن آ جاتا ہے ورنہ بصورتِ دیگر رقم چڑھاتے۔

یقیناً یورپ نے تمام اچھی باتیں مسلمانوں سے ہی حاصل کی ہیں۔

شہرِ خاموشاں میں کیوپڈ

بیشتر سفر نامہ نگار چند دن کے لیے کسی ملک میں جاتے ہیں، جلدی جلدی قابل دید لڑکیوں اور نا قابل دید مقامات کی سیر کی اور واپسی پر سفر نامہ گھڑ دیا۔ میں ذاتی طور پر اس بات کا قائل ہوں کہ جس طرح چار دن کی چاہت میں لڑکیاں نہیں کھلتیں، اسی طرح کسی ملک تو کجا شہر حتیٰ کہ گلی محلّہ کو بھی گنتی کے چند دنوں میں سمجھا نہیں جا سکتا۔ ہاں! سیر ہو سکتی ہے۔ قیام طویل ہو تو پھر کچھ سر پیر کا اندازہ ہو گا۔ اسے اس مثال سے سمجھیے کہ کوئی بھی سیاح قبرستان نہ جائے گا مگر مجھے جانے کا اتفاق ہوا۔

تبسم کا ایک بے حد عزیز دوست تھا۔ اتنا کہ اس کی شادی میں شرکت کے لیے وہ بطور خاص پاکستان آیا تھا۔ اسے جب معلوم ہوا کہ میں یعنی تبسم کا خسر آ رہا ہوں تو اس نے میری آمد سے قبل ایک دعوت پکی کر دی لیکن ہونی کو کون ٹالے، اس نے نہایت ہی پر اسرار حالات میں خودکشی کر لی، وہ جوان تھا۔ بیوی نوجوان، تین ننھے بچے، نہ جانے کیا مسئلہ تھا۔ بیوی سودا لینے باہر گئی تھی، واپس آئی تو سیڑھیوں کے اوپر دروازہ پر گردن میں پھندا لیے اس کی لاش جھول رہی تھی۔

ذرا ''میانی صاحب'' یا کسی بھی قبرستان کو ذہن میں لائیے، غالب کا مصرع کوئی ویرانی سی ویرانی ہے کا درست مطلب ذہن نشین ہو جائے گا۔ دن کو مقامِ عبرت، رات کو مجرموں کی پناہ گاہ۔ خودرو پودے، جھاڑ جھنکاڑ، قبروں کی بھول بھلیاں!

کوپن ہیگن کا گریو یارڈ (قبرستان) گریو یارڈ کم اور فلاور یارڈ زیادہ۔ گل و گلزار کا سماں، پختہ روشیں، قبروں پر نمبر، خوبصورت کتبے، بعض قبروں پر پرندوں، فرشتوں اور حضرت مریم کے مجسمے کچھ بڑے، کچھ چھوٹے!

نیلی جین اور ٹی شرٹ میں ملبوس ڈینش گورکن مشینوں سے قبر کی کھدائی کر رہے تھے جو مٹی نکل رہی تھی ایک طرف احتیاط سے اس کی ڈھیری بناتے جا رہے تھے۔ میں اِدھر اُدھر گھوم رہا ہوں۔ قبروں کے کتبے ڈینش زبان میں ہیں۔ بعض قبروں پر "TAKSKAL DU HAVE" (شکریہ، سب کا شکریہ) کندہ ہے۔ میں سوچتا ہوں شکریہ کیوں، پھر سمجھا جو شخص کھڑا قبر دیکھ رہا ہے، اس توجہ کے لیے پیشگی شکریہ ادا کیا جا رہا ہے۔

ایک قبر پر دل کی شکل کا کتبہ، قبر پر کیوپڈ کا ننھا سا مجسمہ اوندھے منہ پڑا۔ عشق کے دیوتا کا یہ حال، میں کیوپڈ کا مجسمہ سیدھا کر کے قرینے سے رکھ دیتا ہوں۔ پھر اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر دیتا ہوں۔ کتبہ پڑھا، نوجوان لڑکی تہہ خاک آسودہ تھی۔ کیا پتہ یہ کیوپڈ کی ستائی اور عشق کی ماری ہو:

جسے عشق کا تیر کاری لگے
اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

میں اسی طرح کتبے دیکھتا اور دفن ہونے والوں کے بارے میں قیاس کرتا جاتا ہوں اور یہ نوٹ کیے بغیر نہ رہ سکا کہ زیادہ تر قبریں بچوں یا بوڑھوں کی تھیں۔ اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آئی کہ حصولِ رزق یا پھر شادی کی وجہ سے بیشتر جوان دوسرے ممالک کو سدھارتے ہیں، وہیں عمر بسر کی، انتقال ہوا اور اجنبی مٹی میں دفن ہوئے۔

قبروں سے ہٹ کر کھلے سرسبز میدان میں چھوٹا سا چرچ (Kapl) ہے۔ اس کے سامنے فراخ لان میں نمازِ جنازہ ادا کی جاتی ہے۔ وہ بچہ جس نے سیالکوٹ میں جنم لیا تھا، کوپن ہیگن کے قبرستان میں دفن ہوتا ہے۔ جب وہ گھر سے سامان لے کر ڈنمارک آیا ہو گا تو اسے یہ علم نہ ہو گا کہ وہ ڈنمارک میں رزق کے لیے نہیں بلکہ قبر کے لیے جا رہا ہے۔ میرا دل افسردہ ہو جاتا ہے۔

بے چین روح

خودکشی کرنے والے کا قصہ دفن ہونے کے ساتھ ختم نہیں ہوتا۔ تین برس بعد جب ارم ملنے کے لیے لاہور آئی تو اس نے بتایا کہ اس کی بیوہ تنہا رہ گئی تھی، لہٰذا اسے سسرال والے اپنے گھر لے آئے۔ اس کے فلیٹ میں ایک ڈینش فیملی آ کر آباد ہوئی۔ چند دن تو عافیت سے گزر گئے، اس کے بعد اہل خانہ کو راتوں کو کوئی چلتا پھرتا نظر آنے لگا۔ اگرچہ کسی کو نقصان تو نہ پہنچا مگر عالم ہراس میں انہوں نے فلیٹ چھوڑ دیا۔ اس کے بعد ایک اور ڈینش کنبہ نے فلیٹ لیا اور جس عورت نے اس کی روح دیکھی، وہ ذہنی توازن کھو بیٹھی۔ یوں وہ فلیٹ ہانٹڈ سمجھا جانے لگا، چنانچہ ہنوز خالی ہے۔ کیا وہ فلیٹ پہلے ہی سے

آسیب زدہ تھا جو اس نے پراسرار حالات میں خودکشی کی یا خودکشی کے باعث ناآسودہ روح بھٹک رہی ہے؟......کچھ کہنا ممکن نہیں۔

قتل......قومی نشان ہمارا!

اگر یہ واقعہ پراسرار ہے تو ایک بھیانک قتل کا واقعہ بھی سن لیجیے۔ شادی کے بعد جب پہلی مرتبہ ارم ڈنمارک کے لیے روانہ ہوئی تو وہ تنہا تھی۔ اب تو خیر وہ تنہا سفر کر لیتی ہے لیکن یوں تنہا سفر کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ ہم پریشان تھے اور وہ بھی سراسیمہ۔

جہاز میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر جو لڑکی بیٹھی تھی، وہ ڈنمارک ہی میں پیدا ہوئی تھی۔ جیسا کہ سفر میں ہوتا ہے، فوراً گفتگو شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے استفسار پر ارم نے بتایا کہ میری شادی ہوئی ہے اور میں پہلی مرتبہ کوپن ہیگن جا رہی ہوں، لڑکی نے تسلی دی اور کہا، گھبراؤ مت۔ اس نے ارم کا چارج سنبھال لیا اور امیگریشن اور سامان وغیرہ کے سلسلے میں اسے کسی طرح کی پریشانی نہ ہونے دی۔

کوپن ہیگن میں دونوں کا رابطہ برقرار رہا۔ جیسا کہ میں لکھ آیا ہوں ڈنمارک میں زیادہ تر کھاریاں، جہلم اور اس کے نواح کے دیہاتی آباد ہیں۔ یہ سب مزدوری کے لیے گھروں سے نکلے مگر ان کی تیسری نسل اب ہر لحاظ سے ڈینش ہے۔ وہاں کے تعلیم یافتہ ملازمت کرتے اور ڈینش معیار زندگی کے مطابق زیست کرتے لیکن اور یہ "لیکن" بہت بڑی ہے کہ ان کے بزرگ ذہنی طور پر ہنوز کھاریاں کے گاؤں ہی میں آباد ہیں، وہی اقدار اور رسوم و رواج۔ اس وجہ سے ان کی زندگی جن تضادات سے دوچار ہوتی رہتی ہے، وہ متعدد المیے جنم دیتے ہیں۔ سب سے تکلیف دہ صورتحال شادی بیاہ کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے، عملاً یورپین زندگی گزارنے والے لڑکے یا لڑکی کے لیے گاؤں میں آباد کزن کا رشتہ موزوں ترین سمجھا جاتا ہے۔ ان پڑھ بیوی تو مشرقی روایات کے بموجب جوتے کھا کر رو پیٹ کر زندگی بسر کر لیتی ہوگی مگر پینڈو دولہے ڈینش میں پلی بڑھی ایک تعلیم یافتہ ملازمت پیشہ لڑکی کے لیے بالعموم پہلو میں خار ثابت ہوتے ہیں۔ یہاں سے جانے والا جب تک ڈینش نہ سیکھ لے، کسی کام کا اہل نہیں ہوتا۔ ادھر پینڈو کزن کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ تو گھر ہی میں نالائق تھا، کوپن ہیگن میں قابلیت کے کیا جوہر دکھائے گا۔ اس پر مستزاد خاوند والا روایتی حاکمانہ رویہ اور وہ بھی اس صورت میں کہ بیوی کما رہی ہے اور وہ اس کا دستِ نگر ہے۔

اس لیے یا تو روتے پیٹتے عمر بسر ہو جاتی ہے، دونوں ایک دوسرے سے ناخوش! متوازی لکیروں کی مانند! بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ لڑکی طلاق کا مطالبہ کرتی ہے یا پھر شوہر پاکستان واپس آ جاتا ہے۔ ہر دو صورتوں میں بزرگوں کی ناک کٹتی ہے اور بعینہٖ اس لڑکی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ کھاریاں سے جو پینڈو کزن آیا، وہ بیوی کو پاؤں کی جوتی سمجھنے والا، خالص پاکستانی مرد تھا۔ جلد ہی اختلافات شروع ہو گئے۔ لڑکی کا باپ نہ تھا، تین بھائی تھے اور وہ شوہر سے متفق، انہیں ہر معاملے میں اپنی بہن کی غلطی نظر آتی تھی۔ اس نے طلاق مانگی تو ناک آڑے آ گئی۔ لڑکی کی پٹائی شروع ہو گئی۔ ایک دن تنگ آ کر اس نے پولیس میں کیس رجسٹرڈ کرا دیا اور خود ایک ہوسٹل میں اٹھ آئی۔ ناک کٹی اور ایسی ویسی کٹی؟ بھائیوں کی غیرت بیدار ہو گئی۔ ایک رات بھائی نے نہ صرف اسے بہیمانہ انداز میں قتل کیا بلکہ لاش کے ٹکڑے کر کے مختلف مقامات پر چھپا دیئے۔

ہمارے ہاں دن رات غیرت مند مرد، بے غیرت، بدمعاش اور بے حیا عورتوں کو قتل کرتے رہتے ہیں اور بالعموم ان کا یہ اقدام سراہا جاتا ہے۔ اخبارات میں آئے دن ایسی خبریں چھپتی رہتی ہیں مگر ان کا کوئی نوٹس نہیں لیا جاتا لیکن ارم نے بتایا کہ جب قاتل بھائی ڈرامائی انداز میں ایئرپورٹ پر سے گرفتار ہوا اور اس بھیانک قتل کی تفصیلات اخبارات اور ٹیلی ویژن پر آئیں تو خلقت تراہ تراہ کر اٹھی اور ان ہی ایام میں میں وہاں پہنچا۔ ہر طرف اس واقعے کا چرچا تھا۔ اس قتل کے عمرانی محرکات اور نفسیاتی وجوہ کے بارے میں میڈیا میں مباحثے چھڑے ہوئے تھے۔ اس تمام بحث میں سب اس بات پر متفق تھے کہ قتل پاکستانی کلچر کا حصہ ہے۔ ہمارے ہاں جس طرح شوقیہ قتل ہوتے ہیں، اس سے تو واقعی یہی محسوس ہوتا ہے کہ قتل ہمارے خمیر میں شامل ہے۔

تذکرہ مینڈکوں کا

عقلی حقیقتوں، سائنسی صداقتوں اور عملی صداقتوں سے دور ہم اپنے ساختہ کنویں کے مینڈک بنے رہنے ہی میں خوش ہیں اس لیے بحر بے کنار کا شعور کرنا ہماری اجتماعی نفسیات میں شامل نہیں۔ یہاں تو لشٹم پشٹم جیسی بھی گزرے ہم گزار ہی لیتے ہیں مگر باہر جا کر جس طرح سے تضادات کا شکار ہوتے ہیں، وہ متنوع المیے جنم دیتے ہیں۔

مثلاً یورپ امریکہ میں جا کر اکثریت جو کچھ کرتی اور اقلیت ناکردہ گناہوں کی جس طرح حسرت کرتی ہے، اس کی صراحت کی ضرورت نہیں لیکن ہر نوع کی خرابی اور خرابات کے باوجود ذبیحہ گوشت کی تلاش میں مارے مارے پھرتے یں۔ قتل، زنا، ڈاکہ، اغوا اور ایسے گھناؤنے جرائم کے مقابلے میں گوشت مسئلہ نہیں لیکن گوشت ہی کو مسئلہ بنا لیتے ہیں وہ بھی جنہیں میموں کے وائٹ میٹ سے خصوصی رغبت ہوتی ہے۔

کوپن ہیگن میں میں جس سے بھی ملا اسے محافظِ اسلام پایا، زندہ اور متحرک اسلام نہیں بلکہ وہ اسلام جسے پاکستان میں وہ اپنے گاؤں میں چھوڑ آئے ہیں، اس معاملے میں بیشتر تو طالبان سٹائل نظر آئے، اسی لیے اب وہاں مسلمانوں کو مزید مسلمان کرنے والے اصحاب کی آمد میں خاصہ اضافہ ہو چکا ہے۔

عید میلاد النبی ﷺ کی تقریب کے سلسلہ میں ٹیلی ویژن کے اردو چینل پر ایک لڑکی تقریر کر رہی تھی، مسلمانوں کو اچھے مسلمان بننے کی تلقین کر رہی تھی اور اس مقصد کے لیے طاہر القادری کو مثال بنانے کی نصیحت کر رہی تھی۔ مجھے طاہر القادری سے کوئی کد نہیں مگر عید میلاد النبی ﷺ کی مناسبت سے کی گئی تقریر میں یہ مثال نہ بھائی!

مذہب پرستی اپنی جگہ اور کرپشن اپنی جگہ۔ میرے قیام کے دوران میں اخبارات میں خبر چھپی کہ اسلام آباد میں ڈنمارک کے سفارتخانے کے پاکستانی ملازم ویزا فروشی میں ملوث پائے گئے، وہ ملازمت سے تو نکالے ہی گئے لیکن ہوا یہ کہ پاکستانیوں کو ڈنمارک کے ویزے کے حصول کے لیے شرائط مزید کڑی کر دی گئیں۔ اگر کرپشن، قتل اور غنڈہ گردی ہمارا ٹریڈ مارک سمجھا جانے لگا ہے تو قصور تیرا ہے یا کہ میرا؟

ہملٹ کا قلعہ

میرے خیال میں خاصہ رنا دھونا ہو چکا۔ آیئے آپ کو ہملٹ کے قلعہ میں لے چلیں۔

کون ہے جو شیکسپیئر سے واقف ہو اور اسے ہملٹ کا علم نہ ہو۔ ہملٹ ڈنمارک کا تھا۔ ہملٹ شیکسپیئر کے شاہکار ڈراموں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ ایسا ڈراما ہے جس کی تشریح و توضیح میں ناقدین نے خاصی خامہ فرسائی کی، بالخصوص ہملٹ کی الجھی شخصیت اور اس کے کردار و عمل میں باہم متصادم رویوں کی بنا پر ڈراما نفسیاتی ناقدین کی خصوصی توجہ کا مرکز بنا رہا ہے۔

مجھے جب علم ہوا کہ ڈنمارک میں ہملٹ کا قلعہ کورن بورگ (Kron Borg) میں موجود ہے تو میں وہاں جائے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔ چنانچہ ایک سہانی صبح الفت حسین اور میں ہملٹ کا قلعہ دیکھنے روانہ ہوئے جو کوپن ہیگن سے اتنے فاصلہ پر تھا کہ ٹرین سے جانا پڑتا تھا۔

میں ڈنمارک کی ریل گاڑیوں کی خوبصورتی، آرام اور وقت کی پابندی کی تعریف نہ کروں گا اپنے مقابلہ میں غیروں کی ہر چیز کو سراہنا کوئی اچھی بات نہیں۔ ٹرین تیز رفتاری سے سرسبز و شاداب سفر طے کر رہی تھی۔ دونوں جانب ہرے بھرے اشجار، ان کے درمیان کہیں کہیں سرخ نوکیلی چھتوں والے

مکانات کے کٹ آؤٹ اور پھر اچانک منظر تبدیل ہو جاتا اور سمندر جگہ لے لیتا۔ تاحدِ نگاہ پھیلی دھوپ میں جھل مل کرتی نیلاہٹ!

ہملٹ کا قلعہ بہت بڑا نہیں، لاہور کے شاہی قلعہ کے مقابلہ میں منی فورٹ سمجھئے، کوئی ایسا جاہ و جلال بھی نہ نظر آیا مگر اسے شیکسپیئر کے قلم کا اعجاز سمجھئے جس نے شاہکار ڈراما لکھ کر قلعہ کو زندۂ جاوید کر دیا۔ چھوٹا سا قلعہ ہے ساحل سمندر پر، سامنے کٹر اڈاٹری پر سویڈن۔ درمیان میں اتنا فاصلہ جسے اچھا تیراک بآسانی تیر کر عبور کر لے۔ ساحل پر فیری تیار، قطار میں کھڑے مسافر سوار ہونے کو، ایک طرف سے گاڑیاں اندر اتاری جا رہی ہیں۔ میں نے حسرت سے دیکھا۔ یہاں سے سویڈن ایک نظر کے فاصلہ پر تھا مگر میرے لیے ویزے کے مسائل تھے۔ باقی بلا روک ٹوک جا رہے تھے کہ وہ اپنے ہی بھائی تھے۔

میں نے ایک چیز بطور خاص نوٹ کی کہ مغرب والے ہر ممکن طریقے سے تاریخی مقامات اور نوادر کی حفاظت کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو تاریخی عمارات اور نوادر ملتے ہیں ان کا جو حشر ہوا، اس سے سب بخوبی واقف ہیں، سرکار کی عدم دلچسپی اور محکموں کی عدم توجہی کے باعث جس طرح سے تاریخی آثار برباد ہو رہے ہیں، نوادر سمگل ہو رہے ہیں، میوزیم کا خانہ خراب ہو رہا ہے، مصوری کے شاہکار بے توجہی کے باعث اپنی آب و تاب کھو رہے ہیں، یہ سب پر واضح ہے۔ ذرا رہتاس کا قلعہ جا کر دیکھ آیئے جو کھنڈر میں تبدیل ہو چکا ہے۔ لاہور کی متعدد چھوٹی تاریخی یادگاریں رہائش، بھینس باندھنے اور اُپلے تھاپنے کے کام آ رہی ہیں۔ اس کے برعکس مغرب میں ہر ممکن طریقہ سے تاریخی ورثہ سنبھال کر رکھا جاتا ہے۔

ہملٹ کا قلعہ دفاعی لحاظ سے یقیناً مضبوط ہوگا۔ سامنے سمندر اور خشکی پر قلعے کے گرد پانی سے لبریز نہر جبکہ اندر بھول بھلیوں جیسے زمین دوز راستے اس لیے کہ عالم پناہ پر اگر افتاد پڑے تو زمین دوز راستوں سے سٹک جائیں۔ قلعے میں قدیم زمانہ اور تاریخی اہمیت کا حامل چھوٹا سا چرچ نظر آیا۔ ایک میوزیم ڈنمارک کی بحری تاریخ کے حوالے سے ترتیب دیا گیا۔ خوبصورت باغ، شاہی ریسپشن ہال، شاہی لائبریری (جو مرمت کے لیے بند تھی) قلعہ چھوٹا مگر یوں آراستہ گویا ہنوز آباد ہو، دیواروں پر شکار اور جنگی مناظر کی بڑی بڑی ٹیپسٹریز اور ساتھ ہی عیاشی کے مناظر کی دیدہ زیب عریاں تصاویر۔

ہم ٹورسٹس عالم پناہ کی خوابگاہ، رقص کے ہال اور دربار ہال وغیرہ دیکھ رہے تھے۔ یہاں چوبی کام والا خوبصورت چرچ بھی تھا۔ تصاویر، فرنیچر اور دیگر اشیاء پر اگرچہ کہنگی کے آثار تھے مگر اس کے باوجود ڈنمارک کی تاریخ اور بالخصوص ہملٹ کی وجہ سے یہ چھوٹا سا قلعہ ڈنمارک کی اہم یادگار ہے اور میرے لیے اس کا دیکھنا یادگار دن ثابت ہوا۔

الفت حسین اور میں سیر کے بعد تھک کر ساحل سمندر کے کنارے بیٹھ جاتے ہیں، سامنے سویڈن کا ساحل، درمیان میں من موجی سمندر، مسافر لے کر فیری روانہ ہو چکی ہے۔ ہوا کے نمکین فرحت بخش جھونکے، میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوں تو ساحل کے مختلف حصوں میں جوڑے وہ کچھ کرتے نظر آتے ہیں جو ایسے موقعوں پر جوڑے کیا کرتے ہیں۔ میں انہیں دیکھتا ہوں پھر الفت حسین کو اور پھر یہ بھی دیکھتا ہوں، کوئی دیکھتا نہ ہو!

ارم نے جو لنچ پیک کیا تھا، ہم اس سے پورا پورا انصاف کرتے ہیں، راحت اور طمانیت کا احساس حاوی ہوتا جا رہا ہے۔ سمندر میں گیند کی مانند ایک سرخ ڈوبتا ابھرتا نظر آتا ہے۔ میں پاؤں پھیلا دیتا ہوں، آنکھوں کے پپوٹے بوجھل ہو رہے ہیں۔

کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا

میرے پاس وقت وافر تھا، اس لیے کوپن ہیگن اور گرد و نواح کی جی بھر کر سیر کی اور تمام قابل دید مقامات دیکھ ڈالے، البتہ نا قابل دید مقامات دیکھنے کی حسرت رہی۔

ایک دن ڈنمارک کی اسمبلی دیکھی، نامور سیاستدانوں اور سپیکرز کی تصاویر آویزاں، آئین کا مسودہ۔ ملکہ اگرچہ ملک کی حاکم ہے مگر جب وہ آئے تو گیلری میں بیٹھتی ہے۔ اس وقت اس گیلری میں ہم پھر رہے تھے۔

کوپن ہیگن میں کئی میوزیم ہیں۔ ان میں سے ایک اسلحہ کا بھی ہے "The Royal Danish Arsenal Museum" جسے دیکھنے سے پتھر کے ہتھیاروں سے لے کر جدید دور کے آلاتِ حرب کی تاریخ سمجھ میں آ جاتی ہے۔ باہر نکلے تو عین ہمارے سامنے ایک بگھی آ کر رکی جس میں سے شادی کے روایتی سفید لباس میں ملبوس دلہن اور سیاہ سوٹ میں ملبوس دولہا برآمد ہوا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، ساتھ براتی نہ تھے۔ بس دونوں ہی تھے اور سڑک پر ہنی مون منانے کے موڈ میں تھے۔ دلہن کی نازک انگلیوں میں سگریٹ دبی تھی، اس نے سگریٹ والا ہاتھ ایک جانب موڑا اور چٹاخ چٹاخ کسنگ شروع کر دی۔ ایسا روح افزا منظر اور ساتھ میں بیٹی کے متبرک سسر صاحب! میں الفت حسین سے باتیں کرتا رہا مگر ان پر بھی نگاہ رکھی۔ دلہن نے تازہ دم ہونے کو سگریٹ کے ایک دو بھرپور کش لیے اور پھر جُت گئی۔ کیسے خانہ خراب تھے، انہیں میرے جذبات و احساسات کا خیال ہی نہ تھا۔ بس پچ پچ کیے جا رہے تھے۔

ایک خوش منظر باغ میں قدیم طرز کی وسیع عمارت میں شاہی کتب خانہ تھا۔ میں بڑے شوق سے وہاں گیا لیکن لائبریری ان دنوں مرمت کے لیے بند تھی۔ البتہ وجودیت کے فلسفے کے بانی

کیر کیگار کا مجسمہ دیکھنے کو ملا۔ ویسے لائبریری کھلی بھی ہوتی تو میرے کسی کام کی نہ تھی۔ وہاں صرف ڈینش زبان ہی میں کتابیں نظر آتیں۔ ڈنمارک کے لوگوں کی وطن سے محبت کا یہ عالم ہے کہ انگریزی، فرنچ یا جرمن بھی جانتے ہوں گے مگر زبانِ غیر میں ہم کلام نہ ہوں گے۔ کتابوں سے یاد آیا، ایک سٹور میں گئے تو وہاں ایک گوشہ کتابوں سے آباد نظر آیا۔ میں کتابوں کا رسیا وہاں جا کھڑا ہوا۔ ڈنمارک کی کتابوں کے علاوہ عالمی کلاسیکی شاہکار بھی تھے مگر سب ڈینش میں ترجمہ کیے گئے تھے اور پھر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ڈینش میں بے نظیر بھٹو پر ایک باتصویر کتاب رکھی تھی، نام تھا "Bhuto's Bay lon" کتاب شوق سے اٹھائی، الٹی پلٹی، ظاہر ہے ڈینش کیا پلے پڑتی، لیکن میرا خیال ہے کہ اباب اول کا عنوان یہ ہوگا ''پردہ سے پارلیمنٹ تک''

کوپن ہیگن لاہور سے چھوٹا سہی لیکن یہاں مختلف النوع کے کوئی تین درجن میوزیم ہوں گے۔ بیشتر میوزیم کسی ایک عہد/موضوع/تھیم کے لیے مخصوص ہیں۔ چنانچہ جنس (Erotica) سے لے کر بچوں تک کے لیے میوزیم مخصوص ہیں اور پھر ان پر مستزاد وہ خصوصی نمائشیں جو گرمیوں میں مختلف صورتوں میں منعقد ہوتی ہیں اور ساتھ ہی ڈرامے، اوپیراز اور میوزک فیسٹیول وغیرہ۔ کوپن ہیگن کو اگر یورپ کا ''باب ثقافت'' کہتے ہیں تو یہ کچھ غلط نہیں۔

کوپن ہیگن میں تفریح کے متعدد مقامات ہیں مگر "Tivoli" جیسی مقبولیت اور شہرت اور کسی کو حاصل نہیں۔ ایک وسیع و عریض سبزہ زار، قدرتی جھیل میں پرانے زمانہ کے بادبانی جہاز میں ریستوران اور اتنے کھیل تماشے (جن میں رات کی آتش بازی بھی شامل ہے) کہ یہ ایک طرح کی ''ونڈر لینڈ'' میں تبدیل ہو گئی ہے۔ اس کے ساتھ بھی ایک چھوٹا سا میوزیم ہے۔ 1843ء سے "Tivoli" سیاحوں اور مقامی لوگوں کے لیے مقبول ترین تفریح گاہ کی صورت میں آباد ہے۔ ٹیوالی (Tivoli) دیوالی کے وزن پر ہے اور کیوں نہ ہو کہ رات کو ایک لاکھ دس ہزار بلب روشن ہوتے ہیں۔

تاریخ کے ابواب

کوپن ہیگن میں قدیم تاریخی عمارات کی کمی نہیں..... شاہی محلات، قدیم باغات، تاریخی اہمیت کے حامل چرچ وغیرہ بس دیکھتے جاؤ اور سراہتے جاؤ۔ مختلف مقامات، چوراہوں اور باغات میں اہم شخصیات کے مجسمے، خوبصورت فواروں کو دیدہ زیب بناتے مجسمے حتیٰ کہ ایک سڑک کے کنارے درخت کے تنے اور موٹی شاخوں کو بھی شبیہوں کی صورت میں تراشا گیا تھا۔ ایک باغ میں مہاتما گاندھی کا دھاتی مجسمہ بھی نصب نظر آیا۔ (غالباً یہ مجسمہ انڈین ایمبیسی نے شہر کو تحفہ میں دیا ہوگا) یہ سطریں لکھ رہا

ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ اگر طالبان یہاں ہوتے تو خاصے مصروف رہتے۔ میرے سامنے پاکستان کا محکمہ ڈاک کا جاری کردہ گوتم بدھ کے مجسمہ والا ٹکٹ پڑا ہے۔ دوستو! ٹکٹ سنبھال لو، کل کو شاید یہی بچے!

کوپن ہیگن میں متعدد قدیم شاہی محلات دیکھنے کو ملیں گے مگر میں کرسچین برگ (Christian Borg) محل اور روزن برگ (Rosen Borg) محل دیکھنے کی پرزور سفارش کرتا ہوں۔ کرسچین برگ کا محل 1167ء میں بشپ ابسلون (Absalon) نے تعمیر کروایا تھا اور تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں ہنوز قابل دید ہے۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ ڈنمارک کی تاریخ کے بیشتر اہم واقعات اور تاریخی وقوعات کا کسی نہ کسی طرح اس محل سے تعلق بنتا ہے جیسے 5 جون 1849ء کو اس محل میں ڈنمارک کا آئین منظور کیا گیا تھا۔

الفت حسین اور میں جب پہنچے تو ایک معصوم صورت لڑکی نیلے بلیزر اور نیکر میں سیاحوں کی ٹولیوں کو قلعے کے اہم حصوں کی سیر کرا رہی تھی۔ وہ ڈینش بول رہی تھی، الفت صاحب نے اس دن مترجم کا کردار ادا کیا اس سے جو سنتے مجھے ترجمہ کر کے سمجھاتے جاتے۔ کچھ دیر بعد لڑکی کو اندازہ ہو گیا کہ وہ ترجمہ ہو رہی ہے۔ چنانچہ اس نے الفت صاحب پر خصوصی توجہ رکھی۔ جب قلعے کی سیر ختم ہوئی تو اس نے بطور خاص الفت صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

یہ محل بھی دیگر محلات جیسا ہی تھا یعنی دربار ہال، طعام گاہ اور طرح طرح کے کمرے مگر سب اصل سامان سے آراستہ، دیواروں پر تصاویر اور ٹیپسٹریز۔ ایک وسیع ہال کی چھت پر بارہ ماہ میں مختلف برجوں میں سورج کے سفر کی بارہ تصاویر پینٹ کی گئی تھیں۔

اس محل کے نیچے ایک اور قدیم محل کے زمین دوز آثار محفوظ کیے گئے ہیں۔ یہ 1369ء میں تباہ کر دیا گیا تھا اور مٹی میں دب کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کی نشانی ایک ٹیلے کی صورت میں رہ گئی۔ ان پر محلات بنے، آباد ہوئے اور برباد ہوئے اور دنیا زیرِ زمین دفن محل سے لاعلم رہی۔ 1906-08ء میں کھدائی کے بعد آثار برآمد کیے گئے اور یوں ڈنمارک کی ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ سے متعلق آثار محفوظ کر لیے گئے۔ قدیم تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب یقیناً یہاں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

دراصل گئے زمانوں کے محلات، حویلیاں، عمارتیں، قلعے یا آثار قدیمہ بھی تاریخ ہی کے مختلف ابواب ہیں۔ البتہ یہ وہ تاریخ ہے جو قلم اور روشنائی کے بجائے سنگ و خشت سے تحریر ہوئی ہے، لہٰذا محض تفریح گاہ جان کر سیر نہ کی جائے بلکہ انہیں ''پڑھنے'' کی کوشش کی جائے اور کچھ نہیں تو عبرت تو حاصل ہو ہی سکتی ہے۔ ژرف نگاہی سے دیکھنے پر ہمارے اردگرد کئی آثار قدیمہ بلکہ آثار کہنہ بھی نظر

آئیں گے۔ ان سے بھی عبرت حاصل کی جا سکتی ہے۔

سنگ و خشت اور ہیرے

کرسچین چہارم کو ڈنمارک کا شاہجہان قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس نے سترہویں صدی عیسوی میں اپنے دورِ حکومت میں متعدد عمارات تعمیر کیں اور باغات بنوائے۔ کوپن ہیگن کے مشہور روزن بورگ محل کی تعمیر کا سلسلہ 1606ء میں شروع ہوا اور آنے والے برسوں میں اس میں اضافوں اور توسیع کا سلسلہ جاری رہا اور ایک صدی تک شاہی قیام گاہ کے طور پر استعمال ہوتا رہا لیکن 1710ء کے بعد یہ بطورِ محل استعمال نہ ہوا۔ تاہم بطور شاہی محل اسے محفوظ رکھا گیا اور شاہی خاندان کے ملبوسات، ظروف، زیورات، تصاویر، ٹیپسٹریز، فرنیچر، اسلحہ، آئینہ، سامانِ تزئین، شکار سے متعلق ہتھیار اور اسی طرح کے شاہی نوادر جمع ہوتے گئے اور محل خود بخود ایک میوزیم کی شکل اختیار کرتا گیا۔ 1938ء میں عوام کے لیے اس کے دروازے کھول دیے گئے اور اس وقت یہ سیاحوں کا پسندیدہ مقام بن چکا ہے۔ دیدہ زیب باغ میں تعمیر یہ محل اپنے وسیع کمروں میں وہ سب ساز و سامان سمیٹے ہے جس کے دیکھنے سے ڈنمارک کی تاریخ کے نقوش اجاگر ہو جاتے ہیں۔ شاہانہ تجمل عیاں ہوتا ہے۔ دولت و ثروت کی مظہر اور اختیار و اقتدار کی علامات۔

اس محل میں تقریباً چھ ہزار نادر اشیاء نظر آتی ہیں اس لیے ان سب کے بارے میں لکھ کر میں محل کی گائیڈ مرتب نہیں کرنا چاہتا۔ مزید یہ کہ جب کم وقت میں مسلسل اشیاء دیکھی جائیں تو تیز رفتار ریل گاڑی کے سفر کی مانند ذہن میں بطورِ خاص کسی چیز کا بھی تاثر نہیں رہتا لیکن ایک کا تاثر ہنوز ذہن پر نقش ہے اور وہ ہے ملکہ صوفی میگڈلین (Sophie Magdalene) کے لیے 1731ء میں تیار کردہ ہیروں کا تاج۔ ہم نے کانچ کے ٹکڑوں کے ساتھ عمر بسر کی، ہم کیا جانیں پہچانیں لیکن لش لش کرتے ہیرے دیکھے تو آنکھوں میں چاندنی اتر آئی۔ میرے قدم رک گئے اور میں مسحور سا کھڑا دیکھتا رہا۔ اس دن اندازہ ہوا کہ ہیرے کا جادو عورتوں کے سر کیوں چڑھتا ہے اور ہیرے جمع کرنے کا نشہ کیوں ہو جاتا ہے۔ ہم نے تو صرف ہیروں کی چوری اور سمگلنگ کی فلمیں ہی دیکھیں، سرد ہیرے کی آنچ عورت کے اعصاب پر کیا اثر کرتی ہے، اس کی لذت سے صرف وہی عورت شناسا ہو سکتی ہے جو ہیروں کی مالک ہو۔

اسلام...... بصری تاریخ

جب مجھے معلوم ہوا کہ کوپن ہیگن کے مشہور اور سب سے بڑے نیشنل میوزیم میں ان دنوں

اسلام کے بارے میں خصوصی نمائش کا اہتمام کیا گیا ہے تو میں بھلا کیوں نہ جاتا۔ سلیقہ اور محنت سے ترتیب دی گئی اس نمائش کے ذریعے اسلامی عقائد اور اسلامی تاریخ کے بارے میں معلومات حاصل ہو جاتی ہیں، چنانچہ خطاطی، قرآن شریف، موسیقی، مصوری، جغرافیہ، تصوف، ادب، فلسفہ، سائنس اور بعض اسلامی ممالک کے مخصوص نوادر اور تصاویر کی متذکرہ شعبوں کے تحت نمائش کی گئی تھی۔ مصر کے لیے مخصوص شعبے میں ممیاں اور ہیرو غلافی کے نمونے میں نے بڑے شوق سے دیکھے۔ اسلامی ممالک کی سیاسی بیداری کے ضمن میں جن شخصیات نے بین الاقوامی اہمیت حاصل کی ان کی تصاویر بھی تھیں اور شاہ فیصل، شاہ حسین، یاسر عرفات کے ساتھ قائد اعظم اور بے نظیر کی تصاویر دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ترکی کی سابق وزیر اعظم تانسو چیلر کی تصویر بھی تھی۔ بعض ایسی فوٹوگرافس بھی تھیں جو مختلف اسلامی ممالک کے باشندوں کے اندازِ زیست پر روشنی ڈالتی ہیں۔ پاکستان کے بارے میں بھی کچھ فوٹوگرافس تھیں۔

میوزیم میں پاکستان سے حاصل کردہ مہاتما بدھ کا مجسمہ شائقین کی توجہ کا مرکز بنا تھا، البتہ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ مجسمہ مستعار ہے یا عطیہ؟

یہ نمائش اسلام کے بارے میں محض نمائش سے بڑھ کر قدیم دنیا اور جدید یورپ پر اسلام کے اثرات کی بصری تاریخ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ تین ماہ تک رہنے والی اس نمائش میں عوام اور سیاحوں نے خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس قسم کی نمائشوں کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اہل مغرب کو یہ باور کرایا جا سکے کہ عام یورپین کی سوچ کے برعکس اسلام جنگ و جدل کا مذہب نہیں بلکہ اس کے تہذیبی، ثقافتی، علمی، ادبی اور روحانی اثرات عالمگیر ہیں۔

نیویارک کے میٹروپولیٹن میوزیم میں اسلام کے لیے مخصوص شعبہ میں آویزاں ایک تصویر میں عرب قالین پر اڑ رہا ہے، بس یہی خرابی ہے کہ مغرب میں مسلمانوں کو ہنوز الف لیلیٰ کی ہالی وڈ فلموں کی روشنی ہی میں دیکھا جا رہا ہے۔ وہ یہ تو یاد رکھتے ہیں کہ مسلمان کیسے ہیں، لیکن یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ اسلام کیسا نہیں؟ اسلام اور مسلمانوں کے مثبت پہلو اجاگر کرنے کے لحاظ سے یہ نمائش سراہے جانے کے لائق ہے۔

لاکھوں کا لاکھ میوزیم!

کون ہے جو لندن گیا اور اس نے مادام تساد کا Wax (لاکھ) میوزیم نہ دیکھا۔ یورپ کے بعض اور ممالک میں بھی لاکھ میوزیم ہیں۔ میں نے لاس اینجلس میں صرف فلمی شخصیات کے لیے مخصوص نسبتاً چھوٹا لیکن دلچسپ میوزیم دیکھا اور ایسا ہی لاکھ میوزیم کوپن ہیگن میں بھی ہے اور نام ہے

"Louis Tussaud' Wax Museum" میں نہیں جانتا کہ اس کے بانی لوئی تساد کا مادام تساد سے کیا رشتہ تھا لیکن یہ معلوم ہوا ہے کہ 1974ء میں قائم ہونے والا یہ لاکھ میوزیم عوام اور سیاحوں میں بہت مقبول ہے۔ دیکھا جائے تو یہ بہت بڑا نہیں۔ دوسو کے لگ بھگ شخصیات کے لاکھ کے مجسمے ملیں گے لیکن ہیں یہ سب تاریخ ساز اور عہد ساز شخصیات، چنانچہ شاہی گھرانہ، عالمی اہمیت کے سیاستدان، مصور، موسیقار، ادیب، فلاسفر، اداکار، مغنی، فیری ٹیلز کے معروف کردار اور آخر میں حجرۂ ہول!

آپ اس میوزیم میں اگر ایک طرف ڈنمارک کے بادشاہوں، ملکاؤں، شہزادوں اور شہزادیوں سے ملتے ہیں تو ساتھ ہی شاہ حسین، یاسر عرفات، ہٹلر، چرچل، ماؤزے تنگ، ہلمٹ کہل، بل کلنٹن، بورس یلسن بھی نظر آتے ہیں۔ ایک کرسی پر اپنی مخصوص مسکراہٹ لبوں پر سجائے مونالیزا لیونارڈو داونچی کے لیے پوز دے رہی ہے تو ساتھ ہی وان گوف اور پکاسو بھی محوِ کار ہیں، پکاسو کی ماڈل نیوڈ ہے۔

فلموں سے دلچسپی کے باعث میں نے فلمی شخصیات کے لیے مخصوص گوشہ شوق سے دیکھا۔ چنانچہ چارلی چپلن، لارل اینڈ ہارڈی اور بوب ہوپ جیسے نامور کامیڈین کے ساتھ کلنٹ ایسٹ ووڈ، سیمی ڈیوس، ایلزبتھ ٹیلر اور جان وین بھی تھے اور ماضی کی معمر ایکٹرس گریٹا گاربو اور ماضی بعید کا بے حد مقبول اداکار رڈولف والنٹینو بھی۔

ماضی کی فلموں کی دو نامور سیکس کوئنز جین ہارلو اور مارلین منرو اور آج کی جولیا رابرٹس بھی دیکھی۔ مارلن منرو کی غالباً سب سے مشہور تصویر Seven Year ithc کی ہے جس میں وہ پلیٹوں والا سفید سکرٹ اور سفید ہی بلاؤز پہنے سڑک پر اس آہنی جالی پر کھڑی ہے جس کے نیچے سے زمین دوز ریلوے گزرتی ہے۔ نیچے ریل گزرنے سے جو ہوا اوپر اٹھتی ہے، وہ سکرٹ کو خطرناک حد تک اونچا کر دیتی ہے۔ میوزیم میں یہی منظر زندہ کیا گیا، مارلین منرو کی مشہور ہنسی کے ساتھ۔

اگر میں یہ کہوں کہ امریکہ کی فلمی تاریخ میں چوتھی دہائی میں بنائی جانے والی فلم ''کاسابلانکا'' سب سے زیادہ مقبول مشہور اور تاریخ ساز فلم ثابت ہوئی تو اسے مبالغہ نہ سمجھا جائے۔ جنگِ عظیم دوم میں مراکو کے شہر کاسابلانکا کے حوالے سے بنائی گئی فلم میں مرکزی کردار ہمفری بوگارٹ اور انگرڈ برگمین نے ادا کیے تھے۔ اس فلم کی بدولت دونوں امر ہو گئے۔ یہ بلیک اینڈ وائٹ فلم اب کلاسیک میں شمار ہوتی ہے اور اب بھی متغیر فلمی ذوق کے باوجود اس کے پوسٹر ڈرائنگ روم کی دیواروں سے لے کر ٹی شرٹ تک پر نظر آتے ہیں۔ سو یہاں ''کاسابلانکا'' کے لیے بھی ایک گوشہ مخصوص تھا۔

ماضی کے بے حد مشہور سنگرز The Beatles بھی نظر آئے اور راک سٹار ایلوس پریسلے بھی، جب یہ سب تھے تو پھر مائیکل جیکسن کیوں نہ ہوتا۔ ایک گوشے میں ہانس کرسچین اینڈرسن اور دی برادرز

گریم (The Brothers Grimm) کی معروف فیری ٹیلز سے متعلق مناظر تھے تو حجرۂ ہول میں ڈریکولا حسینہ کا خون چوسنے کو تیار نظر آیا۔

ہانس کرسچین اینڈرسن، شیکسپیئر، ارنسٹ ہیمنگ وے، ابسن، کرکے گار اہلِ قلم میں سے عالمی اہمیت کے موسیقاروں میں سے بتھوون اور سائنسدانوں میں آئن سٹائن نمایاں تر تھے البتہ میرے لیے یہ بات تعجب کا باعث ثابت ہوئی کہ ڈنمارک کی علامت جل پری یہاں نظر نہ آئی۔ اس میوزیم میں اسے ضرور ہونا چاہیے تھا بلکہ داخلے کے وقت دروازے پر سب سے پہلے جل پری ہی سے ملاقات ہونی چاہیے تھی۔

بہر حال یہ چھوٹا سا لاکھ میوزیم سلیقے، محنت اور ریسرچ کا فنکارانہ امتزاج نظر آیا۔ اتنی عہد ساز شخصیات کا ایک چھت تلے جمع ہونا عملاً ناممکن مگر لاکھ میوزیم کی صورت میں ممکن ہو گیا۔ شخصیات نہ تھیں وقت کے بہاؤ کے کچھ منجمد لمحات تھے۔

منجمد حباب

چار برس بعد سفرنامہ قلم بند کرنا شروع کیا تو ذہن کو ڈنمارک میں گزارے ڈیڑھ ماہ کے خوبصورت مناظر اور خوشگوار یادوں سے معمور پاتا ہوں۔ سوچتا ہوں کیا ہمارا ذہن بھی ایسا ہی لاکھ میوزیم نہیں، ہر انسان اپنے ذہن میں یادوں کا ایسا ہی لاکھ میوزیم سجائے ہے۔ یہ الگ بات کہ یہ میوزیم صرف اسی کے لیے مخصوص ہے، غیر کا داخلہ ممنوع، ذہن کے اس لاکھ میوزیم میں یادوں کے کیسے کیسے صنم اور تمناؤں کے کھلونے محفوظ کیے جاتے ہیں، بگڑے ایام اور تلخ یادوں کی حنوط شدہ ممیاں جو نہ پھینکی جا سکیں نہ سنبھالی جا سکیں، ذہن کے اس لاکھ میوزیم میں والدین کی محبت، بہن بھائیوں کی چاہت اور دوستوں کے خلوص کا اُجالا ملتا ہے اور ساتھ ہی دشمنوں، بدخواہوں، سازشیوں اور باعث اذیت بننے والوں کی پرچھائیاں، منجمد ہوتے وقت بھی جو باعث ضرر محسوس ہوتی ہیں۔ ہم یوں ہی دورانِ زیست وقوعات کو ذہن کے لاکھ میوزیم میں محفوظ کرتے زیست کر جاتے ہیں اور سب کہاں، کچھ، اجتماعی شعور کے لاکھ میوزیم میں جگہ پا لیتے ہیں۔ منجمد حباب مگر تخلیق کی گرمی اور کارِ خیر کا اُجالا بھی ہے۔

⌘⌘⌘⌘⌘⌘⌘⌘

چین

سیر...... پانچ درویشوں کی

''جانا پانچ درویشوں کا ملکِ خطا اور دیکھنا عجائب و غرائب اور اشیاء کمیاب و نایاب''

چ کی گردان

"37801098"

''چیں۔''

''ڈاکٹر سلیم اختر صاحب تشریف فرما ہیں؟''

''چاں۔''

''ان سے بات ہو سکتی ہے؟''

''چوں۔''

دوست بھنا کر بولا ''یہ کیا چوں چوں کا مرتبہ بنے ہو؟ ڈھنگ سے بات کیوں نہیں کرتے؟''

میں کیسے ڈھنگ سے بات کرتا، میں تو چین کی یاترا سے لوٹا تھا، کئی دن تک تو چارپائی کی چیں چیں بھی سامع نواز محسوس ہوتی رہی اور چینی کے علاوہ ہر شے میں چ کی تکرار دل خوش کُن، چینی میں اس لیے نہیں کہ چینی کا مارا ہوں۔

قدیم دانش کا گہوارہ

زبان پہ بارِ خدا یہ کس کا نام آیا! چین سے ہمارا ثقافتی اور تہذیبی رشتہ حکومتوں کی سیاسی پالیسیوں سے بھی کہیں پہلے پائیدار اور مستحکم رہا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی حصولِ علم کے بارے میں چین جانے کی تلقین کے ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ ہماری قدیم داستانوں میں ملک خطا چین کے قدیم نام

Cathy کی مُعرّب صورت کی شہزادیوں اور لعبتانِ چین کے تذکرے ملتے ہیں۔ سو باتوں کی ایک بات یہ کہ عالمی سطح پر جب کبھی بھی دانش وحکمت کا تذکرہ ہو تو کنفیوشس کے دانش آموز اقوال اور حکمت بھری باتوں سے صرفِ نظر ممکن نہیں۔ جس کی دانش زبان ومکان سے ماورا ہے اور ہر عہد کا فرد اس سے مستفید ہو سکتا ہے۔ یونان کے سقراط، افلاطون اور ارسطو سے بھی پہلے کنفیوشس کی دانش کا شہرہ پھیل چکا تھا۔ وہ 551 ق۔م میں پیدا ہوا اور 679 میں اس کا انتقال ہوا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ کنفیوشس اس کا حقیقی نام نہیں۔ اس کا نام کُونگ فوتسی (کُنگ فوزی بھی لکھا گیا ہے) تھا۔ چینی زبان میں کونگ کا مطلب اعلیٰ مرتبہ مُعلّم/عظیم مرشد ہے۔ اہلِ مغرب نے نام کو بگاڑ کر کنفیوشس بنا دیا اور اب وہ اسی نام ہی سے معروف ہے۔ اخلاقی تصورات اور سیاسی، سماجی و عمرانی مسائل پر اس کی تعلیمات اور اقوال کے دنیا بھر کی زبانوں میں تراجم کیے جا چکے ہیں۔ اس کے اقوال میں سب سے زیادہ یہ قول مشہور ہے:

"تم دوسروں کے کردار وعمل کے لیے بھی وہی اصول منتخب کرو جو تم اپنے لیے بھی پسند کر سکو۔"

چند اور اقوال پیش ہیں:

☆ مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں کہ لوگ مجھے نہیں جانتے بلکہ اس امر کا افسوس رہے گا کہ میں لوگوں کو نہیں جانتا۔

☆ دروازہ کے علاوہ انسان بھلا اور کہاں سے جا سکتا ہے۔

☆ وہی نیکی اعلیٰ تر ہے جو میانہ روی کے زریں اصول پر مبنی ہو لیکن عوام میں اس کی کمی ملتی ہے۔

☆ اگر حاکم ایماندار ہو تو سختی کے بغیر بھی رعایا سُدھر سکتی ہے لیکن وہ خود ہی بے ایمان ہو تو لاکھ حکم دیتا رہے، کوئی اطاعت نہ کرے گا۔

☆ غریب ہو کر حرفِ شکایت زبان پر نہ لانا، اس کے مقابلہ میں زیادہ مشکل ہے کہ امیر ہو کر مغرور نہ ہو۔

☆ صفائی زبان کا جوہر ہے۔

پنج پیارے

دونوں ملکوں کے ثقافتی معاہدہ کی رو سے ہر برس دونوں ملکوں کے اہلِ قلم کے وفود خیر سگالی کا دورہ کرتے ہیں۔ 2004ء میں پاکستانی اہلِ قلم کا دورہ طے پایا تو افتخار عارف صاحب نے مجھے بھی وفد میں شامل کر لیا۔ دیگر اراکین کے اسماء مشتاق احمد یوسفی (وفد کے قائد) محمد اظہار الحق (اسلام آباد)

ڈاکٹر شاہ محمد مری (کوئٹہ) اور پروفیسر داور خان داؤد (پشاور) ہم پنج پیاروں نے دس دن ساتھ گزارنے تھے، ایک دوسرے کا آئینہ بنے۔

جدید دور کے پانچ درویش ملک خطا پرواز کے لیے تیار تھے، پُرتجسس مسرت کے ساتھ۔

اسلام آباد ایئرپورٹ پر خدا حافظ کہنے کو افتخار عارف کے علاوہ نسیم محمود، گلزار احمد (ڈائریکٹر جنرل) طارق شاہد اور پاکستان میں چین کے سفارتخانے کے تھرڈ سیکرٹری ژونگ بنگ (Zhahg Bing) بھی موجود تھے۔ اس رات پہلی مرتبہ مجھے اندازہ ہوا کہ وی آئی پی سے مخصوص سلوک کس نوع کے حسن سلوک میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہم کافی پی کر گپ بازی میں لگے رہے جبکہ اس دوران میں کلیئرنس کے بعد سامان بُک ہو گیا۔ بورڈنگ کارڈ حاصل کر لیے گئے اور ہم کافی کے کپ میں گپ سے طوفان برپا کرنے میں رہے۔ حتیٰ کہ گزارش کی گئی کہ حضور رخشِ صبا رفتار منتظر ہے۔ آپ قدم رنجہ فرمائیں تو وہ عازمِ سفر ہووے!

پند سود مند

سکھیوں کے سنگ بیٹھ ذرا، کچھ باتیں ہیں سمجھانے کی...... کے مصداق چلتے وقت افتخار عارف صاحب نے کچھ پند سود مند ہمارے پلّے باندھے۔ انہوں نے بتایا چینی پابندیٔ وقت کے بہت عادی ہیں، مزید یہ کہ طے شدہ لائحہ عمل سے سرِ مو تجاوز بھی پسند نہیں کرتے۔ اگرچہ آدابِ میزبانی کی بنا پر منہ سے تو کچھ نہ بولیں گے مگر وہ اسے پسند بھی نہ کریں گے اور ہمارے بارے میں کوئی اچھا تاثر بھی قائم نہ کریں گے۔ افتخار عارف صاحب نے یہ بھی سمجھایا کہ چینی مذہب کے بارے میں بھی استفسارات پسند نہیں کرتے، لہٰذا عقائد کے حوالے سے ان کے ساتھ مذہبی بحث سے اجتناب کریں۔

آہنی پرندہ

ہوائی جہاز میں سوار ہوئے تو اندازہ ہوا کہ چینی واقعی ہم سے ہر معاملے میں آگے ہیں حتیٰ کہ وقت کے لحاظ سے بھی (تین گھنٹے) پانچ گھنٹے کی مسلسل پرواز تھی۔

تاریک رات میں بوئنگ قدیم داستانوں کے کسی طلسمی آہنی پرندے کی مانند محوِ پرواز تھا۔ پی آئی اے کی اس فلائٹ کے دوران مجھے یاد آیا کہ جس زمانے میں امریکہ سمیت دنیا کے متعدد ممالک نے چین کی سوشلسٹ حکومت کا حقہ پانی بند کر رکھا تھا، اس وقت پاکستان نے امریکہ کی شدید مخالفت کے باوجود بھی چین سے فضائی رابطے کا آغاز کیا۔ یوں طویل عرصے تک صرف پی آئی اے ہی چین

سے رابطے کا ذریعہ بنی رہی۔

22 نومبر کے منفی پانچ درجہ کی سردی سے ٹھٹھرتے بیجنگ نے آنکھ کھولی تو ہمیں دیکھا اور حیرت سے پلک جھپکنی بھولا۔ ویسے ہم بھی حیرت سے پلک جھپکنی بھولے کہ جو دیکھ رہے تھے، جو دیکھا، جو دیکھنا تھا وہ ہمارے تخیل سے بھی فزوں تر تھا۔ بعض نہیں بلکہ متعدد امور کے لحاظ سے چین تو ہمیں اپنی داستانوں کا پراسرار ''خطا'' محسوس ہوا تو چارفٹ کے منی ایچر چینی مردوزن محیرالعقول!

ہلکی کہر کی نرم چادر سرکا کر نومبر کا سورج شفیق دھوپ میں لینڈ اسکیپ نمایاں کر رہا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب پتوں کے بغیر ایک جیسے درخت سرکشیدہ تھے۔ صاف سڑک پر کوسٹر ہمیں لیے محوِ رفتار تھی جو ٹک ٹک دیدم کی تصویر بنے تھے، دم نہ کشیدم والے متعدد مقامات ومناظر سے ہنوز آشنا نہ ہوئے تھے۔

بی...... مشرق کی سمت مراد روشنی اور جنگ بمعنی بستی، آبادی۔ یوں بیجنگ مشرق کی سمت روشن شہر قرار پاتا ہے اور بیجنگ واقعی روشنیوں کا شہر ہے۔

خواب اور نائٹ میئر

ماؤزے تنگ کی ولولہ انگیز قیادت، لانگ مارچ، 1949ء میں پانچ ستاروں والے سرخ پرچم کی سرفرازی اور پھر افیون خوری کی رسیا گراں خواب قوم کا جذبہ حب الوطنی سے سرشار ہو کر منظم قوم کے سانچے میں ڈھلنا، معاصر عالمی تاریخ کا تابناک باب ہے۔ ماؤ اور چو اِن لائی نے جلد ہی چین کو عالمی سیاست میں ممتاز مقام دلا دیا۔ چین سرخ تو تھا مگر بعض اور سوشلسٹ ممالک کی مانند سٹالن کا برخوردار بھی نہ بنا۔ چین نے برابری کی سطح پر روس سے دوستی چاہی، یوں اپنا تشخص برقرار رکھا، روس کا طفیلی نہ بنا۔

ہماری خارجہ پالیسی کے تضادات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہم سوشلسٹ روس کے مخالف رہے ہیں اور سوشلسٹ چین کے دوست۔ میں آج تک یہ نہیں سمجھ پایا کہ ہماری دوستی سے چین نے ہم سے کیا حاصل کیا؟ مسائل کے شکار ہم تو سدا سے ہی کشکول دراز رہے۔ ہم چین کے کس کام کے ہو سکتے ہیں کہ چین وفاداری بشرطِ استواری کا قائل ہو۔ کم از کم ہمارے معاملے میں تو کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔

سرخ چین میں مذہب نہ تھا، سو ماؤ کا کلٹ بنا تو اس کی سرخ کتاب، سرخ چین کا نیا صحیفہ قرار پائی۔ ذرا چین کے ان رسالوں کو ذہن میں لائیے جن میں کھڑے کالر والے یکساں چینی مردوزن سرخ کتاب کو سرخ گلاب کی مانند تھامے کھیتوں اور فیکٹریوں میں شادمان چہروں سے محوِ کار نظر آتے تھے۔ ان دنوں چین جانے والا یہ نوٹ کیے بغیر نہ رہ سکتا تھا کہ ماؤزے تنگ، چو این لائی اور عام مرد

عورت ایک ہی جیسے نیلے کوٹ میں نظر آتے۔ شاعر ماؤزے تنگ چین کو اپنے شاعرانہ تخیل کی توسیع میں تبدیل کر رہا تھا۔ ویت نام کا ہوچی منہ بھی شاعر تھا، امام خمینی بھی اور ہمارے علامہ اقبال بھی۔ سبھی نے قوم کی تشکیلِ نو کا خواب دیکھا۔ ماؤ اور امام خمینی خوش قسمت تھے کہ زندگی ہی میں اپنے خواب کی تعبیر دیکھ لی۔ ہوچی منہ کے انتقال کے بعد امریکی سامراج کی عسکریت کا خاتمہ ہوا جبکہ ہمارے علامہ اقبال کا خواب بعض امور کے لحاظ سے تو نائٹ میئر ثابت ہو رہا ہے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ بیجنگ پہنچنے کے بعد ساٹھ منٹ کے اندر اندر ہی ہمیں خواب اور نائٹ میئر کے فرق کا احساس ہو گیا۔

نیا چین

ہمارے ذہن میں چین یا چینیوں کے بارے میں جو بھی تاثرات تھے، وہ پانچویں اور چھٹی دہائی کے حوالے سے تھے۔ مغرب سے اگر متنفر نہیں تو یقیناً بے حد دور، سوشلسٹ کے نظام کے ثمرات نیلے رنگ کے کوٹ، سائیکل سوار، سادگی کی تصویر اور ہر ہاتھ میں ماؤ کی سرخ کتاب...... مگر ہم اب جو کچھ دیکھ رہے تھے، ماضی کے برعکس تھا۔

دراصل ہوا یہ کہ قیادت کی تبدیلی کے ساتھ نظریات بھی تبدیل ہو گئے اور یہ سوچا گیا کہ اب دنیا سے کٹ کر تنہا رہنے کی پالیسی سودمند نہیں۔ یوں ساتویں دہائی میں چین نے پہلے ''بانس کا پردہ'' (Bambo Curtain) تھوڑا سا سرکایا اور پھر مکمل طور پر اٹھا لیا۔ صنعت وحرفت، کمپیوٹر اور جدید ٹیکنالوجی میں چین نے وہ ترقی کی کہ آج مغرب کا حریف ثابت ہو رہا ہے جبکہ بیجنگ، شنگھائی اور دوسرے بڑے شہر امریکہ کے بڑے شہروں کو آئینہ دکھا رہے ہیں۔ بالخصوص شنگھائی جو کسی لحاظ سے بھی نیویارک کے مین ہٹن سے کم نہیں۔ جب مغرب آئے تو مغربی ثقافت کی علامات کوکا کولا، میکڈونلڈ اور کے ایف سی، سب سے پہلے آتی ہیں۔ چنانچہ نوجوان چینی روایتی کھانے چھوڑ کر کوک اور برگر کے رسیا نظر آتے ہیں...... یہ اچھا ہے یا برا، اس کا انحصار اندازِ نظر پر ہے۔

چینی گڑیا

اب کھڑے کالر والا کوٹ عنقا ہے۔ مردوزن پسندیدہ رنگوں والے ملبوسات میں نظر آتے ہیں بلکہ دیدہ زیب نظر آتے ہیں۔ جین، جیکٹ، پینٹ، شرٹ، سکرٹ، منی سکرٹ سبھی چلتے ہیں مگر سرخ رنگ کے روایتی اور بے حد خوبصورت لباس میں تو چینی لڑکی جنت نگاہ بن جاتی ہے۔ چین کا روایتی لباس لمبے گاؤن پر مشتمل ہوتا ہے جو گلے تک بند ہوتا ہے اور ٹخنوں تک جاتا ہے۔ ٹخنوں سے اس

میں ایک چاک اوپر اٹھتا جاتا ہے جو نصف ران پر جا کر اچانک ہی غیر متوقع طور پر ختم ہو جاتا ہے۔ چھپانے اور دکھانے کا یہ اسلوب لڑکی کو سیکسی گڑیا میں تبدیل کر دیتا ہے۔

میں جانے لگا تو میری پانچ سالہ پوتی غناء نے فرمائش کی۔

"بابا میرے لیے گڑیا لائیں۔"

اس کے لیے تو خوبصورت گڑیا مل گئی مگر میں اپنے لیے چینی گڑیا کیسے حاصل کرتا۔ اے بسا آرزو......

چین کس تیزی سے ویسٹرنائز ہو رہا ہے، اس کا اندازہ ان بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹورز سے لگایا جا سکتا ہے جو مغرب سے درآمد شدہ ملبوسات، جوتوں، میک اپ کے سامان اور پرفیومز پر مشتمل ہیں اور ٹھیک ٹھاک مہنگے بھی ہیں مگر اس کے باوجود خریداروں کا ہجوم رہتا ہے۔ ہم جب بھی ان ڈیپارٹمنٹل اسٹورز میں گئے اور قیمت کے یوآن کو پاکستانی روپوں میں (ایک ڈالر: آٹھ یوآن) میں تبدیل کیا تو حاصل ضرب سے دل بیٹھ گیا۔ یوں بڑے بڑے اسٹورز ہماری سرپرستی سے محروم رہے۔ البتہ مقامی اشیاء ہمیں خاصی سستی لگیں۔

تاہم سب کہہ سن کر بھی عام چینی عورت کو سرخی پاؤڈر کی ضرورت نہیں اور لباس، میک اپ اور پرفیوم کے استعمال کے لحاظ سے خاصی سادہ نظر آئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی موتیا رنگت کو سرخی پاؤڈر کی ضرورت نہیں، قائم بالذات موتیا جلد میک اپ کی کسی بھی تکنیک سے مزید موتیا نہیں بنائی جا سکتی......موتی کو تزئین حسن سے کیا؟

نیلا کوٹ ماضی ہوا۔ اب نئی لڑکی منی سکرٹ تک پہن رہی ہے۔ کسی زمانے میں آج کی لڑکی کی نانی، دادی کی چھوٹی چھوٹی دو چٹیا ہوتی ہوں گی مگر اب نہیں۔ نئی لڑکی نئے سٹائلز سے بال کٹواتی ہے۔ یہ لکھ رہا ہوں کہ آج (9 دسمبر 2004ء) جنگ میں یہ خبر پڑھنے کو ملی "چین میں مصنوعی طریقے سے حسن حاصل کرنے والی مس پلاسٹک سرجری کے مقابلے کا انعقاد کیا گیا۔ فائنل میں پہنچنے والی سترہ سے باسٹھ سالہ انیس حسیناؤں میں سے بیس سالہ فنگ ژیان کو اعزاز کے قابل سمجھا گیا جو خود بھی پلاسٹک سرجن بننا چاہتی ہیں۔ مقابلے میں فاتح کو پچاس ہزار یوآن کے برابر کلب ممبرشپ اور جیولری دینے کے علاوہ جاپان میں کاسمیٹکس سرجری سیلون کی سیر کروائی جائے گی مغربی معیار کے زیر اثر چینی دوشیزاؤں میں آنکھیں بڑی، ناک ستواں اور جسم پتلے کرنے کا جنون پیدا ہو گیا ہے۔"

ہر ملک کی جمالیات اس کی تہذیب اور کلچر سے وابستہ ہوتی ہے۔ کسی زمانے میں چین میں چھوٹے بلکہ بے حد چھوٹے پاؤں معیارِ حسن تھے۔ جتنا چھوٹا پاؤں اتنی ہی خوبصورتی۔ چھوٹے پاؤں

سے ہم یہ اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ کتنے چھوٹے پاؤں۔ یوں سمجھیے کہ شیر خوار بچے جیسے چند انچ کے پاؤں جو "کنول پا" کہلاتے تھے۔ پیدائش کے وقت ہی سے لڑکی کو لوہے کے جوتے پہنا کر پاؤں کی فطری نشوونما روک دی جاتی تھی۔ مبادا پاؤں بڑھ جائیں تو پھر سخت جوتے پہنے جاتے ہیں۔ عورتیں عمر بھر پاؤں چھوٹے رکھنے کی اذیت جھیلتیں لیکن کیا کیا جا سکتا تھا کہ بڑے پاؤں والی ایک طرح سے پچھل پائی سمجھی جاتی تھی، لہٰذا اس کا بیاہ نہ ہو سکتا تھا۔ نئے چین نے اس فرسودہ بلکہ بے معنی رسم کو متروک قرار دیا۔ سو اب چار فٹ کی لڑکی کے بارہ انچ کے پاؤں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ آخر سائیکل کی پیڈلنگ بھی تو کرنی ہوئی۔ یہ لکھ رہا ہوں اور یاد آ رہا ہے کہ دسمبر ہی میں چین کے ایک خوش منظر شہر "سانیا" میں مس ورلڈ کا جو شاندار مقابلہ کرایا گیا۔ کروڑوں ناظرین نے اسے ٹیلی ویژن پر براہ راست دیکھا۔ تمام شرکاء اور پریس نے شاندار انتظامات کی بطور خاص تعریف کی تو صاحب! ماؤ کے عہد کا سائیکل سوار چین اب بہت آگے نکل گیا ہے، سیاسی، سماجی، صنعتی اور ثقافتی لحاظ سے۔ اب برٹنی سپیئرز کو چین میں کنسرٹ کی اجازت دی جاتی ہے۔ (اگرچہ مناسب کپڑوں کی شرط کے ساتھ) 2008ء کے اولمپکس چین میں منعقد کرانے کی اجازت مل چکی ہے جو عالمی سطح پر بہت بڑا اعزاز ہے۔

قطار اندر قطار

میں یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ مغربی ثقافت کے اثرات کے باوجود بھی چینیوں میں نظم وضبط کمال کا ہے۔ (جس کا ہمارے ہاں فقدان ہے) جس کا اولین مشاہدہ ٹریفک کی صورت میں ہوا۔ چین کی کشادہ سڑکوں پر کثیر تعداد میں کاریں نظر آتی ہیں مگر کیا مجال کہ ہماری مانند کوئی سرخ لائٹ پر نہ رکے، لین توڑ دے، یوں ہی دائیں بائیں کو نکل جائے یا بلاوجہ گاڑی کے سامنے سے یوٹرن لے۔ سائیکلوں کے لیے مخصوص ٹریک ہے۔ سائیکل اس کے اندر رہے گی اور نہ ہی کار والا سائیکل ٹریک میں داخل ہوگا۔ لوگ قواعد کے مطابق چلتے ہیں اس لیے ہماری مانند وہاں ہر چوک پر پولیس والے بھی نظر نہ آئے۔ نہ جانے وہاں کی پولیس بالائی آمدنی کہاں سے حاصل کرتی ہوگی کیونکہ بالائی آمدنی کی سہولتیں حاصل نہیں، اسی لیے وہاں کے پولیس والے کچھ ماٹھے ماٹھے سے دکھائی دیئے، وردی کے باوجود بھی۔

میں عمر بھر سائیکل سوار رہا، اتنا کہ کیریئر گویا سائیکل کے کیریئر میں تبدیل ہو گیا۔ اس لیے سائیکل سوار چینیوں کو دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ یورپ میں ڈنمارک ایسا ملک ہے جسے با آسانی سائیکل دیس قرار دیا جا سکتا ہے۔ چھ فٹ کی ڈینش عورت منی اسکرٹ پہنے جب سفید چمکیلی رانوں اور مضبوط پنڈلیوں سے سائیکل پر پیر جمائے ہو تو دیدہ زیب جزئیات کی بدولت یہ منظر دیدنی ہوتا ہے۔ یوں کہ

سائیکل کسی اور ہی سواری میں تبدیل ہو جاتی ہے مگر ساڑھے چار فٹ اوسط قد کی چینی لڑکی ایسا سہانا منظر پیش نہیں کر سکتی۔

چھوٹے قد کی وجہ سے ان کی سائیکلیں ہمارے بچوں کی سائیکلوں کے قد کی ہیں۔ اسی طرح رکشا بھی بالکا سا نظر آیا بلکہ چینیوں کے درمیان چلتا میں خود کو للّی پٹ میں گلیور محسوس کرتا۔ گلیور والی مثال سمجھ میں نہ آئے تو یوں سمجھیے کہ ساڑھے چار فٹ والوں کے درمیان میں اچھا خاصا امیتابھ بچن بن گیا۔

چھوٹے قد کی مناسبت سے بعض مشاہدات دلچسپ ثابت ہوئے۔ میں ایک پبلک بیت الخلاء میں گیا تو وہاں ویسٹرن کموڈ کے برعکس اپنے مشرقی طریقے نے جہاں متعجب کیا وہاں یہ بھی نوٹ کیا کہ ان کے قد کی مناسبت سے یورینل بھی بہت چھوٹے اور نیچے نظر آئے۔ مجھے محسوس ہوا گویا میں کوٹھے پر سے نیچے دھار مار رہا ہوں یوں کہ اچانک نیچے سے ایک چینی چلاّئے گا:

''اوئے کی پیا کرناں ایں۔''

میں نے تخمینہ لگایا کہ چھوٹے قد کی وجہ سے ان کے کمروں کی چھتیں سات آٹھ فٹ کی ہو سکتی ہیں جبکہ ہماری چھت اوسط دس فٹ کی ہوتی ہے۔ گویا چار منزل کی چھتوں کی بچت سے ایک منزل مفت میں حاصل ہو جاتی ہے۔ بچت ہی بچت۔

مسافر نواز

آتش نے کہا تھا:

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے

اس شعر کا مفہوم عملی طور پر بیجنگ میں سمجھ آیا۔

ہم دوستوں نے شاپنگ کی مگر ہاتھ کی لکیروں جیسی سڑکوں پر ہوٹل کا راستہ بھول گئے۔ رات زیادہ نہ گزری تھی۔ سڑکیں لوگوں سے چھلک رہی تھیں۔ نیون سائز کے خوبصورت رنگوں میں چینی زبان کے الفاظ تصاویر جیسے دلکش نظر آ رہے تھے۔ میرے ساتھی آگے نکل گئے اور میں خوش منظر سڑک میں گم پیچھے رہ گیا۔

تب اچانک مجھ سے کسی نے پوچھا:

"Do you speak English?"

میں انگریزی میں تیس مار خان تو نہیں لیکن چینیوں جتنی بلکہ شاید ان سے بھی بہتر انگریزی تو بول ہی سکتا ہوں۔

یہ نوجوان جوڑا تھا۔ لڑکی نے سوال کیا تھا اور میرا اثبات میں جواب سن کر اس نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے پوچھا:

''کہاں سے آنا ہوا؟''

''پاکستان۔'' میں نے جواب دیا اور ساتھ ہی پوچھا ''تم پاکستان کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟''

''بالکل۔'' وہ ہنس کر بولی۔ ''پاکستان ہمارا عظیم ہمسایہ اور قابل اعتماد دوست ہے۔''

یہ سن کر میں بے حد خوش ہوا۔

پھر اس نے پوچھا ''یہاں کس سلسلے میں آنا ہوا؟'' میں نے اسے اہلِ قلم کے دورے کے بارے میں بتایا۔ ادیبوں کے وفد کا سن کر وہ خاصی مرعب ہوئی۔ اب تک جو گفتگو ہوئی وہ ویسی تھی جیسی کسی اجنبی سے کوئی متجسس عورت کر سکتی تھی مگر اس نے یہ پیشکش کر کے مجھے متعجب کر دیا۔

''میرا گھر قریب ہی ہے۔ اگر تم پسند کرو تو میں تمہیں چائے پلا سکتی ہوں۔''

میں نے شکریہ ادا کیا اور اسے بتایا کہ میں دوستوں کے ساتھ ہوں۔ بولی ''کوئی بات نہیں، وہ سب بھی چلیں۔''

میں نے معذرت کی اور اسے بتایا کہ وہ سب آگے کھڑے اشاروں سے مجھے بلا رہے ہیں۔

میں نے ایک مرتبہ پھر اس کی پیشکش کا شکریہ ادا کیا، معذرت کی اور واپس آ کر ساتھیوں کو لڑکی کی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ مشتاق احمد یوسفی صاحب نے یہ کہہ کر میرے غبارے میں پِن چبھو دی۔

''سلیم صاحب، وہ کسبی ہوگی اور آپ کو پھانس رہی ہوگی۔''

میں نے عرض کیا ''مجھے پھانس کر میرا کیا بگاڑ لیتی؟ میں تو نقاد ہوں۔'' اس پر سب نے قہقہہ لگایا۔

میں انہیں بتاتا ہوں کہ ''وہ میک اپ کے بغیر سادہ لباس میں تھی، نہ شوخ رنگ، نہ ادائیں اور نہ ہی اس کی گفتگو میں ترغیب کے کنائے۔''

یوسفی صاحب بولے ''صاحبو! لندن میں طوائفیں کس طرح مردوں کو پھانستی ہیں آپ اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔'' اس کے بعد انہوں نے طوائفوں کے حوالے سے بڑی معلومات افزا گفتگو کی کہ طوائفوں کی کتنی اقسام ہیں۔ گاہک پھانسنے کی تکنیک میں کتنا تنوع ہے۔ کس قماش کی طوائف کا کیا ریٹ ہے اور پھر یہ کہ دلال کیسے طوائفوں اور ان کے گاہکوں کا استحصال کرتا ہے۔ مزید یہ کہ رنگے ہاتھوں پکڑے جاؤ تو کس جنسی جرم کی کیا سزا ہے۔ میں نے فسانۂ عجائب قسم کی یہ گفتگو سنی تو یہ سوچتا رہ گیا

کہ کیا واقعی یہ بینکر ہی تھے۔

میرا راستہ روکنے والی یہ لڑکی استثنائی مثال نہ تھی۔ ایک اور لڑکی نے بھی اسی طرح انگریزی میں گفتگو شروع کر دی۔ دن کا وقت تھا اور ہم گلیوں اور بازاروں میں سے گزر رہے تھے جنہیں لاہور کا اچھرہ، کراچی کا لالوکھیت، پشاور کا قصہ خوانی اور دہلی کا لاجپت نگر قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہاں چین کی وہ تمام قدیم اور روایتی اشیاء، کپڑے، موتی، کھلونے اور ڈیکوریشن پیسز بک رہے تھے جو کسی بھی دیس کے ٹورسٹ کے لیے خریدنے ضروری ہوتے تھے۔ ہم اپنی اپنی ضرورت کی اشیاء الگ الگ خرید رہے تھے کہ ایک لڑکی نے مجھے روک کر باتیں شروع کر دیں۔ وہی سوال کہاں سے آئے ہو، کیوں آئے ہو، وغیرہ وغیرہ۔

اس نے اچانک پوچھا:

''شاپنگ تو کرنی ہوگی؟''

میں نے کہا ''ضرور کرنی ہے۔ شاپنگ کے بغیر گھر گیا تو بیوی دروازہ نہ کھولے گی۔''

اس نے خوشدلی سے قہقہہ لگاتے ہوئے شاپنگ گائیڈ کا کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔ بولی

''پیور سلک فلاں سٹور سے لینا، موتی لینے ہوں تو وہ دکان بہتر رہے گی......''

پہلے میں نے سوچا، شاید دکانداروں نے بھولے بھالے غیر ملکیوں کو پھانسنے کے لیے اسے یا اس جیسی لڑکیوں کو چھوڑ رکھا ہوگا کہ گاہک پھانس کر اپنی دکان پر لے آئیں مگر اس نے مجھے کسی خاص دکان پر لے جانے کی پیشکش نہ کی۔ اگر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر چلتی تو میں بہ رضا و رغبت اس کے ساتھ اس کی پسندیدہ دکان پر چلا جاتا مگر نہیں۔ اس نے ایسا کچھ نہ کیا۔ کچھ دیر تک اسی طرح باتیں کرتی رہی اور پھر چل دی۔

میں جوان نہیں، ڈیشنگ ہیرو بھی نہیں۔ ہیرو کیا میں تو ڈھنگ کا ولن بھی نہیں مگر دو تین مرتبہ لڑکیوں نے اور ایک مرتبہ ایک مرد نے بھی راستہ روک کر گفتگو شروع کر دی۔ میرا خیال ہے کہ لمبے قد اور الگ رنگت کی وجہ سے میں نمایاں طور پر غیر ملکی نظر آتا ہوں گا اور اسی لیے متجسس لڑکیوں اور ایک مرد نے گفتگو شروع کر دی، لہٰذا بین السطور کچھ اور پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اس بات سے یقیناً مسرت ہوئی کہ یہ سبھی پاکستان کے بارے میں جانتے تھے اور محبت سے تذکرہ کیا بلکہ مرد نے تو مجھے پاکستان کا محل وقوع اور دیگر کوائف بھی سنا دیئے۔

لڑکیوں کی یوں پہل قدمی سے یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یورپ کی مانند چین کی مؤنث اپنی جنس کے بارے میں ہماری مونثوں کی مانند خود شعوری میں مبتلا نہیں...... ہائے اللہ! ایہہ تے

مینوں چھیڑے گا!

دلچسپ بات سنیے۔

پشاور کے پروفیسر داؤد خان واحد ساتھی تھے جو شلوار قمیض میں ملبوس اور ریش دراز تھے۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری جتنے شوخ اور فقرے باز تھے پروفیسر داؤد اتنے ہی سنجیدہ اور خاموش طبع۔

ہم دونوں ایک بازار میں سے گزر رہے تھے کہ نوجوان چینی لڑکوں نے روک لیا۔ وہ انگریزی نہ جانتے تھے مگر اندازہ ہوا کہ وہ پروفیسر صاحب کے ساتھ تصویریں بنوانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے خوشی خوشی ان کے ساتھ تصویریں بنوائیں بلکہ ان کی دیکھا دیکھی اور لڑکے لڑکیوں نے بھی ان کے ساتھ تصویریں بنوالیں۔

''واہ پروفیسر صاحب۔'' میں نے کہا ''آپ کی داڑھی تو ہِٹ ہوگئی۔ ہمیں تو کسی نے سوکھے منہ بھی نہ پوچھا اور آپ ہیں کہ ماڈلنگ شروع کر دی ہے۔''

پروفیسر صاحب بھی میرے قہقہے میں شریک ہوگئے۔

نامعلوم چینیوں کے جین میں کیا خرابی ہے کہ وہ کم مُو ہوتے ہیں۔ کنپٹیوں اور ٹھوڑی پر گنتی کے چند بال (فائدہ: شیو کے اخراجات کی بچت) سر پر چھوٹے چھوٹے سخت بال جو عموماً برش کی طرح کھڑے رہتے ہیں۔ لڑکیوں نے البتہ تراش سے چھوٹے بالوں کے مختلف سٹائلز بنا لیے ہیں جو ان کے کتابی چہروں پر سجتے بھی ہیں۔ اب آپ تصور کیجیے ایسے شخص کا جس کی داڑھی شرعی لمبائی والی ہو یقیناً چینیوں کے لیے یہ ویسا ہی اچھنبے کا تماشا ہوگا جیسے بونوں کے دیس میں عالم چنا کا۔

بہرحال ان چھوٹے چھوٹے واقعات سے اندازہ ہوگیا کہ بحیثیت مجموعی چینی کھلے ذہن اور اچھے دل کے مالک ہیں۔ اس لیے گفتگو میں پہل کرتے اور خندہ جبینی سے ملتے ہیں۔ خوش اخلاقی سے چھوٹے قد میں اضافہ کر لیتے ہیں مگر ہم؟

مجھے دنیا کے دیگر ممالک میں زیادہ جانے کا موقع نہیں ملا، تاہم اپنے اور یاروں کے مشاہدات کی روشنی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہمیں سب سے زیادہ برا امریکہ، برطانیہ یا روس میں نہیں سمجھا جاتا بلکہ عرب شریف میں پاکستانی ملازم، مزدور، کارکن وہاں تقریباً غلام جیسی زندگی بسر کرتا ہے۔ ہم جہاں بھی جاتے ہیں اپنی محدود زندگی کے تعصّبات، نفرتیں، سازشیں اور گھناؤنا طرزِ عمل زادِ راہ کے طور پر ساتھ رکھتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اسے درست اور جائز بھی سمجھتے ہیں۔ شاید ہی کوئی بابرکت جمعہ ایسا ہو جب جدہ کی مسجد کے باہر مجمع عام میں کسی نہ کسی پاکستانی کا سر قلم

نہ کیا جاتا ہو، سمگلر یا قاتل......

ہم کہاں کھڑے ہیں۔ ہر پاکستانی بھنّایا ہوا، بدمزاج، غلیظ زبان اور ہتھ چھٹ، گولی پہلے مارتا ہے اور وجہ بعد میں بتاتا ہے۔ ہمارے پاس اس ضمن میں اگرچہ اعداد و شمار تو نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ فی کس پھانسی کا تناسب ہمارے ہاں ضرورت سے زیادہ ہے۔ علامہ اقبال ہمیں مردِ مومن بنانا چاہتے تھے مگر ہم تو Bloody Paki بن کر رہ گئے۔

زبانِ یارِ من: کیلکولیٹر

ابھی شاپنگ کا ذکر ہوا تو چین جائے بغیر کوئی شخص وہاں شاپنگ کے مزے یا بدمزگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ہمارے جو دوست چین جا چکے تھے، انہوں نے سمجھایا تھا کہ وہاں ٹھیک ٹھاک بھاؤ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مرد لوگ بالعموم قیمت کم کرانے کے لیے بحث بلکہ زیادہ بہتر تو یہ ہے کہ کج بحثی نہیں کر سکتے۔ یہ عورتوں کا شعبہ ہے کہ زبان ان کی ایسے مواقع پر اعلیٰ ہتھیار میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ عورت کو خریداری سے اتنی دلچسپی نہیں ہوتی جتنی بھاؤ تاؤ کرنے اور دکاندار سے بحث کرنے میں ہے۔ بس یوں سمجھیے کہ لذت النساء لذت اللسان ہے۔

یہ تو ہوا ہمارے ہاں، جہاں مرد بیچتا ہے اور عورت خریدار ہوتی ہے جبکہ چین میں صورتحال برعکس نظر آتی ہے، بیچنے والی عورتیں اور خریدار ہم جیسے غیر ملکی اور ٹورسٹ۔

میں یہ نوٹ کیے بغیر نہ رہ سکا کہ چین میں تمام کام بلکہ ہر طرح کا کام عورتیں ہی کرتی ہیں۔ ایک وجہ تو نسوانی آبادی کا تناسب ہو سکتا ہے۔ مرد عورت تقریباً نصف نصف ہیں۔ دوسری وجہ اقتصادی صورتحال جس کے باعث عورت گھر میں رانی بن کر نہیں سج سکتی۔ خیر گھر کی رانی تو محض کلیشے ہے۔ عورت کہیں بھی گھر کی رانی نہیں ہوتی۔ نہ یورپ امریکہ میں نہ چین میں اور نہ ہی پاکستان میں۔ چین میں عورتیں وہ کام بھی کرتی دیکھی گئیں جو روایتی طور پر مردوں کے لیے مخصوص سمجھے جاتے ہیں مثلاً ایئرپورٹ پر سکیورٹی کا سارا کام عورتوں کے ذمہ تھا۔ جب پتلے ڈیل کی ساڑھے چار فٹ کی لڑکی نے کسی ڈشکرے کی مانند ٹٹول کر تلاشی لی تو مجھے بڑا مزا آیا تلاشی دینے میں۔ مزا کیا گُت کتاریاں ہونے لگیں۔ دن بھر میں سینکڑوں مردوں کی تلاشی لے کر وہ عورتیں کتنی بدمزہ ہوتی ہوں گی، کون جانے؟

میں نے استفسار کیا، تمام کام تو عورتیں کر رہی ہیں۔ یہاں مرد کیا کرتے ہیں؟ جواب ملا، وہ زیادہ کمائی والے بہتر کام کرتے ہیں۔ شاید کچھ عورتیں بھی زیادہ کمائی والا بہتر کام کرتی ہوں۔

شاپنگ کے سلسلے میں یہ ذہن نشین رہے کہ ہم چینی نہ جانتے تھے جبکہ انہیں اردو تو خیر کیا آنی تھی انگریزی بھی برائے نام بول سکتی تھیں۔ چین جانے سے پہلے سعودی عرب میں زبان نہ جانے بغیر شاپنگ کا تجربہ ہوا۔ فٹ پاتھ پر عرب عورتیں سامان لیے بیٹھی تھیں۔ ایک چیز اٹھائی اور ہاتھ کے اشارے سے قیمت پوچھی۔

اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کھول دیں۔

جواباً ہم نے صرف ایک ہاتھ کی انگلی کھلی رہنے دی۔

وہ بولی ''لا۔''

اب یا تو ہم خاموشی سے مطلوبہ رقم ادا کر کے چیز خرید لیں گے ورنہ اس ''لا'' کے جواب میں ہم بھی ''لا'' کہہ دیں گے۔

چین میں زبان یار کا کردار کیلکولیٹر ادا کرتا ہے۔ میں ان معاملات میں خاصا پھسڈی ہوں کہ میں تو کیلکولیٹر کا استعمال ہی نہیں جانتا۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری اس معاملے میں کیلکولیٹر جیسے ہی تیز ثابت ہوئے۔ چیز اٹھائی قیمت پوچھی:

لڑکی کیلکولیٹر اٹھاتی اس کی پتلی (اور غالباً نرم) انگلیاں مختلف اعداد کے بٹن دباتیں اور قیمت سامنے کر دیتی۔ فرض کریں ایک سو یوآن، جواب آں غزل کے طور پر شاہ محمد مری صاحب اس کے ہاتھ سے کیلکولیٹر لے کر ٹک ٹک کرتے اور نتیجہ لڑکی کے سامنے کر دیتے یعنی بیس یوآن۔

''نو۔نو۔'' وہ چیختی مگر ساتھ ہی ہنستی بھی۔

کیلکولیٹر ان کے ہاتھ سے لے لیتی، پھر ٹک ٹک پھر نئی قیمت، اِدھر سے بھی یہی عمل اور نئی پیشکش۔ الغرض! کیلکولیٹر کا پیانو بجتا رہا اور اس کی دھن پر یوآن کی لے میں کمی بیشی ہوتی رہتی حتیٰ کہ یا وہ مان جاتی یا ہم نہ مانتے لیکن وہ آسانی سے نہ جانے دینے والی نہیں Look Here, Come Here کہہ کر بازو سے پکڑ کر پھر کاؤنٹر کی جانب لے جاتیں اور ساتھ ہی ہنستیں۔ جی ہاں چینی دکاندار لڑکیاں غالباً دن میں اتنے یوآن نہ کماتی ہوں گی، دن بھر میں جتنا ہنستی ہوں گی۔ کیا یہ ہنسی مزاج کا حصہ ہے یا گاہکوں سے بک بک جھک جھک کے پیدا کردہ اعصابی تناؤ سے چھٹکارے کا ایک انداز یا پھر خالی کیموفلاج۔

کشور ناہید کی ابتدائی عمر کا شعر ہے:

دیکھ کر جس شخص کو ہنسنا بہت
ہم کو اس کے سامنے ڈھکنا بہت

تو صاحب! لڑکیوں کی ہنسی بڑی ملٹی پرپز قسم کی ہوتی ہے۔

چینی لڑکیاں گاہکوں کے لیے جو ہنسی استعمال کرتی ہیں، یقیناً وہ شوہر، محبوب، بوائے فرینڈ کے لیے نہ ہوگی اور جب سنور کر آئینہ میں خود کو دیکھ کر خوشی سے ہنستی ہوں گی تو وہ ہنسی کیسی ہوگی؟

مشتاق احمد یوسفی صاحب بہت بڑے بینکر تھے۔ شاید کروڑوں اور اربوں کی رقم کے چیکوں پر دستخط کیے ہوں گے لیکن اس معاملے میں وہ بھی اپنے جیسے ہی ثابت ہوئے......

جب شاہ محمد مری صاحب اور ان صاحبہ کا باہمی اطمینان ہو جاتا کہ معاملہ جانبین کی مرضی کے مطابق بخیر وخوبی طے پا گیا تو پھر ہم بھی خاموشی سے قیمت ادا کر دیتے۔ بعد میں تو یہ بھی ہونے لگا کہ مجھے اگر کچھ خریدنا ہوا تو بھاؤ شاہ صاحب ہی کرتے۔

ایک کاؤنٹر سے میں نے تنہا خریداری کی، طرحدار لڑکی کے ساتھ ایک برخوردار قسم کا چھوکرا جو اس کے حکم پر بھاگ بھاگ کر چیزیں لاتا دکھاتا اور پھر واپس رکھتا۔ دونوں اچھی خاصی انگریزی بول سکتے تھے۔ سو میں نے ان سے اِدھر اُدھر کی باتیں بھی شروع کر دیں۔ ویسی ہی بے ضرر سی جیسی کوئی ٹورسٹ پوچھ سکتا ہے مگر میری افسانہ نگاری کی حس ان دونوں میں جو ایک غیر مرئی سا تعلق تھا، اسے محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔

میں نے لڑکی سے پوچھا:

''تم دونوں شادی شدہ ہو یا یہ تمہارے ساتھ کام کرتا ہے؟''

"Oh, No, We are not married."

وہ شرمائے بغیر بولی۔ لڑکا خوشی سے آنکھیں جھپکاتا، چکور بنا، اسے دیکھے جا رہا تھا۔

"Hope to marry one day"

میں نے پوچھا تو لڑکا خوشی سے بولا "Yes, Yes."

"My Blessings"

میں نے ہاتھ اٹھا کر آشیر باد دی۔

مگر اس گفتگو کے دوران لڑکی کے چہرے پر خوشی، چاہت، تمنا کی وہ سرخی نظر نہ آئی جس سے زرد خوبانی انار میں تبدیل ہو جائے مگر لڑکا خوشی سے کھلا جا رہا تھا۔ تب میں نے اندازہ لگایا کہ فی الحال معاملہ یکطرفہ ہے۔ ان دونوں سے اچھی اچھی باتیں تو ہوئیں مگر بدبختوں نے ایک یوآن کی بھی رعایت نہ کی۔

⌘⌘⌘⌘⌘⌘⌘⌘

چین: اک جہاں سب سے الگ

امریکہ دیکھا تو ''کلچرل شاک'' کے معانی سمجھا کہ وہاں کی معمولی چیزیں، عام باتیں اور روزمرہ کے معمولات بھی غیر معمولی سے ہوتے ہیں۔ چین گئے تو وہاں بھی قدیم وجدید کی صورت میں بہت کچھ دیکھا مگر ''کلچرل شاک'' کے نام پہ 440 وولٹ کے جھٹکے لگنے کا احساس نہ ہوا۔ شاید اس لیے کہ جدید کی دوڑ میں شامل ہونے کے باوجود بھی چین کی روح مشرقی ہے۔ مشرق کی یہ اساسی صفت ہے کہ لاکھ تغیر آشنا ہونے کے باوجود بھی مشرقی پن برقرار رہتا ہے۔ ہماری مانند چین بھی اس کی مثال ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اب وہاں عورتیں قدیم رواج کے مطابق تین انچ کے مختصر ترین پاؤں کی تکلیف کی زنجیر سے بندھی زیست کر لیتی ہیں لیکن ساڑھے چار فٹ کی نو انچ لمبے پاؤں والی اپنے جینز اور کروموسومز میں تین انچ پاؤں والی ہی ثابت ہوتی ہے۔

تہذیبی اور ثقافتی ورثہ

چینی تہذیب دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک ہے ہم کیونکہ انگریزی میں یورپ ہی کا مطالعہ کرتے ہیں اس لیے ہمارے لیے تمام فلسفہ، سائنس، ڈراما، فنون لطیفہ اور دانش و برہان یونان کے مترادف ہے لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یونان سے بھی قدیم تہذیبیں مصر، ہندوستان اور چین کی ہیں اور ان تینوں میں سے بھی مصر سب سے زیادہ قدیم ہے۔ جس وقت ہندوستان میں آریہ کی آمد ہو رہی تھی، اس وقت تک مصر کے فراعنہ اہرام تعمیر کر چکے تھے۔ چین کی تہذیبی روایات مستحکم ہو چکی تھیں۔ ریشم، کاغذ، بارود کے علاوہ امراض کے علاج کا مربوط نظام (جس کی ایک مثال آکوپنکچر ہے) مارشل آرٹس اور متعدد دیگر اشیاء چینیوں نے دنیا کو دیں اور پھر جیسا کہ دستور ہے ''جدید'' بننے کے جوش میں ''قدیم'' متروک پاتا ہے لہٰذا سوشلسٹ انقلاب کے بعد قدیم ثقافتی ورثہ سے بے اعتنائی کے رجحان نے فروغ پایا جس کا نقطہ عروج ماؤزے تنگ کے ثقافتی انقلاب میں ہوا جس نے 67-1966ء

کے عرصہ میں چین کے بخیئے ادھیڑ دیئے تو سرخ کتب سے مسلح نوجوانوں نے...... جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹادو......کو قومی فریضہ جان کر شعارِ زیست میں تبدیل کر دیا۔

ہمارے جانے تک حالات تبدیل ہو چکے تھے اور اب چینی اپنے قدیم تاریخی، ثقافتی اور تخلیقی ورثہ پر فخر کرتے ہیں۔ تمام شہروں میں بڑے بڑے میوزیم دیکھنے کو ملے اور قدیم شاہی عہد کی عمارات، محلات، باغات اور دیگر آثار کو سلیقہ سے محفوظ کیا گیا ہے اسی طرح قدیم دور کے مندر اور معبد بھی اب دلچسپی سے دیکھے اور فخر سے دکھائے جاتے ہیں۔

جہاں تک عجائب گھر دیکھنے کا تعلق ہے تو ہم نے بیجنگ، شنگھائی اور ژونگ ژو تینوں شہروں کے خوش ذوقی سے مرتب کردہ عجائب گھر دیکھے۔

کسی بھی ملک کے عجائب گھر اس ملک کی قدیم تاریخ، تہذیب، کلچر، آرٹ وغیرہ کے بارے میں نہ صرف معلومات اور کوائف ہی مہیا کرتے ہیں بلکہ نوادر کی صورت میں زندہ درس گاہ کی صورت بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ متذکرہ ملک نے جو تہذیبی اور ثقافتی سفر صدیوں میں طے کیا تھا، دو تین گھنٹے کی سیر میں اس کا اندازہ ہو جاتا ہے اور یہی ہم نے محسوس کیا۔ چین کی ہزاروں برس قدیم تاریخ، ثقافت اور تہذیب اشیاء کی صورت میں ہمارے سامنے تھی اور اپنا یہ عالم...... حیران ہوں ان آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں؟

ان عجائب گھروں میں قدیم چین کے ملبوسات، برتن، فرنیچر، مصوری، خطاطی، عمارت سازی، فنونِ لطیفہ، موسیقی کے آلات، Jade کی اشیاء، چھوٹے چھوٹے مجسمے، زیورات اور اشیائے تزئین۔

''جیڈ'' سبز، نیلے اور سفید رنگ کا پتھر ہے جو چینیوں میں مقبول بھی ہے اور محبوب بھی۔ روایتی طور پر اسے مافوق الفطرت خواص کا حامل بھی سمجھا جاتا ہے اور موجب خیر و برکت بھی، چینیوں میں جیڈ پسندیدہ تحفہ ہے۔ دینا بھی اچھا لگتا ہے اور لینا بھی، شاید اسی لیے ژونگ ژو میں ہماری راہنما خاتون میاؤ می لنگ (Miao Mei Ling) نے ہم سب کو جیڈ کا ایک ایک موتی تحفہ کے طور پر دیا۔

عجائب گھر کے متعدد فوائد ہیں اور میں اس کی ضرورت، افادیت اور اہمیت کا قائل بھی ہوں لیکن میں یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ عجائب گھر کی سیر ایک تیز رفتار فلم سے مشابہت رکھتی ہے۔ ذہن پر اس تیزی سے تاثرات مرتسم ہوتے ہیں اور ہر نئی چیز دیکھ کر منہ سے اتنی مرتبہ واہ واہ نکلتی ہے کہ بالآخر کسی ایک چیز کا تاثر بھی ذہن میں نہیں رہنے پاتا۔ اس لیے میں اگر چاہوں بھی تو کسی ایک بھی عجائب گھر کی مکمل طور پر سیر نہیں کرا سکتا، تاہم اس امر پر یقیناً زور دوں گا کہ چینیوں نے ماضی کا ورثہ بڑے سلیقہ سے سنبھال کر بلکہ سجا کر رکھا ہے۔

دیوار: جواں ہے گردشِ سحر و شام کے درمیاں

یہ تو ہوا ماضی کا وہ ثقافتی ورثہ جو ایئر کنڈیشنڈ ماحول میں شیشے کی الماریوں میں بند ہے اور ایک ماضی کا وہ تاریخی ورثہ ہے جو عمارات کی صورت میں نظر آتا ہے۔ بادشاہوں یا امراء، وزراء نے ضرورت یا شوق کے تحت عمارات، باغات، مقابر تعمیر کرائے مگر ہوا یہ کہ بعض عمارتیں ملک کی پہچان یا علامت کا درجہ اختیار کر لیتی ہیں جیسے اہرام، تاج محل، دیوارِ چین، لیننگ ٹاور، جدید دور میں امریکہ میں آزادی کا مجسمہ اور پیرس کا ایفل ٹاور۔

اب دیوار کا ذکر چلا تو یاد آ رہا ہے کہ ایک اور دیوار بھی عالمی شہرت کی حامل ہے اور وہ ہے یروشلم میں یہودیوں کی دیوارِ گریہ۔ جس کے بارے میں یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ یہ حضرت سلیمان کے تعمیر کردہ ہیکل کا حصہ ہے۔ مدتوں تک یہودی اس دیوار کو پکڑ کر گزشتہ عظمت کو یاد کر کر کے روتے رہے اسی لیے اس کا نام دیوارِ گریہ پڑ گیا۔

ویسے اپنے ہاں بھی ایک دیوار مشہور ہے اور وہ ہے ظالم سماج کی دیوار جو اب گریڈوں کی غیر مرئی دیوار میں تبدیل ہو چکی ہے۔

بیجنگ سے دو گھنٹے کی ڈرائیو اس قدیم دیوار پر ختم ہوتی ہے جو تقریباً ڈیڑھ ہزار برس قبل منگول حملہ آوروں کو روکنے کے لیے تعمیر کی گئی تھی اور جو عمارت سازی میں چینیوں کی ہنرمندی کا زندہ ثبوت ہے کہ......اس میں پیدا کچھ نہیں دیرینہ روزی کے نشاں!

دیوار نے اتنی لمبی عمر کیسے حاصل کی؟ سیدھی سی وجہ ہے کہ پاکستانی ٹھیکیداروں کے پاس تعمیر کا ''ٹینڈر'' نہ تھا۔ اس سے اخلاقی سبق یہ حاصل ہوتا ہے کہ اچھے نتائج کے حصول کے لیے بدنیت افراد سے اجتناب لازم ہے ورنہ آج اس کا بھی حال ''مارگلہ ٹاورز'' جیسا ہوا ہوتا۔

جب تک دیوار نہ دیکھی تھی تو میرا خیال تھا کہ یہ پہاڑیوں کے نیچے بنی ہو گی مگر دیکھی تو دیکھا کہ یہ تو پہاڑیوں کے بلند کناروں پر تعمیر ہوئی ہے۔ بے حد فراخ اور مناسب وقفوں پر، دشمنوں یا موسم سے محفوظ رہنے کے لیے برج۔

منفی پانچ درجہ کی یخ ہوا کے جھکڑ گویا قدم اکھاڑنے کو ہوں، یہاں دنیا بھر کے ٹورسٹوں کا اجتماع تھا اور وہی چیزیں بک رہی تھیں جو ایسے مقامات پر بک سکتی ہیں یعنی ڈیکوریشن پیسز اور دیوار کے طرح طرح کے ماڈل، وہی عورتیں اور ان کے کیلکولیٹر۔ ہر یاترا کا آخری حاصل یہی ہوتا ہے، کچھ خریداری اور کچھ تصویریں۔ بت تو ساتھ نہ تھے اس لیے احباب پر گزارا کرنا پڑا۔ مشتاق احمد یوسفی،

ڈاکٹر شاہ محمد مری، اظہار الحق اور پروفیسر داؤد...... ہم ان کے بت بنے اور یہ ہمارے!

میں دیوار کی تاریخ بیان نہیں کر رہا کہ چین کے بارے میں تحریر کردہ ہر سفرنامہ میں دیوار کے بارے میں معلومات و کوائف مل سکتے ہیں اس لیے میں آپ کو وہ عوامی کہانی سناتا ہوں جو سطوت شاہی کے اس مظہر کے بارے میں مشہور ہے۔

دیوار کی تعمیر کے لیے ہزار ہا مردِ بیگار میں پکڑے گئے تھے۔ جب گاؤں کے ایک نوجوان وان کو پکڑنے کے لیے سرکاری اہلکار آئے تو وہ ایک باغ میں چھپ گیا جہاں اس کی ملاقات چنگ ژیانگ سے ہوگئی جس کے والدین نوجوان وان کو تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگتے ہیں اور والدین ان کی شادی کر دیتے ہیں مگر سہاگ رات کو شاہی اہلکار وان کو گرفتار کر لیتے ہیں، رخصت کے وقت چنگ ژیانگ نے اپنے سیاہ چمکیلے بالوں سے موتیا رنگ کا کلپ نکال کر اس کے دو حصے کیے اور ایک حصہ اسے دیتے ہوئے کہا "یہ تمہیں میری یاد دلاتا رہے گا۔"

موسم سرما کی آمد نے یہ یاد دلایا کہ اس کا شوہر گرم کپڑوں کے بغیر سردی سے ٹھٹھر رہا ہوگا۔ اس نے شوہر کے لیے اونی ملبوسات تیار کیے اور نکلی اس کی تلاش میں۔ ہرج مرج کھینچتی جب وہ مقام تعمیر پر پہنچی تو یہ معلوم ہوا کہ اس کا خاوند مر چکا ہے اور اس طرح کہ مرنے والے لاتعداد بے نام مزدوروں کے ساتھ اس کا مردہ جسم زیر تعمیر دیوار میں چُن دیا گیا ہے۔

غم سے نڈھال چنگ ژیانگ نے مرحوم شوہر کے لیے آہ و زاری شروع کر دی۔ ایسی آہ و زاری جس نے فطرت کو بھی ہلا دیا چنانچہ ایک رات شدید طوفان اور زلزلہ کے نتیجے میں دیوار نے ان لاکھوں بے کفن مُردوں کو اُگل دیا جن کے لیے وہ سنگی لحد بن چکی تھی۔ ان ہی نعشوں میں اس کا خاوند بھی تھا جس کے ایک ہاتھ میں چنگ ژیانگ کی دی ہوئی نشانی سفید کلپ کا نصف ٹکڑا بھنچا ہوا تھا۔ خاوند کی لاش سے لپٹ کر گریہ و زاری کرتی چنگ ژیانگ کو سپاہی بادشاہ کے پاس لے جاتے ہیں جو غم کی ماری چنگ ژیانگ کا حسن دیکھ کر اسے شادی کی پیشکش کر دیتا ہے۔ وہ مان تو جاتی ہے مگر مناکحت کے لیے دو شرائط رکھتی ہے۔ اول اس کے شوہر کو مناسب طریقہ سے دفن کیا جائے اور دوم بادشاہ سیاہ ماتمی لباس پہن کر مرنے والے تمام مزدوروں کی ایک یادگار بنانے کا اعلان کرے۔ بادشاہ ایسا ہی کرتا ہے مگر چنگ ژیانگ خودکشی کر کے دل گرفتہ بادشاہ کو سوگ منانے کے لیے چھوڑ جاتی ہے۔

اب اس تناظر میں ساحر کی "تاج محل" کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

یہ عمارات و مقابر یہ فصیلیں یہ حصار
مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستون

سینۂ دہر کے ناسور ہیں، کہنہ ناسور
جذب ہے ان میں ترے اور مرے اجداد کا خون

مری محبوب انہیں بھی تو محبت ہوگی
جن کی صناعی نے بخشی ہے اسے شکلِ جمیل
ان کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام و نمود
آج تک ان پہ جلائی نہ کسی نے قندیل

تاہم ذاتی احساس کا بیان ضروری ہے ایسا احساس جو غالباً میرا ہی ہوگا۔ ہم مشہور عمارات جیسے اہرام، تاج محل، ایفل ٹاور، لیننگ ٹاور وغیرہ کی اس کثرت سے تصاویر دیکھ چکے ہوتے ہیں کہ دیکھنے پر کوئی اتنا خاص اچنبھا یا تھرّل محسوس نہیں ہوتا۔ ہاں بھئی! تاج محل ویسا ہی ہے جیسا تصاویر میں نظر آتا تھا اور دیوار بھی اسی دیوار جیسی ہے جسے ہم برسوں سے دیکھتے رہے ہیں۔ اسی طرح اگر پیرس گیا تو یہی محسوس ہوگا کہ یہ سٹیل کا ویسا ہی سٹرکچر ہے جیسا لاتعداد فلموں اور فوٹوگرافس میں دیکھا تھا۔

میرے خیال میں اصل مزا صرف اسی وقت آ سکتا ہے جب دیکھنے سے پہلے اس کے بارے میں نہ تو علم ہوا ور نہ ہی اس کی کوئی تصویر دیکھی ہو۔ تب اہرام، تاج محل اور دیوار پر پہلی نظر ڈالتے ہی دل میں جو احساسات اور کیفیات پیدا ہوں گی ان میں اصل تھرّل ہوگا ورنہ تو ڈیکوریشن پیسز کی خریداری اور ٹیڑھی بوتھی کی چند تصاویر ہی حاصل ہو سکتی ہیں۔

دیوار کے بارے میں دوسرا احساس یہ تھا کہ بے شک اس نے حملہ آوروں کو روکا ہوگا لیکن تھکے مسافر کو سایہ نہیں دے سکتی۔ دیوار...... سایۂ دیوار کے بغیر! یا اپنے اپنے مزاج کی خاصیت ہے کہ چینیوں نے تو حملہ آوروں کو روکنے کے لیے پہاڑوں کی بلندیوں پر طویل دیوار تعمیر کر دی جبکہ ان کے برعکس ہم نے حملہ آوروں کے لیے درہ خیبر کی صورت میں دروازہ کھول دیا اسی لیے ہماری تاریخ میں تو کسی دیوار کا تذکرہ نہیں ملتا۔ ہمارے شعراء نے دیوار کے تلازمہ سے خوبصورت اشعار کہے۔ غالب کے دو اشعار یاد آ رہے ہیں جن کا دیوار چین سے تو کوئی تعلق نہیں مگر جو غالب کی سائیکی کے آئینہ دار ہیں:

دیوار، بارِ منتِ مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب، نہ احساں اٹھائیے
کہاں تک روؤں اس کے خیمے کے پیچھے، قیامت ہے
مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی، دیوار پتھر کی

غالب اگر چین میں ہوتا تو اسے یہ شکایت نہ ہوتی کہ رونے اور سر پھوڑنے کے لیے ہزار میل لمبی دیوار دستیاب!

شہرِ ممنوعہ!

جس صبح کا آغاز دیوار کی سیر سے ہوا اس کی شام نے ہمیں مشہور ''شہرِ ممنوعہ'' (Forbidden City) میں پایا۔ دراصل یہ کوئی شہر نہیں بلکہ بیجنگ میں واقع قدیم شاہوں کے محلات ہیں۔

ہم اور لاتعداد غیر ملکی جہاں اژدہام کی صورت میں پھر رہے تھے، کھا رہے تھے، پی رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے اور تصویریں اتار اور اتروا رہے تھے وہاں عام فانی انسان تو کجا پرندہ بھی پر نہ مار سکتا تھا، اس لیے کہ یہ محلات ممنوعہ تھے۔

چینیوں کا قد چھوٹا سہی مگر عمارات میں وہ وسعت، کشادگی اور بلندی کے قائل ہیں جبکہ شاہی عمارات کا مقصد رہائش کے علاوہ رعایا کو مرعوب بلکہ خوفزدہ بھی کرنا ہوتا تھا اس لیے یہاں سب کچھ روا، نہ جگہ کی کمی اور نہ دولت کی، لہٰذا ایسی ایسی عمارات تعمیر ہوئیں جو آج بھی داد وصول کرتی ہیں۔

مجھے عمارت سازی کے فن اور اس سے وابستہ جزئیات کا کچھ علم نہیں، نہ ہی قدیم عمارات کی تاریخ سے واقف ہوں تاہم میں چینی طرزِ تعمیر کا یہ اسلوب نوٹ کیے بغیر نہ رہ سکا کہ ایک وسیع اور کافی بلند پلیٹ فارم پر ایک عمارت جس کی پشت پر مزید پلیٹ فارم پر ایک اور عمارت پھر اس کی پشت پر اور بھی بڑا پلیٹ فارم اور اس پر عمارت اور یوں یہ سلسلہ بعض اوقات متعدد عمارات کی صورت میں جاری رہتا۔ سو یہاں بھی محلات کی تعمیر کا یہی اسلوب نظر آیا۔

تمام عمارات چوبی تھیں لیکن مضبوطی میں فولاد صفت۔ چین کا قدیم شاہی رنگ سرخ ہوگا کیونکہ تمام قدیم (بلکہ بیشتر جدید) عمارات سرخ رنگ کی تھیں۔ سرخ کے بعد فیروزی مائل سبز رنگ نظر آیا۔

بلند چھتوں پر مختلف جانوروں کی چھوٹی چھوٹی تراشیدہ چوبی شبیہیں۔ یہ تمام جانور شاہی اقتدار سے وابستہ مختلف چیزوں کی علامات تھیں اور صرف بادشاہ ہی انہیں اپنے محل میں رکھ سکتا تھا اور رعایا تو کیا امراء بھی شاہی اجازت کے بغیر انہیں استعمال نہ کر سکتے تھے۔

چین کی قدیم ترین علامات میں سے ڈریگن اور شیر بہت مشہور ہیں۔ ڈریگن خیر و برکت اور خوشحالی کی جبکہ شیر قوت و اقتدار کی علامت ہے۔ ماضی کے ساتھ یہ علامات معدوم نہ ہوگئیں بلکہ جدید چین میں اب بھی سرخ رنگ، ڈریگن اور شیر کے مجسمے نظر آتے ہیں۔

میں نے بھی اپنی اوقات کے مطابق ایک چھوٹا سا شیر خریدا جو چین میں تو قوت و اقتدار کی

علامت تھا مگر لاہور آ کر سرکس کے پالتو شیر میں تبدیل ہو کر میاؤں میاؤں کرنے لگا۔

میں شہرِ ممنوعہ کی تمام تر تفصیلات لکھنے سے خود کو عاجز پاتا ہوں کہ اس کی تو فلم دیکھنی چاہیے۔ الفاظ سے اس کی شان و شوکت اور وسعت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

ان عظیم محلات کا اختتام نسبتاً چھوٹے مگر بے حد دلکش باغ میں ہوتا ہے جو بادشاہ کی پسندیدہ عورتوں کے لیے مخصوص تھا۔ یہ خوش منظر باغ دیکھنے کے قابل ہے۔ ایک تو چٹانوں سے بنائے گئے اس ''خانہ'' کے لیے جس میں عورتیں دل لگی کا سامان بنتیں اور دوسرے نر اور مادہ کی صورت میں دو درختوں کی بغل گیری۔ جڑ پر دونوں کے درمیان میں جگہ خالی۔ یاد رہے کہ ثنویت کا اساسی اصول ین (نر) اور یانگ (مادہ) چینی دانشوروں نے پیش کیا تھا۔ سو باہم لپٹے یہ درخت بھی ''نر'' اور ''ناری'' کی علامت تھے اور اسی علامت کے درمیان خالی جگہ پر میں نے اپنی تصویر بنوائی۔

سرد موسم میں دیوتاؤں سے ملاقات

مشرقی چین کا صوبہ حنان (Henan) قدیم چینی تہذیب و ثقافت کا مرکز رہا ہے اور آج سے تقریباً ساڑھے تین ہزار برس قبل ہی سے یہ تہذیب، ثقافت، تعلیم و دانش اور معبدوں کے لیے مشہور رہا ہے اور اسی صوبہ کے تین ہزار سال سے آباد دارالحکومت ''ژونگ ژو'' (Zhengzhou) جانے کے لیے ہم محوِ پرواز تھے۔

ژونگ ژو کے ہوائی اڈہ پر ہماری رہنمائی کے لیے میاؤ می لنگ موجود تھی اور اگلے تین دن اس نے ہمارے ساتھ رہنا تھا۔ خوش اطوار اور ہنس مکھ می لنگ بہت اچھی کمپنی ثابت ہوئی اس لیے کہ وہ انگریزی نہ بول سکتی تھی۔

ایئرپورٹ سے باہر نکلے تو یخ ہوا، گہرے سیاہ بادلوں اور بارش نے ہمارا استقبال کیا۔ میں یہ دیکھ کر خاصہ حیران ہوا کہ چین کے بادل بھی ہمارے بادلوں جیسے ہی تھے اور ان بادلوں کی بارش بھی اسی طرح گیلا کر رہی تھی جیسے ہمارے بادلوں کی!

گرم کوسٹر میں سفر، پھر ہوٹل کے گرم کمرے اور شاندار ضیافت اور پھر گرم بستر، اس گرما گرمی کے بعد صبح اٹھے تو کسی جادوگر کے طلسمی منتر نے گویا ہمیں عالمِ خواب میں ایک برف کے دیس میں منتقل کر دیا۔ برف کی سفید چادر سے سارا شہر ڈھکا ہوا اور کپکپی طاری کر دینے والی ٹھنڈی ہوا۔ گرم کوسٹر چلی تو برف بھی ہمسفر تھی۔ پنجاب اور سندھ کے گرم میدانوں میں بسنے والوں کے لیے برف اجنبی ہے کہ یہ ہمارے معمولات کا حصہ نہیں بلکہ برف باری دیکھنے کے لیے کم از کم مری جانا پڑتا ہے۔ میں کھڑکی سے

باہر سفید لینڈ سکیپ دیکھ رہا تھا، سفیدی میں سڑک سیاہ فیتہ کی مانند تھی جس کے کنارے پر کبھی کبھی کوئی عورت برف صاف کرتی نظر آ جاتی۔

یہ علاقہ قدیم عمارات اور معبدوں کے ساتھ ساتھ آثار قدیمہ، کھنڈرات وغیرہ کے لیے خصوصی شہرت رکھتا ہے اور شاید اسی لیے اس کی سیر ہمارے پروگرام میں رکھی گئی تھی کہ ہم قدیم چین کی تہذیب وثقافت کے بارے میں بھی کچھ جان سکیں۔

چین کا مشہور ''زرد دریا'' بھی اسی خطے میں ہے۔ ہم نے اسے خوش ہو کر دیکھا مگر یہ نوٹ کیے بغیر نہ رہ سکے کہ (اس وقت شاید ہماری وجہ سے) اس کا پانی زرد نہ لگا۔

دنیا کے بیشتر بڑے بڑے شہروں نے دریاؤں، چشموں یا جھیلوں سے تروتازگی حاصل کی کہ آب لازمۂ حیات ہے اس لیے نیل، گنگا، جمنا جیسے دریاؤں کی اساطیری حیثیت ہے۔

زرد دریا چین کے بڑے اور مشہور دریاؤں میں شمار ہوتا ہے اور کسی زمانہ میں سیلاب سے بڑی تباہی بھی لاتا مگر چینیوں نے تکنیکی مہارت سے اسے لگام دے دی۔ سردی کے موسم میں اگرچہ وہ شانت شانت نظر آ رہا تھا مگر اس کا پاٹ مرعوب کن تھا۔

ہم مشہور مندر شاؤلن (Shaolin Temple) جا رہے تھے۔ گرم گاڑی میں برف باری کے دوران سفر کا اپنا مزہ تھا جو اس وقت کرکرا ہو گیا جب باہر نکلتے ہی برفیلی ہوا کا پہلا تھپڑ گویا منہ کو سجا گیا، بس ایک دم لڑکھڑا کر گرنے کو تھا کہ میاؤمی لنگ نے بازو سے پکڑ کر مجھے سہارا دیا۔ حالانکہ اس دھان پان سی لڑکی کو خود سہارے کی ضرورت تھی۔ برف نے لینڈ سکیپ کو نقرئی خطہ میں تبدیل کر کے درختوں کو چاندی کے جھومر، شاخوں اور جھاڑیوں کو چاندی کی بالیاں اور گہنے پہنا دیئے تھے۔ سفید شال اوڑھے پہاڑ گویا سوچ میں غرق جبکہ چوٹیاں سفید دستار میں سج رہی تھیں۔ برف کے بوجھ سے درختوں کی شاخیں جھکی جھکی تو بعض درختوں کی برف نے کایا کلپ کر دی یوں کہ درخت کے بجائے کچھ پراسرار قسم کے سفید فام نظر آ رہے تھے۔ کچھ جھاڑیوں نے سفید بوٹوں کا روپ دھار لیا تھا۔ منظر اس قدر مسحور کن کہ میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

دو چار لمبی سانسیں لیں تو سینہ میں سے گندے ماحول کی جمع شدہ ستر سالہ آلودگی کو خارج ہوتے ہوئے محسوس ہوا۔ سانس باہر نکلی تو مجسم ہو گئی۔ کچھ دیر فضا میں معلق رہی، پھر سرد ہوا کا حصہ بن گئی۔ میں نے سنگی ریلنگ پر ہاتھ مارا تو برف کے مہین برادہ سے میری مٹھی بھر گئی۔ اگلے لمحے ہاتھ جھٹکنا پڑا کیونکہ برف انگارہ میں تبدیل ہو رہی تھی۔

وہ برف جو لینڈ سکیپ کا حصہ بن کر خوبصورت نظر آ رہی تھی، اب ہمیں اس سے نبرد آزما ہونا

تھا کہ سیڑھیاں، راستے، روشیں، فرش سب برف سے اٹے ہوئے تھے۔ سنگی راستوں اور روشوں پر لوگوں کے چلنے سے سفید برف بھورے کیچڑ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ جہاں لوگوں کا گزر نہ ہوا وہاں برف میں پاؤں اندر دھنس رہے تھے۔ وہاں صحیح معنوں میں قدم پھونک پھونک کر رکھنے کی ضرورت تھی۔ میں Slipdisk کا مریض ہوں اس لیے میرے لیے برفیلی سنگی سیڑھیاں یا کیچڑ سے بھرے راستے خطرناک بھی ہو سکتے تھے۔ پاؤں رپٹا تو چین کا دورہ ناکام! میاؤمی لنگ کو غالباً میری پریشانی کا اندازہ ہو گیا ہوگا، وہ ہر قدم پر راہنمائی کے لیے موجود، بعض ڈھلوانوں یا پھسلتے راستے پر تو اس نے کسی بچہ کی طرح میرا ہاتھ پکڑ کر راستہ طے کرایا۔

اگرچہ ہم سب نے گرم کپڑے پہن رکھے تھے (میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ لیگنگ پہنی جو چین کی سردی کو مدنظر رکھتے ہوئے میری بیٹی سائیکی میرے لیے بطور خاص خرید کر لائی تھی) مگر یہ سردی ہم سب کی توقع سے کہیں زیادہ ضدی سردی تھی اور کیوں نہ ہوتی کہ چین کی سردی تھی۔

اگر ہم بہتر موسم میں آئے ہوتے تو سلسلہ وار بلند ہوتے ہوئے پلیٹ فارم پر تعمیر کیے گئے قدیم مندروں سے بہت لطف اندوز ہوتے مگر سردی کا یہ عالم کہ نصف گھنٹے بعد بجتے دانتوں کو بجنے سے روکنا محال ہو گیا۔ میں نے پروفیسر داور داؤد کی جانب دیکھا جو صرف شلوار قمیض پر ایک سویٹر پہنے تھے۔

سرخ رنگ کی عمارتوں میں سرخ رنگ ہی کے مجسمے، بڑے بڑے، قد آور مگر ایسے نہیں جیسے یونانی، رومن اور ہندو اساطیر کے ہوتے ہیں۔ یہ دیوتا/ بت ذرا وکھری ٹائپ دے نظر آئے۔ کچھ کے چہرے شانت تو کچھ ایسے گویا ابھی چھلانگ مار کر تکہ بوٹی کر دیں گے۔

ایک مندر میں ایک چٹان دکھاتے ہوئے ہمیں بتایا گیا کہ ایک عبادت گزار شخص نے ایک ہی مقام پر کھڑے ہو کر اتنی دیر تک مسلسل تپسیا کی کہ چٹان پر اس کا سایہ منجمد ہو گیا۔ واقعی ایسا ہی نظر آ رہا تھا۔

شیکسپیئر کے ولیم پنجم نے میدان جنگ میں گھوڑا گنوا دینے کے بعد یہ مشہور مکالمہ بولا تھا:

A horse, a horse,
My kingdom for a horse,

سردی میں ہمارا بھی کچھ ایسا ہی عالم تھا:

A cup of tea, a cup of tea
My literary kingdom for a cup of coffee!

مگر چائے ہی ندارد۔

بہرحال شدید سردی کے باوجود بھی قدیم چین کے دیوتاؤں سے ملاقات دلچسپ رہی لیکن

یہ ایسے کٹھور دیوتا نکلے کہ لاہور سے آنے والے مہمانوں کی گرم چائے/کافی سے تواضع نہ کر سکے۔ دراصل ہر عہد کے دیوتا ہی کٹھور ہیں۔ خود تو اندر گرم گرم جبکہ باہر بھگت سرد سرد!

جنتِ نگاہ! فردوس گوش!!

جیسے فلم میں اچانک منظر تبدیل ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح گرم ہال میں داخل ہوئے تو منظر کو تبدیل پایا۔ گرم ہال آہستہ آہستہ سردی سے قلفی بن جانے کا احساس ختم کر رہا تھا مگر جو دیکھا تو برف کو پھر پانی بنا سکتا تھا۔

باہر سردی دھوم مچا رہی تھی اور اندر رقاص لڑکیاں!

چینی لڑکیاں قدیم چین کے روایتی سازوں پر، موسیقی کی قدیم دھنوں پر، قدیم چینی رقص پیش کر رہی تھیں۔ سب کے ایک جیسے قد، رنگ، لباس حتیٰ کہ شکلیں بھی ایک جیسی محسوس ہو رہی تھیں۔ گویا ایک ہی ٹکسال کے لش لش کرتے نویں نکور سکے (یا پھر سکیاں)

کسی بھی خوب صورت، نظر فریب یا دلفریب منظر کی تفصیلات اور جزئیات کے بیان میں الفاظ کی بے بضاعتی کا عمومی احساس شامل ہوتا ہے۔ گزشتہ سطور میں میں ایک جگہ لکھ آیا ہوں کہ ایسے مواقع پر قلم کی نہیں فلم یا ویڈیو کیمرہ کی ضرورت ہوتی ہے، رقص بھی ایسا ہی تھا کہ اس کے بیان میں الفاظ ٹوٹ پھوٹ جائیں گے۔

قدیم چین کے روایتی ساز لکھا تو ان چار الفاظ سے میں آپ کو قطعی طور پر ان سازوں کی ساخت، صورت، گونجیلے آہنگ اور تھرتھراتی دُھن کا اندازہ نہیں کرا سکتا۔ موسیقی کیا تھی؟ سمندر کی جھاگ سے بتدریج نمایاں ہوتی، شرماتی لجاتی، موسیقی کی دیوی سامع نواز تھی۔

رقص کی موسیقی کے لیے سازینہ کا کام کرنے والی، کانسی کی ساختہ مختلف سائز کی چھوٹی بڑی کئی درجن گھنٹیاں تھیں مگر یہ گھنٹیاں عام گھنٹیوں جیسی گول نہ تھیں بلکہ ایک طرف سے چپٹی تھیں۔ چھوٹی سے چھوٹی گھنٹی چند انچ کی اور سب سے بڑی چند فٹ کی، یہ گھنٹیاں تمام سٹیج کے گرد مختلف فاصلوں پر رکھی تھیں۔ میں یہ دیکھ کر متعجب ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ یہ گھنٹیاں بانس سے بجائی جا رہی تھیں۔ بجانے والا گھنٹی پر بانس اس انداز سے مارتا تھا کہ گھنٹی کے اندر خوابیدہ دُھن، انگڑائی لیتی بیدار ہو جاتی۔ یوں کہ دیر تر فضا اس کی تھرتھراہٹ سے گونجتی رہتی۔ یہ تو ہوئی ایک گھنٹی کی آواز، جب بیک وقت چھوٹی بڑی متعدد گھنٹیوں سے موسیقی پیدا کی جا رہی ہو تو ایسی Exotic موسیقی کی لطافت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

غالباً دنیا کے کسی ملک میں گھنٹی کے ساز اور اس سے تشکیل پانے والے سازینہ کا وجود نہ ہوگا

اور یہ سازینہ، اس کی دُھن اور رقص کا اسلوب ہزاروں برس قدیم ہے۔

اس انوکھی موسیقی پر یک رنگ، یک لباس بلکہ یک شکل جیسی لڑکیوں نے جو رقص پیش کیا، وہ شاید چینی اساطیر کے کسی راجہ اِندر کے اکھاڑے کی پریاں ہی ایسا رقص کر سکتی ہوں تو اور بات ورنہ یہ ان معنی میں بے مثال تھا کہ صرف قدیم چینی سازوں، موسیقی کی قدیم چینی دُھنوں پر صرف چینی لڑکیاں ہی ایسا رقص پیش کر سکتی تھیں۔ میں الفاظ سے نقشہ نہیں کھینچ سکتا اور آپ کے تصور سے فزوں تر ہے وہ نظارہ!

رقص کے بعد ہمیں رقاص لڑکیوں سے ملایا گیا۔

ہم نے ان کے فن (مگر ڈرتے ہوئے حسن کی نہیں) تعریف کی۔ ان کے ساتھ ہماری تصاویر بنائی گئیں جب ہم نے کہا (چینی کا ایک لفظ جو سیکھ پائے تھے)

''شے! شے'' (شکریہ)

جواباً نقرئی گھنٹیاں چہکیں You are welcome! مگر یہ قدیم چین کی نہیں بلکہ جدید چین کی گھنٹیاں تھیں۔

جوش ملیح آبادی نے کہا تھا کہ رقص اعضاء کی شاعری ہے۔ اگر وہ ہمارے ساتھ ہوتے تو نہ جانے انہوں نے اس رقص پر کس انداز و اسلوب کی نظم لکھی ہوتی۔ فیض احمد فیض ہوتے تو اس رقص میں اور ہی معانی تلاش کرتے جبکہ حبیب جالب کو شاید اس مصرع پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوتی:

رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

میں قدیم و جدید کی بحث میں کہیں زیادہ جدید کا قائل ہوں لیکن امریکہ کے روک اینڈ رول، بھارت کے فلمی رقص وغیرہ دیکھیں تو پھر قدیم کے سحر کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ فن کی شائستگی کا کلچر اسی میں ہے۔ اسی طرح پوپ میوزک سنیں تو سہگل کی آواز کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

اعضاء کی شاعری کی مناسبت سے چینی لڑکیوں کے رقص کو اعضاء کی رباعی قرار دیا جا سکتا ہے پھر اسی مناسبت سے یہ بھی کہہ سکتے ہیں:

گیا ہو جب اپنا جیوڑا نکل
کہاں کی رباعی، کہاں کی غزل

اعضاء کی نظم

ہمیں کم عمر لڑکیوں کے مارشل آرٹس کا مظاہرہ بھی دکھایا گیا جسے اور انداز کے اعضاء کی نظم

سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ چین کے تمام سکولوں میں مارشل آرٹس کی تعلیم دی جاتی ہے بلکہ اس سلسلے میں یہ بھی بتایا گیا کہ ''کنگ فو'' چین ہی کی ایجاد ہے۔

ہم فلموں میں جو مارشل آرٹس دیکھتے ہیں، اسے بروس لی نے ہالی وڈ میں متعارف کرایا اور اس وقت جیکی چن اس کی مقبول اور نمایاں ترین مثال ہے لیکن مارشل آرٹس کا یہ مقصد نہ تھا۔ یہ دفاع کا ایسا انداز تھا کہ ہتھیار نہ ہوتے ہوئے بھی فرد مسلح ہوتا تھا۔

چین کی اپنی فلموں یا قدیم چین کے پس منظر میں بنائی گئی فلموں میں اس کے فنکارانہ نمونے ملتے ہیں مگر جو زندہ مظاہرہ دیکھ رہے تھے، وہ واقعی قابل دید تھا۔

پینڈ و اِن ونڈر لینڈ

دریائے یانگ ژی (Yang Tze) کے ڈیلٹا پر آباد چین کی بین الاقوامی بندرگاہ شنگھائی (دوسرے نام Hu اور Shen) تجارت، صنعت و حرفت اور ملٹی نیشنلز کے ساتھ ساتھ ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز بھی ہے۔ یہی نہیں چین کے باقی شہروں کے مقابلہ میں شنگھائی زیادہ مغربی اور اسی لیے زیادہ کھلا بھی ہے کہ یہاں چینی Pinup ماڈلز کے پوسٹرز بھی دیکھنے کو مل جاتے ہیں اور منی اسکرٹس بھی!

شنگھائی دیکھتے ہی سب سے پہلا یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ کسی ایشیائی خطہ کا نہیں بلکہ امریکہ کا کوئی بڑا شہر ہے۔ سکائی سکریپرز اور ایک کے اوپر ایک فلائی اوور، صرف یہی متاثر کرنے بلکہ رعب ڈالنے کو کافی ہیں۔

شنگھائی میں عجائب گھر، باغات، تھیٹرز، لائبریریز، سٹیڈیم اور دیگر تفریحی مقامات کی کمی نہیں مگر محدود وقت کی مناسبت سے صرف شنگھائی میوزیم اور اورینٹل پرل ٹی وی ٹاور کی سیر ہمارے پروگرام میں رکھی گئی۔ رات کو ہمیں دریائے ہانگ پو (Hangpu) کے کنارے لے جایا گیا جسے ''بند'' (Bund) کہتے ہیں۔ ایک جانب روشنی میں غسل کرتی طویل القامت عمارات، دوسری جانب رنگین روشنیوں میں رنگین موجوں والا دریا اور اس کا شانت بہاؤ، غیر ملکی سامان سے بھرے مہنگے ڈیپارٹمنٹل سٹورز اور کوچہ محبوب کے ہجوم عاشقاں کی مانند سیاح۔ کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا!

دور سے دیکھنے پر ''اورینٹل پرل ٹی وی ٹاور'' ہالی وڈ کی کسی Futurist فلم کا بہت بڑا سیٹ نظر آتا ہے۔ جب اس کے قریب جائیں تو پھر بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ عمارت حقیقی نہیں ہوسکتی۔ سائنس فکشن کی ایسی فلم کا غیر معمولی سیٹ ہمارے لیے روشنیوں کے کروڑوں سال کے فاصلہ پر واقع گمنام سیارہ کے ماحول کی عکاسی کے لیے ماہرانہ فنکاری سے تیار کیا گیا ہے۔ 468 میٹر بلند سٹرکچر

صرف تین ٹانگوں (ستونوں) پر استوار، یہ سٹرکچر روایتی انداز میں مربع مستطیل یا اہرام کی صورت میں نہیں یہ تو کُرے، ایک کے اوپر ایک! نہیں، یہ نہیں ہوسکتا۔ ایسا نہیں ہوسکتا؟ ناقابل یقین اور ناقابل بیان، پھر سوچا اگر چینی بازی گر مختلف پلیٹوں یا گیندوں کو بیک وقت ہوا میں رقصاں رکھ سکتا ہے تو چینی ماہرین تعمیرات ایسی عجوبہ بلڈنگ بھی کھڑی کر سکتے ہیں جو سرے سے بلڈنگ ہی نظر نہیں آتی۔ نہ جانے چین کے ٹھیکیداروں، ان کے کام کی نگرانی کرنے والے اوورسیئرز اور انجینئرز نے کس تناسب سے ریت میں سیمنٹ ملایا ہوگا اور ان کے بل پاس کرنے والے آڈیٹرز اور کلرکوں نے کتنے فیصد کمیشن کھائی ہوگی تو یہ بلڈنگ تیار ہوئی ہوگی، جس کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ سیاحوں کو ٹکٹ کی فروخت سے اس عمارت نے تین چار برس کے اندر سارا خرچ واپس کر دیا، لہٰذا اب یہ عمارت نفع بخش تھی۔ نفع ہی نفع، خالص نفع!

سینکڑوں کی تعداد میں سیاحوں پر نظر ڈالی تو نفع کا اندازہ بھی ہوگیا۔

تیز رفتار لفٹ سینکڑوں فٹ کی بلندی کے جس مقام پر لے آئی وہاں میں نے خود کو پینڈو اِن ونڈر لینڈ محسوس کیا۔ ہم ملکی اور غیر ملکی لوگوں کے ہجوم سے چھلکتی وسیع گیند میں تھے۔ کھڑکی سے نیچے نگاہ کی تو محسوس ہوا گویا نظر نیچے گر جائے گی۔ بلندی سے نیچے نہیں دیکھ سکتا مگر نیچے کا منظر ایسا دلکش تھا کہ اپنا نفسیاتی خوف بھی یاد نہ رہا۔

شنگھائی ہمارے قدموں تلے تھا جبکہ ہانگ پو دریا، میر تقی میر کے مصرع بہے بہتیرا پر بہا بھی جائے کا زندہ منظر پیش کر رہا تھا۔ دریا کی سرمئی لکیریں کشتیاں، لانچز، سٹیمرز اور چھوٹے جہاز متحرک کھلونوں کی صورت میں۔

یہ خوش فکروں کا ہجوم تھا، کھاتے پیتے، شاپنگ کرتے، تصویریں اتارتے اور خواہ مخواہ ہی ایک دوسرے کو گلے لگاتے۔

یہ ایسے لمحات ہوتے ہیں جب وقت گویا تھم جاتا ہے۔ فرد ہجوم کا حصہ بن جاتا ہے، اردگرد کے اجنبی لوگ بھی اپنے اپنے سے لگتے ہیں۔ اگرچہ فرد ٹگ دل شاد کرتا ہے مگر شادمانی کا احساس دیرپا ہوتا ہے۔ میں چھ ماہ بعد یہ سطریں لکھتے وقت منظر اور اس سے وابستہ کیفیات کو خود میں زندہ محسوس کرتا ہوں۔

کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا! کے مصداق وہاں بہت کچھ تھا لیکن خواب نما کیفیات کا محض الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔

وہاں سیاحوں کی دلچسپی، کھانے پینے، شاپنگ اور تفریحات کے متعدد ذرائع تھے۔ سیاحوں کی تعلیم کا بھی بندوبست تھا۔ ایک جگہ قدیم چینی رہن سہن کے مطابق مردوں، عورتوں اور بچوں کے مجسمے

تھے جو دور سے بالکل زندہ محسوس ہوتے تھے۔ سیاح ان کے ساتھ اپنی تصاویر ضرور اترواتے۔

جس چیز نے بے حد متاثر کیا وہ تھا پینٹنگ، فوٹو گرافس اور ماڈلز کے ذریعے سے شنگھائی کے ماضی کے ایسے مناظر جن کے ذریعہ سے یہ علم ہو جاتا تھا کہ قدیم شنگھائی کیسا تھا اور عام آدمی کا اسلوبِ حیات کیسا تھا۔ پھر انگریز آئے تو افیون کا نشہ، طوائفوں اور خرابیوں کی دیگر سوغات لائے۔ الغرض! بڑے سلیقہ سے شنگھائی کی تاریخ کے مختلف ادوار کا گویا سینما تھا اور ساکت مگر منہ سے بولتی تصاویر کی صورت میں۔

خاصہ طویل وقت گزار کر نکلے تو چیں چیں کرتی چین کی ان عورتوں نے ہمیں گھیر لیا جو بلا جھجک ہم نامحرموں کے بازو پکڑ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ کر اشیاء فروخت کر رہی تھیں مگر چہ ارزاں فروختند کے برعکس گویا بلیک مارکیٹ کے ریٹ۔ وہ چیزیں ہماری آنکھوں ناک اور ہونٹوں پر گویا مار رہی تھیں۔ یہ سٹورز کی ہنستی مسکراتی کھلکھلاتی لڑکیوں کے برعکس پُرخشونت بلیوں کی مانند تھیں۔ جب ہم ''نو، نو'' کہتے تو ہماری ''نو، نو'' کی نقل اتار کر ناراضگی کا اظہار کرتیں۔

ڈاکٹر شاہ محمد مری کے ساتھ یہاں ہاتھ ہو گیا۔ انہوں نے کچھ چیزیں خریدیں اور جب 50 یوآن کا نوٹ دیا تو عورت نے اسے روشنی کی طرف دیکھا اور چلاّئی۔ جس کا سلیس اردو میں یہ ترجمہ بنتا ہے کہ یہ تو جعلی نوٹ ہے۔ یہ نوٹ اسی مقام پر کسی سے خریداری کے سلسلہ میں لیا گیا تھا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ انہوں نے خاموشی سے نوٹ واپس لے لیا اور ایسا نوٹ دیا جس پر کسی عورت نے اعتراض نہ کیا۔ یہ بھی چین کی تصویر کا ایک رنگ تھا۔

مُٹھی!

بعض گزشتہ وفود کے قصے یاد آ رہے ہیں جیسے ایک وفد کا ایک معزز رکن دورہ کے دوران اپنے کمرہ ہی سے باہر نہ نکلا کہ وہ باہر نکلنے کے قابل ہی نہ تھا جبکہ ہم تھے کہ سب زیرو۔ سردی میں بھی فریج کا پانی پیتے رہے۔ ایک دورہ کے بعد اچھے بھلے دوست دشمن بن گئے۔ ایک مرتبہ اس بات پر فساد ہو گیا کہ مشترک خرچ کے کیمرہ سے ایک صاحب نے زیادہ تصویریں بنا لی تھیں۔ الحمدللہ! ہم پانچ انگلیوں کی مانند نہیں بلکہ مٹھی کی صورت میں رہے۔

اس دورہ کا ذاتی فائدہ قبلہ مشتاق احمد یوسفی سے قربت کے احساس میں مزید تقویت قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہم نے ایک ہفتہ میں ہر موضوع پر باتیں کیں، اپنی عادت کے مطابق میں نے کرید کرید کر ان سے سوالات پوچھے اور انہوں نے میری تحریر کے بارے میں بہت اچھی رائے دی ''ڈاکٹر صاحب! آپ کی تحریر میں ''رس'' ہے اور یہ اللہ کی دین ہے۔'' یہ فقرہ میرے لیے سند کا درجہ رکھتا ہے۔

یوسفی صاحب کی وسیع الظرفی کے متعدد واقعات کی گواہی دی جا سکتی ہے۔ چین کا واقعہ میں ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں۔

ہم سب کو جہاں انفرادی طور پر تحائف دیئے گئے وہاں گروپ کا لیڈر ہونے کی بنا پر یوسفی صاحب کو ایک بہت خوبصورت مجسمہ دیا گیا۔ یوسفی صاحب کہنے لگے ''میں اسے نہیں رکھنا چاہتا۔''

''کیوں؟''

''یہ مجھے گروپ لیڈر کے طور پر ملا ہے، اس لیے سب کا اس پر حق ہے۔''

اگرچہ میں نے مجسمہ رکھنے کے لیے انہیں قائل کرنے کی کوشش بھی کی مگر وہ نہ مانے۔ چنانچہ اسلام آباد اکادمی کے دفتر میں پہنچے تو افتخار عارف صاحب سے کہا ''ہم سب ساتھی اس پر اپنے اپنے دستخط کر دیتے ہیں اور آپ اسے اپنے دفتر میں سجا لیں۔''

ایسا ہی ہوا۔

⌘⌘⌘⌘⌘⌘⌘⌘⌘

لعبتانِ چین اور جہان مرغ و ماہی

لعبتانِ چین

ہماری قدیم داستانوں میں چین کا بہت تذکرہ ملتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ بزرگ واقعی چین کے خوبصورت مناظر سے تروتازہ ہوئے یا لعبتانِ چین کے بے حجابانہ دیدار سے دیدہ و دل کی ضیافت کی لیکن کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا...... کے مصداق جو دیکھا......نہیں...... یہ کہنا مناسب ہے جو دیکھی بلکہ دیکھیں وہ لڑکیاں نہ تھیں موتیے کی کلیاں تھیں۔

جو دور سے کم عمر لڑکی دکھائی دیتی، وہ قریب سے بھی کم عمر لڑکی ہی دکھائی دیتی۔ نہ جانے ان کے جینز میں کیا خوبی ہے کہ نہ موٹی عورت دیکھی نہ بھدی لڑکی اور نہ ہی قبہ شکم والی۔ ایک وجہ تو خوراک ہو سکتی ہے اور دوسری وجہ ایک بچہ کی پیدائش بھی ہو سکتی ہے جبکہ ہماری عورت شادی کے دو چار برس بعد ہی غبارہ، ڈھول یا نقارہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یقیناً ہر عورت ہی خوبصورت نہ تھی مگر یہ بھی ہے کہ بدقطع عورت کمیاب تھی۔ معمر عورتوں کے پپلے گال یا گردن کی معلق جھریاں عمر کی چغلی تو کھاتیں لیکن موٹی وہ بھی نہ تھیں۔ سمارٹ بڑھیا چین میں ہی پائی جاتی ہے۔ چین کے بعض ایسے علاقے بھی ہیں جو صدی سے زیادہ عمر کے مردوزن کے لیے مشہور ہیں۔ بالعموم یہ ہوتا ہے کہ سو برس پر دو چار برس کا اضافہ ہوا تو خبریں اور تصویریں چھپنے لگتی ہیں جبکہ چین میں طویل العمر افراد کا دیگر ممالک کے مقابلے میں تناسب کہیں زیادہ ہے۔

چین کھلے ڈلے لوگوں کا ملک ہے اور ہمیں شاپنگ میں سب سے زیادہ مزا ملتا تھا۔ بالخصوص بھاؤ سننے میں اور بھاؤ کرنے میں۔ آپس کی بات ہے لڑکیوں سے قیمت چکانے کا جداگانہ لطف تھا، یوں کہ بعض اوقات خریداری دلداری میں تبدیل ہو جاتی۔ وہ لڑکیاں نہ تھیں چہچہاتی چڑیا تھیں، سٹور ''چڑیاں دے چنبہ'' میں تبدیل ہو کر ان کی چہچہاتی ہنسی سے گونج رہا ہوتا اسی لیے میں نے بیشتر

چیزیں نسبتاً مہنگی خریدیں۔ میں سمجھتا ہوں خوبصورت لڑکی سے مول تول بدمذاقی کی بات ہے۔

عورتیں عموماً عمر چور ہوتی ہیں مگر چینی مونث کی عمر کا تو قطعاً اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، لہٰذا اپنی آنکھوں کا یہ عالم:

بابا ہمیں تو سب نظر آتی ہیں لڑکیاں!

پریشاں نظری کا لپکا

لڑکیوں کا ذکر چلا تو یہ بھی بتا دوں بالعموم چینی عورتیں میک اپ نہیں کرتیں، نہ ہی نئی تراش کے مہنگے کپڑے پہنے ماڈلز کی طرح کیٹ واک پر اٹھلا اٹھلا کر چلتی نظر آتی ہیں۔ سادہ لباس میں سادگی کی مثال! یہ میں اپنی کالیوں کو نصیحت کے لیے لکھ رہا ہوں جو مہنگی کریموں پر گورا بننے کے لیے تابعدار شوہر کی کمائی لٹاتی ہیں۔ کیا آپ کو اس کالی کو دیکھ کر گھن نہیں آتی جس کے بال سنہری ڈائی کیے ہوتے ہیں اور خاکی، جامنی یا ویسے ہی کسی فضول رنگ کی لپ سٹک سے بھدے ہونٹوں کو مزید بدمزہ بنایا ہوتا ہے۔

میرا خیال تھا ہر طرف زرد رنگ دیکھنے سے آنکھوں کو یرقان ہو جائے گا لیکن ہوا اس کے برعکس۔ یورپین عورتوں کی مولی جیسی سفید رنگ کے مقابلے میں چینی عورتوں کی ہلکی زرد رنگت زیادہ پرکشش نظر آئی۔

نظر کی جمالیات میں سیاہ موٹی آنکھ پسندیدہ ہے، رہی جھیل جیسی گہری (نیلی) آنکھیں تو یہ محض شعراء اور افسانے کی حد تک ہیں۔ چینی، جاپانی، کورین لڑکیاں، آہو چشم کے برعکس ماہی چشم ہوتی ہیں۔ چندن کی ''دیدہ وا دید'' کے بعد تو ماہی (پنجابی والا نہیں) کی خصوصی پسندیدگی نہ ہونے کے باوجود بھی ماہی چشم دل کو بھانے لگیں۔ اس ضمن میں یہ شریفانہ اعتراف بھی لازم ہے کہ ہم کسی حسینہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی سعادت سے محروم رہے (خصوصی کاوش کے باوجود بھی) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نقاد کی موٹی شیشوں والی عینک آنکھیں کسی حسینہ کی آنکھوں سے چار (نہیں! چھ) ہو کر حسن چشم کو کیسے آنک سکتی تھیں...... کیجیے نظارہ دور دور سے...... اور ہم ایسے ہی نظاروں کے ایکسپرٹ ہیں

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھا
آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

اب افسانہ نگار مجھ پر غالب آ رہا ہے۔ میں کھنچی آنکھوں، زرد رنگت اور چھوٹے قد والی

حسینہ کو دل دے بیٹھا ہوں تو عرض مدعا کیسے ہو؟ ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟ میں صرف ایک لفظ ''چینی'' جانتا ہوں جس کا مطلب شوگر ہے اور وہ اردو کا ایک لفظ بھی نہیں جانتیں۔ تو کیا عشق اور اظہار تمنا کے لیے کیلکو لیٹر کا سہارا لوں۔ "I Love you" کیلکولیٹر کی زبان میں یہ فقرہ اعداد میں تبدیل ہو کر حرفِ مدعا قرار پائے گا؟ یا پھر وہی آنکھوں کی ازلی زبان۔

میاں نقاد! تم فینٹیسی کے جال میں پھنس رہے ہو، اپنی اوقات میں رہو اور بری کتابوں پر اچھی تنقید لکھتے رہو۔ بس۔

سفرنامے میں لڑکیاں اور وہ بھی چینی لڑکیاں ڈالنے کا یہ طریقہ نہیں۔ تم تو امریکہ اور ڈنمارک کے سفرناموں میں بھی میمیں نہ ڈال سکے تو چین کے سفرنامہ میں زرد حسینہ کیسے ڈال سکو گے، لہٰذا اپنا سفرنامہ لکھتے جاؤ کہ یہی نقاد کا مقدر ہے۔ رومانس کا تاش محل (تاج محل نہیں) دھڑام سے نیچے!

قلتِ اولاد، کثرتِ اولاد

ایک ملک/شہر/علاقہ/خطہ وہ ہوتا ہے جو آپ کو نظر آتا ہے۔ بلند عمارات، خوبصورت باغ، تاریخی آثار، سہولتیں، آسائشیں وغیرہ۔ یہ ظاہری روپ ہوتا ہے جو بالعموم سیاحوں کو دھوکا دیتا ہے۔ پانچ سات دن یا ہفتہ دو ہفتہ میں کسی علاقے کا صرف ظاہری روپ ہی دیکھا جا سکتا ہے اور صرف سطح کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ جب چار دن کی چاہت میں لڑکیاں نہیں کھلتیں تو پھر ملک، شہر، علاقہ، خطہ کیسے خود کو افشا کر دے۔ ہمیں صرف سات دن کے لیے چین لے گئے تھے اور سات دن میں تو اجنبی شہر کا ایک محلہ بھی نہیں دیکھا جا سکتا، اس لیے ہم نے چین کا جو ظاہر دیکھا بعض امور کے لحاظ سے اسے سراب بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

چین خوشحال اور چینی مسرور نظر آئے، مگر پھولوں کی کیاری میں کتنے کوڑیالے ہیں؟ میں متجسس انسان ہوں، اگرچہ باتونی نہیں مگر کام کی بات کر سکتا ہوں۔ چنانچہ میں مترجم یا ان اصحاب سے جو انگریزی بول سکتے تھے، نئے چین کی زندگی، رسم و رواج، سماجی اطوار، کاروبار، ازدواج، اولاد اور بزرگوں کے بارے میں سوالات کرتا رہتا۔

ماؤ کے دور کے ہنستے مسکراتے کھیتوں یا ملوں میں کام کرتے سرخ کتاب تھامے چینی ہمارے ذہن میں آج بھی آباد ہیں مگر اب معاملہ برعکس ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ماؤ متروک ہو چکا، اس کے مزار کے سامنے سے گزرے تو ہم نے وہاں جانے کی خواہش کا اظہار کیا جسے خوبصورتی سے ٹال دیا گیا۔

سوشلسٹ انقلاب نے سخت قسم کے جاگیرداری نظام میں جکڑی چینی عورت کو مرد کے مساوی قرار دیا تو اس نے بھی معاش میں اپنا کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔

مترجم اور دیگر حضرات سے جو باتیں ہوئیں، ان سے یہ اندازہ ہو گیا کہ اب چین کا وہ روایتی معاشرہ رسوم و رواج، معاشرتی اقدار اور مسلّمات متروک ہو چکے ہیں جو کبھی ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا انداز متعین کرتے ہوں گے۔ لڑکی اور لڑکا دونوں آزاد ہیں، لہٰذا اب بزرگوں کے طے کردہ رشتے نسبتاً کم اور ذاتی پسند کی شادیاں زیادہ ہو رہی ہیں۔ اگرچہ اب بھی ماں باپ کی عزت و احترام باقی ہے۔ ان سے اجازت بھی طلب کی جاتی ہے اور بعض امور میں ان کے فیصلے تسلیم بھی کیے جاتے ہیں لیکن زیادہ تر مرد و زن اپنی مرضی سے اپنا اسلوبِ حیات طے کرتے ہیں۔

بیجنگ اور شنگھائی کی سڑکوں پر اب ایسے جوڑے دیکھے جا سکتے ہیں جو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر یا ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے چل رہے ہوتے ہیں۔

پاکستانی پولیس کو بلاؤ!

کبھی کبھی وہ منظر بھی نظر آ جاتا جس کی لذیذ جزئیات کو صرف ایسے فقرے سے واضح کیا جا سکتا ہے:

Public Display of Affection!

چین میں آبادی کے اضافے کو بڑی سختی سے روکا گیا۔ صرف ایک بچہ، دوسرا ہو تو سزا۔ یہ ترکیب کڑی تو تھی مگر کارگر ثابت ہوئی۔

یہ لکھ رہا ہوں اور چینیوں کی کثرت کے بارے میں ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے۔ جب امریکی راکٹ چاند پر اترا تو نیل آرم سٹرانگ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ ماؤ کی سرخ کتاب تھامے، چینی اس کے استقبال کو کھڑے تھے۔

''تم ہم سے پہلے یہاں کیسے پہنچ گئے؟''

جواب ملا ''ہم ایک دوسرے کے سر پر کھڑے ہوتے گئے اور بالآخر چاند تک آ پہنچے۔''

میں نے فی بچہ کنبہ کا تصور کرنا چاہا تو نہ کر پایا۔ اسے اس مثال سے سمجھتے ہیں۔ میں بیک وقت دادا، نانا، خالو، باپ، پھوپھا، تایا، بھائی، کزن اور نہ جانے کیا کیا ہوں۔ یہ متنوع رشتے کثرتِ اولاد کے باعث ممکن ہوئے۔ جب بچہ ایک ہو تو کتنے ہی رشتے معدوم ہو جاتے ہوں گے۔ جب دادا، دادی، نانا، نانی کو پوتے اور نواسے کھلانے کو نہ ملیں تو ان کا بڑھاپا تو بدمزہ ہی رہا۔

یہ لکھ رہا ہوں کہ نیچے گلی میں دو عورتوں کی غصیلی آوازوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ دونوں اپنے شیطان سیرت بچوں کو فرشتہ ثابت کرنے کے لیے خود کو آتش فشاں میں تبدیل کر کے انگاروں

بھرے اسلوب میں لڑ رہی ہیں۔

ملک کے تمام شہروں کی وہ گلیاں ذہن میں لائیے جہاں دن بھر کرکٹ کھیلی جاتی اور لوگوں کے گھروں کے شیشے توڑے جاتے ہیں۔ ان کوٹھوں کا تصور کیجیے جہاں سے اڑتی پتنگوں کی ڈوریں پہلے بجلی کے لیے وبالِ جان تھیں، اب دھاتی ڈوروں کی صورت میں خطرہ جان ثابت ہو رہی ہیں۔

کثرت اولاد کے باعث تعلیم اور بہبود کے کسی بھی منصوبے پر کماحقہ عمل نہیں ہو سکتا۔ اچھی آمدنی نہیں، رہنے کو ڈھنگ کا مکان نہیں، بیوی سے پیار نہیں لیکن مشرومز کی مانند بچوں کی فصل تیار ہو رہی ہے۔

آبادی کی کثرت کے ضمنی نقصانات میں یہ بھی ہے کہ زیادہ مجرم پیدا ہوتے ہیں جنہیں پکڑنے کے لیے زیادہ پولیس کی ضرورت پڑتی ہے۔ مزید نقصان یہ کہ زیادہ تعداد میں شاعر جنم لیتے ہیں جن کا نفس موٹا کرنے کے لیے زیادہ ناقدین کی ضرورت ہوتی ہے۔

علامہ اقبال نے ''کشتِ ویران'' کے لیے ''ذرانم'' کی بات کی تھی۔ یہاں تو نمی کے بغیر ہی تولیدی جراثیم کی پیدائش، افزائش ہوتی رہتی ہے۔

غیر ضروری نوٹ: یہ محکمہ فیملی پلاننگ کی فرمائش پر نہیں تحریر کیا گیا۔

جدید چینی ادب کا قومی عجائب گھر

ہمارے میزبانوں نے اس انداز سے پروگرام ترتیب دیئے تھے کہ ہم کم سے کم وقت میں چینی زندگی، تہذیب، کلچر اور ادب کے بارے میں زیادہ سے زیادہ واقفیت حاصل کر سکیں۔ اگرچہ ہمارے لیے ہر چیز ہی نئی بلکہ اچنبے کا تماشا تھی لیکن ادیب ہونے کے باعث جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ تھا ''جدید چینی ادب کا قومی عجائب گھر'' جو بیجنگ کے کیویانگ ضلع Chaoyang (District) میں خوش منظر قطعہ اراضی پر چودہ ہزار مربع میٹر پر چین کے روایتی طرزِ تعمیر کے اسلوب میں مئی 2000ء میں تعمیر ہوا۔

یہ عجائب گھر اپنے نام کی مناسبت سے واقعی ادب، ادیبوں، کتابوں، مسودوں، دستاویزات ہر لحاظ سے چینی ادب کی سینکڑوں برس کی تاریخ کی دیدہ زیب انداز میں پیشکش ہے۔ جو حصہ ڈرامے اور ڈرامہ نگاروں کے لیے وقف کیا گیا اس میں نہ صرف ڈرامہ نگاروں اور ان کے ڈراموں کے بارے میں معلومات و کوائف مہیا کیے گئے تھے بلکہ معروف ڈراموں کی کیسٹ بھی ٹی وی پر چل رہی تھی جبکہ دیوار پر تھیٹر کی دنیا کے معروف ستاروں اور شخصیات کی تصاویر سج رہی تھیں۔

وہاں اہم اور مقبول ادیبوں کے مجسمے اور Bust بھی تھے۔ بعض ادیبوں کے سٹڈی روم بنا کر ان میں ان کے ایسے مجسمے بنائے گئے تھے گویا وہ محوِ فکر ہوں۔ معروف اہلِ قلم کے وہ مجسمے بہت اچھے لگے جو باغ میں پھولوں کے درمیان تھے، اسی طرح تین ادیبوں کے اکٹھے مجسمے یوں لگے گویا وہ گپ شپ میں مصروف ہوں، دو بنچ پر بیٹھے جبکہ تیسرا ان کے پاس کھڑا تھا۔

میں نے جب معروف ادیبوں کے مجسمے ان کے سٹڈی روم میں دیکھے تو یہ نوٹ کیے بغیر نہ رہ سکا کہ ان میں ماؤ کا مجسمہ نہ تھا۔ ماؤ انقلابی ہی نہ تھا بلکہ شاعر، مفکر اور دانشور بھی تھا۔ اس کی نظموں کے ہمارے ہاں تراجم بھی ہو چکے ہیں۔ ایک ترجمہ تو یحییٰ امجد نے کیا تھا۔

میں نے مترجم سے پوچھا ''مجھے یہاں ماؤ نظر نہیں آ رہا جبکہ وہ بہت اچھا شاعر بھی تھا بلکہ اس کی نظموں کے اردو میں تراجم بھی کیے جا چکے ہیں۔''

وہ لاپروائی سے بولا ''وہ! وہ اوپر کے کسی ہال میں بھی ہوگا۔''

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

بدلتے حالات نے ماؤ کو اوپر کسی ہال میں پہنچا دیا۔ اگر اس کی زندگی میں یہ عجائب گھر بنا ہوتا تو کم از کم ایک ہال صرف اسی کے لیے مخصوص ہوتا۔ اس سے قدرے کم سطح کا کام اکادمی ادبیات پاکستان (اسلام آباد) کی عمارت میں نظر آتا ہے جہاں مرحوم ادیبوں کے پنسل سکیچ برآمدوں میں اور ہال میں زندہ ادیبوں کی تصاویر نظر آتی ہیں اور باہر لان میں گنتی کے چند ادیبوں کے دستِ مبارک سے لگائے گئے گنتی کے چند درخت بھی ہیں۔

جدید چینی ادب کا قومی عجائب گھر بڑے بڑے تین ہال پر مشتمل ہے اور سینکڑوں معروف چینی اہلِ قلم کی تصانیف، مسودات، سوانح عمریوں کے علاوہ 80 ہزار کتابوں پر مشتمل لائبریری بھی ہے۔

ہمیں سب سے زیادہ جس چیز نے متاثر کیا وہ عجائب گھر کا مرکزی دروازہ تھا جس پر ہینڈل کی جگہ ایک ہاتھ کا نقش کندہ ہے۔ آپ ہینڈل کے طور پر جب اسے ہاتھ لگا کر دروازہ کھولیں گے تو آپ گویا نقش کیے گئے ہاتھ سے مصافحہ کر رہے ہوں گے اور مقصد بھی یہی ہے کہ آپ اس ہاتھ سے مصافحہ کریں۔

یہ نقش چین کی عظیم المرتبت ادیب باجن (Bajin) کا ہے۔ باجن چینی ادیبوں کی سب سے بڑی تنظیم چائنیز رائٹرز ایسوسی ایشن کا تاحیات سربراہ ہے۔ باجن کا پورا نام لی یاؤ تانگ ہے۔ وہ 25 نومبر 1904ء کو پیدا ہوا (باجن قلمی نام تھا) اسے جدید چینی ادب کا معمار قرار دینا غلط نہ ہوگا۔ اس

نے ناول، افسانے اور مضامین قلم بند کیے۔ دانتے اور روسی ادیب پوشکن کے تراجم بھی کیے۔ 20 ناول، 70 سے زائد افسانے اور لاتعداد مضامین کے علاوہ بچوں کے لیے کہانیاں بھی لکھیں۔ اس کی کتابوں کے دنیا کی متعدد زبانوں میں تراجم کیے جا چکے ہیں۔ اس نے قلمی اور عملی ہر دو لحاظ سے بڑی بھرپور زندگی گزاری۔ وہ اس وقت حیات ہے اور چینی ادیبوں میں اسے باپ جیسا رتبہ حاصل ہے۔ اس لیے اگر ادیبوں کے قومی عجائب گھر کے مرکزی دروازے پر اس کے ہاتھ کا نقش کندہ کیا گیا تو مقام تعجب نہ ہونا چاہیے، وہ اسی عزت کا مستحق تھا کہ اسے اہل قلم کا ضمیر اور دانش و تخلیق کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ باجن پارکنسن کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا (یہ وہی بیماری ہے جس نے عظیم باکسر محمد علی کو بے دست و پا کر دیا) اس وقت وہ شنگھائی کے ایک ہسپتال میں زندگی کے دن گزار رہا ہے۔

25 نومبر 2004ء کو ہم چین میں تھے۔ اخبارات کے ذریعے علم ہوا کہ اس کے چاہنے والوں اور عقیدت مندوں نے گل دستوں اور تہنیتی کارڈز سے اس کا کمرہ باہر کے برآمدے تک بھر دیا۔ وہ زندگی کی صدی مکمل کر چکا تھا۔

مرکزی دروازے پر پتھر پر باجن کا یہ قول تحریر کیا گیا ہے:

> ”ہم کتنے قیمتی ادبی خزانے کے مالک ہیں، کتنے ہی اہل قلم نے اپنے شاہکار چھوڑے جو ہمارے لیے نہ صرف باعث تقویت ہیں بلکہ ہمت افزا بھی ہیں۔ تخلیقات کے یہ شاہکار ہمیں زیادہ نرم دل، خالص اور دوسروں کے لیے زیادہ مددگار بھی بناتے ہیں۔“

یہ ہیں خیالات اس باجن کے جو اب زندہ لیجنڈ میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اب ذرا تضاد کے طور پر اپنے ادیبوں اور ان سے روا رکھے گئے طرز عمل کا موازنہ بھی کر لیجیے۔ ہم نے زندہ تخلیق کاروں، سینئرز اور معروف شخصیات کے ساتھ کیا حسن سلوک کیا۔ ماشاءاللہ ہم باہمی نفاق، دشنام طرازی، بہتان بازی، حسد، بغض اور سازشوں میں نہ صرف خود کفیل ہیں بلکہ قلم و عمل سے ہم انہیں فنون لطیفہ کی سطح پر لے آئے ہیں۔ ”دشنامی دبستان“ ماضی میں نہ تھا، آج کی ایجاد ہے۔

اگر ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں میں نظریاتی اختلافات ہوں تو یہ اچھی بات کہ مباحث سے مسائل کی گرہیں کھلتی اور نظریات کا تجزیہ ہوتا ہے لیکن اہل قلم تو انا کے غبار میں اڑتے ہیں، اڑتے کیا، انائی غبارے ہی بن چکے ہیں، اسی لیے کردار کشی مقبول مشغلہ قرار پایا تو استعارہ سازی کی جگہ تہمت سازی نے لے لی۔

علامہ اقبال کو چھوڑیے کہ وہ تو نظریہ پاکستان کے خالق ہیں اس لیے ان کی جتنی بھی تکریم

ہو، کم ہے۔ دراصل ہم بنیادی طور پر مجاور ہیں، ہم زندہ کی قدر نہیں کر سکتے۔ ہمیں تو آنسوؤں کی چادر چڑھانے کے لیے ایک قبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہی احمد ندیم قاسمی والی بات:

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

چینی اہل قلم کے ساتھ چند لمحات

ہم جس شہر میں جاتے وہاں کی ادیبوں کی انجمن کے اراکین سے باہمی دلچسپی کے امور پر گفتگو ہوتی۔ باہمی دلچسپی کا مطلب ہے ادبی صورتحال اور تخلیق سے وابستہ مسائل۔

مجھے یہ جان کر مریضانہ مسرت ہوئی کہ ہماری مانند وہاں بھی سنجیدہ ادب کا برا حال ہے جبکہ فلمی جرائد، تفریحی ادب، کیسٹس وغیرہ پسندیدہ ہیں۔

چین میں چھوٹی بڑی زبانوں کی تعداد 56 ہے۔ چین جیسے وسیع ملک میں اتنی زیادہ زبانوں کا عملی طور پر موجود ہونا تعجب خیز نہ ہونا چاہیے۔ بڑی بات یہ ہے کہ سب میں تخلیقی کام ہو رہا ہے لیکن معیاری زبان وہی ہے جو سرکاری طور پر استعمال ہوتی ہے اور اس میں تخلیق کردہ ادب کو مرکزی اہمیت حاصل ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ علاقائی یا مقامی زبانوں/ بولیوں کی اہمیت نہیں۔ سب زبانوں کا ادب ادب کے مرکزی دھارے کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ چین میں اب بھی بعض قدیم بولیاں زندہ ہیں لیکن وقت بتدریج ان بولیوں کو ختم کرتا جا رہا ہے۔ گزشتہ دنوں ایک خبر پڑھی کہ ایک معمر خاتون کے انتقال کے باعث چین کی ایک پانچ سو سالہ قدیم بولی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ اسے بولنے والی وہ خاتون ہی باقی بچی تھی۔

چھوٹی بولیوں کے خاتمے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ دور افتادہ اور پس ماندہ خطوں کے لوگ تلاش روزگار کے لیے بڑے شہروں کا رخ اختیار کرتے اور آباد ہو جاتے ہیں۔ یوں وطن کی مانند وہاں کی بولی سے بھی رابطہ منقطع ہو جاتا ہے۔ خود ہمارے ملک میں بھی یہی ہو رہا ہے اور دور افتادہ خطوں اور علاقوں کی بولیاں جاننے والوں کی تعداد میں بتدریج کمی ہو رہی ہے اور کون جانے اس وقت تک کتنی بولیاں معدوم ہو چکی ہوں گی۔

چینی زبان میں تقریباً سو ادبی جریدے طبع ہوتے ہیں جن میں سے 75 فیصد کا تو برا حال ہے اور وہ ششتم پشتم اپنا گزارہ کرتے ہیں، صرف بقیہ جرائد ہیں جو ٹھیک ٹھاک کاروبار کر لیتے ہیں۔

ادبی کتب کے مقابلے میں سائنسی اور علمی موضوعات پر کتابیں زیادہ بکتی ہیں۔ شعراء مجموعہ

کلام چھپوانے کے بجائے انٹرنیٹ پر کلام پیش کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں مشاعرے میں شاعر اپنی بھونڈی آواز اور پھٹے ڈھول جیسے گلے کے باوجود لہک لہک کر ترنم سے اشعار سناتا ہے مگر وہاں پیشہ ور صداکار یا اداکار شاعر کا کلام سناتا ہے اور مجھے یہ اچھا لگا، اس لیے کہ ہر شاعر انور مسعود نہیں ہوتا۔ اگر اکثریت نہیں تو کم از کم بیشتر شعراء فیض احمد فیض کی طرح شعر پڑھتے ہیں جن کے بارے میں مشتاق احمد یوسفی نے کہا تھا کہ فیض صاحب اپنا کلام ایسے سناتے ہیں جیسے دشمن کا کلام سنا رہے ہوں۔

تینوں شہروں کے ادیبوں سے گفتگو کا حاصل یہ تھا کہ قلم کے ذریعے سے روزی کمانا بے حد مشکل ہے۔ بالخصوص اس ادیب کے لیے جو تخلیقی کام کرتا ہو۔ ہاں! فلم، ٹیلی ویژن اور پاپولر میگزین کے لیے قلم کاری کرنے والے ٹھیک ٹھاک کما لیتے ہیں مگر خالص ادب تخلیق کرنے والے ادیب کو اتنی رائلٹی نہیں ملتی کہ وہ قلم اور تخلیق سے زندگی بسر کر سکے، لہٰذا پیسہ کمانے کے لیے اسے قلم کاری کے ساتھ ساتھ کوئی اور کام بھی کرنا پڑتا ہے۔ صرف سرکار کا ملازم اور تنخواہ دار ادیب بجز تخلیق اور کچھ نہیں کرتا۔

سوشلسٹ نظام میں ہر چیز حکومت کی زیر نگرانی ہوتی ہے اور ادب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ روس میں (بالخصوص سٹالن کے عہد میں) ادیب، دانشور، صحافی اور اہل قلم جبر کا شکار تھے۔ اشاعت سے قبل مسودات سرکاری طور پر منظور کیے جاتے یا پھر سنسر کیے جاتے اور عدم مفاہمت کے قائل اہل قلم کا مختلف طریقوں سے حقہ پانی بند کیا جاتا۔ سولزے نستن جلاوطن ہوا، بورس پاسترنک ڈاکٹر ژواگو پر نوبیل پرائز لینے کے لیے نہ جا سکا۔

ماضی کا علم نہیں مگر آج کا چین اور چینی ادیب خاصہ آزاد ہے۔ اس پر حکومت کی جانب سے ناروا پابندیاں عائد نہیں کی گئیں۔ چینی ادیبوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ سرکاری ادیب اور غیر سرکاری ادیب۔ سرکاری ادیب حکومت کا باقاعدہ ملازم ہوتا ہے اور یونیورسٹی پروفیسر کے مساوی تنخواہ پاتا ہے۔ یہ اور کچھ نہیں کرتا، گھر بیٹھ کر تخلیقی کام کرتا ہے۔

اس ضمن میں وثوق سے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کتنا آزاد ہے اور اس کا قلم کتنا پابند لیکن نمک حلالی تو بہر حال لازم ہو ہی جاتی ہے۔ ویسی ہی نمک حلالی جس کی توقع ہمارے محبوب آمر ضیاء الحق نے اہل قلم سے رکھی تھی۔

آپس کی بات ہے، ہمارے ہاں بھی سرکاری ادیبوں، مراعات یافتہ ادیبوں اور نمک حلال ادیبوں کی کمی نہیں، اس فقرہ پر اعتراض ہو تو اسے یوں لکھ دیتا ہوں۔ ... ادیبوں کی اکثریت نہیں!

ملاقات کا طریقہ کار یہ تھا کہ سلام دعا اور ادب آداب کے بعد مشتاق احمد یوسفی صاحب اراکین وفد کا تعارف کراتے جواب آں غزل کے طور پر ادھر سے بھی تعارف کرایا جاتا

اور پھر سوال و جواب۔

ژنگ ژو (Zhengzhou) جنوب میں ہے اور حنان صوبہ (Henan Province) کا قدیم اور تاریخی شہر ہے۔ وہاں ایک پروفیسر خاتون ملی جس نے یہ کہہ کر گفتگو کا آغاز کیا کہ میں کیوں کہ عورت ہوں اس لیے مجھے یہ جاننے میں زیادہ دلچسپی ہے کہ پاکستان میں شاعرات کیا سوچتی اور لکھتی ہیں۔ نیز یہ کہ تخلیق کے سلسلے میں کیا ان پر حدود و قیود عائد ہیں؟

سب نے میری طرف یوں دیکھا گویا میں لیڈی ڈاکٹر ہوں۔ بہر حال میں نے اس ضمن میں مفصل گفتگو کی اور شاعرات کی سوچ، ان کے فن اور شخصیت پر روشنی ڈالی اور یہ بتایا کہ معاشرے یا حکومت کی طرف سے کسی شاعرہ کی سوچ پر نہ تو پہرے بٹھائے گئے ہیں اور نہ ہی اور طرح کی پابندیاں ہیں۔

اگرچہ ادیبوں سے یہ ملاقاتیں بڑے سنجیدہ ماحول میں ہوتی تھیں مگر یوسفی صاحب بعض اوقات یہاں بھی ایسا فقرہ کہہ جاتے کہ محفل زعفران زار بن جاتی۔ بیجنگ میں میرا تعارف کراتے ہوئے کہا ''سلیم اختر بہت بڑا نقاد ہے اور کیونکہ یہ نقاد ہے اس لیے ہم سب اس سے ڈرتے ہیں اور اسی لیے اس سے بنا کر رکھتے ہیں۔''

چینی ادیبوں نے مجھ عجوبہ کو پہلی مرتبہ نئی دلچسپی سے دیکھا اور پھر سوالات کی بوچھاڑ۔ تنقید کیسے لکھتے ہو؟ سچ لکھنے کی وجہ سے ادیبوں سے لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں؟ نقاد ہونے کے باوجود بھی کیا تم پسندیدہ شخصیت ہو؟ وغیرہ وغیرہ لیکن سب سے دلچسپ سوال یہ تھا: ''اگر تمہارے دوست کی بری کتاب پر تم نے لکھنا ہو تو کیا اس کا لحاظ کرو گے یا سچ سچ لکھ دو گے؟''

میں نے جو جوابات دیئے ان میں تعلّی کا پہلو نکلتا ہے اسی لیے میں انہیں سنسر کر رہا ہوں تاہم اس امر پر یقیناً زور دوں گا کہ ہماری مانند وہاں بھی نقاد کوئی خاص پسندیدہ یا محبوب شخصیت نہیں اور وہاں بھی مدح و مذمت کے ڈنگل سجتے ہیں۔ سب سے زیادہ خوشی یہ جان کر ہوئی کہ وہاں بھی ادیبوں میں گروہ بندی اور گروہ پسندی ہے، لہٰذا ناقدین اپنے ہی گروہ کے ادیبوں کی توصیف کرے گا۔ محفل کی سنجیدہ فضا مانع رہی ورنہ یہ پوچھتا، کیا آپ کے ہاں بھی دشنامی دبستان ہوتا ہے۔

ان ملاقاتوں کے سلسلے میں عرض کر دوں کہ صرف پانچ سات سرکردہ ادیب ہوتے تھے، ماحول سادہ اور پھر آخر میں سب کے لیے تحائف۔

بیجنگ میں ہمیں بہت خوبصورت عورت کا سفید (نیوڈ) مجسمہ دیا گیا جسے سیاہ کپڑے میں نہایت نفاست سے پیک کیا گیا تھا۔ جس ڈبہ میں مجسمہ پیک تھا اس پر لکھا تھا ''کیوپڈ کے باغ میں سائیکی''۔

یہ بے حد خوبصورت مجسمہ دیکھا تو سوچا کہ یہ مجسمہ ماؤ کے ثقافتی انقلاب کے برعکس تو ہے ہی لیکن یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ سائیکی کا چینی اساطیر سے کوئی تعلق نہیں۔ سائیکی قدیم یونانی اساطیر کی سب سے دلکش دیوی ہے، کیوپڈ کی بیوی اور (حسن کی دیوی) افیروڈیٹ کی بہو۔ سائیکی کا مطلب روح اور نفس ہے جبکہ کردار و عمل کے لحاظ سے دیگر کرپٹ دیویوں کے مقابلے میں سائیکی بے داغ کردار کی مالک اور وفا کی علامت قرار دی جاتی ہے۔

جب میں نے انہیں یہ بتایا کہ میری ایک بیٹی کا نام بھی سائیکی ہے تو چینی ادیبوں نے مجھے نئی دلچسپی سے دیکھا کہ پاکستانی مسلمان ایسا نام بھی رکھ سکتا ہے۔

جہانِ مرغ و ماہی

چین جانے سے پہلے ہی چینی کھانوں میں تنوع کی کثرت کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا لیکن جب تک چین جا کر چینیوں کے ساتھ بیٹھ کر ان کے کھانے نہ کھائے جائیں چینی کھانوں کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم اپنے ہاں کے چینی ریستورانوں میں چینی کھانوں کے نام پر جو کچھ کھاتے ہیں اس کا چین کے کھانوں سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ ہاں اس کا امکان ہے کہ آج سے سو ڈیڑھ سو برس قبل جو چینی خاندان یہاں آباد ہو گئے اور جن کی نسلیں یہ ریستوران چلا رہی ہیں شاید اس زمانے میں ایسے ہی کھانے ہوتے ہوں مگر آج کے چین کے کھانے تو کسی اور ہی سیارے کے معلوم ہوتے ہیں۔

ہمارے میزبانوں کو علم تھا کہ ہم (عمل کے نہ سہی مگر کھانے پینے کی حد تک) مسلمان ہیں لہٰذا انہوں نے بیجنگ اور شنگھائی میں بطور خاص ایسے ریستوران تلاش کیے جن کے مالک مسلمان تھے۔ یوں ذبیحہ گوشت کا مسئلہ حل ہو گیا لیکن ذبیحہ سے زیادہ اہم مسئلہ مینڈک کا تھا۔ یہ سب جانتے ہیں کہ مینڈک چینیوں کا من بھاتا کھاجا ہے سو میزبانوں نے اسے بھی ہماری نظروں سے دور ہی رکھا۔ اتنا تو میں بھی وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی ڈش سے بھی کوئی مینڈک پھدک کر ہماری گود میں نہ آ گرا۔ البتہ ایک پر تکلف عشائیے کے بعد مشتاق احمد یوسفی صاحب نے یہ کہہ کر ہم سب کے معدوں میں گویا گرہیں ڈال دیں۔

''جس ڈش کو آپ سب نے مزے لے لے کر کھایا تھا میرا خیال ہے وہ مینڈک تھا۔''

اب سب نے اپنے اپنے طور پر اندازے لگانا شروع کر دیئے کہ کون سی ایسی نامبارک ڈش

تھی جس میں مینڈک آسودہ ہو گا۔

''بتایئے نا! یوسفی صاحب! کون سی ڈش تھی۔''

مگر ان کے لبوں پر شریر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

''آپ نے ہمیں اسی وقت کیوں نہ ٹوکا جب ہم کھا رہے تھے۔''

''آپ سب لوگ خوش ہو کر کھا رہے تھے تو مجھے آپ کا مزا کرکرا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔''

اور اب وہ مزا کرکرا کر رہے تھے اور صورتحال سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

تب میں نے ساتھیوں کو کراچی کا واقعہ سنایا۔

مشفق خواجہ مرحوم سے میرے کتنے مخلصانہ تعلقات تھے بہت کم لوگوں کو اس کا اندازہ ہو گا۔ سال میں کم از کم ایک مرتبہ کراچی ضرور جانا ہوتا تھا۔ خواجہ صاحب ایک دن میرے لیے مخصوص کرتے، گاڑی لے کر آ جاتے، مجھے گھر سے لیتے، سارا دن ساحل پر گزارتے، دوپہر کا کھانا قریبی ریستوران میں، پھر شام کی چائے اور رات گئے مجھے گھر چھوڑ جاتے۔

دوپہر کے کھانے پر دو چار احباب کو بھی مدعو کر لیتے، بالعموم عالی جی اور یوسفی صاحب ضرور ہوتے۔

ایک سال میں شادیوں کے سلسلے میں آیا تھا اور بریانی، قورمہ، گوشت، کباب وغیرہ کھا کھا کر جی اوبھ گیا تھا چنانچہ جب مینو آیا تو میں نے کہا کہ یہ سب تو کھا کھا کر اکتا چکا ہوں، میں تو مغز لوں گا۔ یوسفی صاحب کے علاوہ سب نے مغز ہی کھانا پسند کیا۔ مغز بہت مزیدار تھا اور سب شکم سیر ہوئے۔ جب کھا پی کر ڈکار مار کر فارغ ہو گئے تو یوسفی صاحب گویا ہوئے۔

''صاحبو! آپ کو پتہ نہیں کہ برطانیہ میں مغز کھانا ممنوع ہے۔''

اس کے بعد انہوں نے مغز کے وہ طبی نقصانات گنوائے اور نفسیاتی ضرر رسانیوں پر ایسی معلوماتی گفتگو کی کہ ہم نے خود کو ''میڈ کاؤ'' محسوس کرنا شروع کر دیا۔

مشتاق احمد یوسفی کی رگِ ظرافت نے ہمیں یوں نکو بنایا، وہ مسلسل مسرور ہو رہے تھے۔

اب یوسفی صاحب کا ذکر ہوا تو ایک مزے دار بات بھی سن لیں۔ بعض اوقات معمولی سی بات سے عجب مضحکہ خیز صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہوا یہ کہ جب کپڑے پہن کر کوسٹر میں بیٹھ گیا تو معلوم ہوا کہ میری پینٹ کی زِپ ٹوٹ چکی ہے، لہٰذا پینٹ کے آگے یوں ہاتھ رکھتا کہ کسی کو ٹوٹی زِپ کا اندازہ نہ ہو سکے۔ یوسفی صاحب نے اسے نوٹ کیا تو شاہ محمد مری سے پوچھا، یہ سلیم اختر ہاتھوں کو غلط جگہ پر کیوں

باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے؟ شاہ محمد مری نے زِپ کا بتایا تو ہنس کر بولے:

''میری طرف سے یہ فقرہ لکھ لو کہ سلیم اختر نے کھلی آنکھوں اور کھلی زِپ سے چین کی سیر کی۔''

جہاں تک چینی ریستورانوں، وہاں کے کھانوں، کھانے والوں اور کھلانے والیوں کا تعلق ہے تو اس ضمن میں یہی کہا جا سکتا ہے:

اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تصور سے فزوں تر ہے وہ نظارہ

لہٰذا پیارے قارئین! میری انگلی پکڑ کر میرے ساتھ چلیے اور چشم تصور سے کام لیتے ہوئے منظر کو دیکھنے کی کوشش کیجیے۔

آپ ریستوراں میں داخل ہوتے ہیں تو سرخ یا سنہری رنگ کے روایتی لباس میں پری جمال لڑکیاں تقریباً کورنش بجالانے کے انداز میں جھک کر آپ کا خیر مقدم کرتی ہیں۔ آپ کی رہنمائی کرتے ہوئے ایک لڑکی آپ کو وسیع کمرے میں لے آتی ہے جسے روایتی چینی انداز میں سجایا گیا ہے۔

ایک بڑی گول میز ہے جس پر بارہ یا اس سے زیادہ مہمان کھانا کھا سکتے ہیں۔ آپ کے بیٹھتے ہی آپ کے سامنے نیم گرم پانی کی کیتلی (جس میں چند پتیاں قہوہ کی ہوتی ہیں) اور قہوہ پینے والی چھوٹی سی پیالی جیسی پشاور میں استعمال ہوتی ہے، رکھ دی جاتی ہے۔ (یاد رہے کہ پشاور کی چھوٹی پیالی بھی میڈ اِن چائنا ہے) چینی تمام دن نیم گرم پانی سے گھونٹ گھونٹ پیتے ہیں (شاید اسی لیے ان کے معدے خراب نہیں ہوتے) اس کے بعد کھانا کھانے کے لیے Chop Sticks سجا دی جاتی ہیں۔ یہ چاپ سٹکس اتنی خوبصورت ہوتی ہیں کہ آپ انہیں ڈیکوریشن پیس کا نام دے سکتے ہیں۔ غالباً ہر نو وارد کھانے کی میز پر بیٹھ کر چاپ سٹکس کھانے کا تجربہ کرتا ہے، ہم نے بھی کیا اور فوراً ہی ناکامی کا اعتراف کر لیا۔

ایک سٹک کو دائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے دبائے رکھتے ہیں جبکہ انگلیوں کی مدد سے دوسری سٹک کو کام میں لاتے ہیں جو ہمارے لیے مشکل اور صبر آزما کام تھا مگر چینیوں کے لیے ایسا تھا، گویا ہاتھ سے کھانا کھانا بلکہ زیادہ بہتر تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ چاپ سٹکس کو دست دراز نہیں بلکہ دراز دستی سمجھا جا سکتا ہے جس سے وہ پلیٹ میں سے چاول کا آخری دانہ یا خوراک کا ذرہ بھی اُچک سکتا ہے۔

تمام چینی ریستورانوں میں لڑکیاں ہی کھانا سَرو کرتی ہیں۔ نہیں! سَرو درست لفظ نہیں، کھانا کھلاتی ہیں، وہ اس والہانہ پن سے کھانا کھلاتی ہیں کہ ان کا بس نہیں چلتا ورنہ نوالے بنا بنا کر منہ میں

ڈالتی جائیں۔ کم از کم دو تین لڑکیاں ایک میز کے لیے مخصوص ہوتی ہیں۔ بے حد مستعد! سمارٹ یونیفارم یا روایتی لباس میں! بہر حال ہر لباس میں ہوش ربا اور اشتہا افزا، جس طرح اپنی ''اُن'' کو دیکھ کر غالب کے ''منہ پر رونق'' آ جاتی تھی اسی طرح انہیں دیکھ کر دل میں جو جذبات موجزن ہوتے، وہ معدے پر براہ راست اثر انداز ہوتے جس کے نتیجے میں کھانے زیادہ کھائے اور جس کے باعث بل میں بے تحاشا اضافہ ہو جاتا ہوگا۔

کیا آپ یقین کریں گے کہ ایک وقت کا کھانا دو تین درجن کورسز پر مشتمل ہوتا ہے۔

گول میز کے وسط میں لکڑی کا گول ''تھال'' ہے۔ آپ اسے ''گردشی چاک'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس پر ڈشیں رکھتے جاتے ہیں، گردشی چاک ہر ڈش آپ کے سامنے لاتا جاتا ہے۔ یوں بلا کسی کوشش کے مطلوبہ ڈشیں خود بخود آپ کے پاس پہنچتی رہتی ہیں۔ جیسے ہی چکر مکمل ہوا نئی ڈشیں ان کی جگہ لے لیں گی حتیٰ کہ دو تین گھنٹوں میں دو تین درجن ڈشیں سرو کر دی جائیں گی۔

چینی کھانے کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ جلد جلد کھانا کھا کر ختم کرنا ان کے مزاج کا خاصہ نہیں، اس دوران باتیں بھی ہوتی جاتیں، سگریٹ بھی پیے جاتے اور مشروبات بھی۔ ہماری وجہ سے میز پر شراب نہ آنے پائی، شراب تو خیر شراب ہے ٹھنڈا پانی بھی نہ آنے پاتا۔ یہ جملہ معترضہ نہیں، حقیقت ہے۔

چین میں ٹھنڈا پانی متروک ہے۔ وہ تمام دن نیم گرم پانی سے بھری کیتلی میں سے گھونٹ گھونٹ پیتے رہتے ہیں۔ یوں معدے کو معتدل رکھتے اور پُرخوری کے نتائج بد سے بچے رہتے ہیں۔ مجھے باقی ساتھیوں کا تو علم نہیں مگر میں تو سردیوں میں بھی فریج کا یخ پانی پیتا ہوں۔ سردیوں میں جب واٹر کولر اٹھا دیا جاتا ہے تو میں اپنے لیے پانی کی بوتل فریج میں رکھتا ہوں۔

میں نے پہلے دن کے کھانے میں فریج کا ٹھنڈا پانی مانگا تو وہ پریشان ہو گئے۔ نیم گرم پانی پینے والوں کے لیے بیجنگ کی بیلو زیرو سردی میں فریج کا پانی تو آب حرام کے مترادف تھا، لہٰذا میں نے پانی کی جگہ کولڈ ڈرنکس لینے شروع کر دیئے۔

ایک ضیافت میں سفید مشروب نظر آیا۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہ لسّی ہے، سوچا لاؤ چینی لسّی کا ذائقہ بھی چکھ لیں۔ یہ چینی لسّی قدرے ترش مگر خوش ذائقہ تھی، سو اس سے میں نے پورا انصاف کیا۔

ہمارے میزبان بطور خاص اس کا التزام کرتے کہ ہم مغالطے میں ایسی ویسی چیز نہ کھا بیٹھیں۔ اس کے علاوہ بھی احتیاطاً ہم سے پوچھ لیتے:

''گھوڑا چلے گا؟'' (تانگے کے آگے!)

''خرگوش پسند ہے؟'' (جھاڑیوں میں دوڑتا ہوا)

''گلہری کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' (درختوں کی جڑ میں اچھلتی اچھی لگتی ہے)

لیکن انکار سے ہم خسارے میں نہ رہتے چنانچہ اگر ایک طرف مچھلی کی مختلف اقسام تو دوسری جانب مرغابی اور طرح طرح کی سبزیاں۔ ایسی سبزیاں جن سے ہم نا آشنا تھے۔ سوپ کے پیالے میں چوکور سفید ٹکڑے تیر رہے تھے۔ میں نے لیا تو اچھا لگا۔ پوچھا:

''یہ پنیر ہے؟''

جواب ملا کہ یہ بانس کے گودے سے تیار کی گئی ہے۔

ایسے اچھنبے کا اپنا مزا ہوتا ہے۔ ایسا ہی اچھنبا اس وقت ہوا جب بیجنگ کے مسلم ریستوران نے ''سجی'' کھلائی جو کہ اعلیٰ معیار کی تھی۔ ساتھ تھے نان، جنہیں وہ بھی نان ہی کہتے ہیں، تِلوں سے بھرے خستہ اور براؤن نان ہمارے نانوں سے زیادہ لذیذ تھے۔

وہاں مچھلی دم اور سر سمیت پکائی جاتی ہے۔ ضیافت کے سب سے اہم یا محترم رکن کی جانب مچھلی کا سر کیا جاتا ہے اور وہی اس سے پہلا نوالہ توڑتا ہے۔ ظاہر ہے مچھی کا سر، یوسفی صاحب کے نیلے سوٹ کے سامنے ہی جھکتا تھا۔ متعدد اقسام کی مچھلیاں کھائیں مگر جیسی مزیدار میٹھی مچھلی کھائی اتنی لذیذ اور نفیس ذائقہ والی مچھلی کہیں کھانے کو نہ ملی۔ تیز مصالحہ میں تلی جانے والی مچھلی کا مٹھاس سے کیا تعلق؟ لیکن چینیوں نے یہاں بھی جدت کا ثبوت دیا۔

جدت کا ایک اور مظاہرہ شنگھائی کے اس ریستوران میں ہوا جس کی شہرت اس ڈش پر تھی جسے ان کی زبان میں "Hot Pot" کہہ سکتے ہیں۔ آپ کی میز پر (گیس کا) چھوٹا سا چولہا۔ دھات کی ٹرے، خوردنی تیل، آلو اور چھری وغیرہ دے دی جاتی ہے۔ گاہک چولہا جلا کر اس پر ٹرے رکھ کر اس پر چمکیلا ایلومینیم فوئل پھیلا دیتا ہے۔ پھر اس پر وہ حسب ضرورت تیل ڈال کر گرم کرتا ہے۔ آپ کو فریز کیا ہوا بغیر ہڈی کا (بڑا) گوشت ملتا ہے۔ آپ کاغذ جیسے باریک قتلے کاٹ کر ٹرے میں ڈال کر فرائی کرتے ہیں، ساتھ ہی باریک کٹے ہوئے آلو بھی، پھر دھیمی آنچ پر آہستہ آہستہ گوشت پکتا جاتا ہے اور میرے خیال میں اس کی سوندھی سوندھی اشتہا انگیز مہک ہی کافی ثابت ہوتی ہوگی، گوشت چبانے کی ضرورت ہی نہیں۔

شوقین چینی تو خود ہی پکا کر کھاتے ہیں لیکن ہم ٹھہرے اناڑی سیّاں، سو ہمارے لیے سارا کام ایک ویٹر نے کیا۔ میں نے ہال میں نگاہ دوڑائی تو ہال کی تمام میزوں کو بھرا پایا۔

کیا آپ یقین کریں گے کہ سویٹ ڈش چینیوں کی خوراک کا حصہ نہیں۔ ہمارے ہاں ہر نوع

کے کھانے کا اختتام میٹھے پر لازم ہے بلکہ ختم، نیاز اور مذہبی رسوم کے لیے بھی میٹھا لازم ہے مگر وہاں کھانے کا اختتام میٹھے کے برعکس پھلوں پر ہوگا اور پھلوں میں بھی تربوز ان کا پسندیدہ محسوس ہوا۔ پھل تو پھل ہی ہوتا ہے مگر جس سلیقے اور فنکارانہ انداز سے وہ پھلوں کو کاٹتے ہیں اس سے وہ پھل کی بجائے ڈیکوریشن پیسز میں تبدیل ہو جاتے۔ پھلوں سے رغبت کا اندازہ ناشتوں پر بھی ہوا، انہوں نے سالم خوبانی چھیل کر یوں سجائی تھی کہ ٹُک دیکھتے رہو کا سماں پیدا ہو جاتا۔

ایک اور عجیب بات۔ چینی چائے نہیں پیتے، لطیفہ یہ ہے کہ دنیا کو چائے چین سے ملی جسے چین میں پنجابی تلفظ کے مطابق ''چا'' کہتے ہیں۔ بچپن میں چائے کے بارے میں ایک دلچسپ کہانی پڑھی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ کیسے چائے عالم وجود میں آئی۔ ایک مرد نیک اطوار دن رات عبادت میں مشغول رہنے کا خواہاں تھا دن تو گزر جاتا مگر تمام تر کوششوں کے باوجود رات کو نیند غلبہ پا لیتی، تنگ آ کر اس نے اپنی دونوں آنکھوں کے پپوٹے ہی کاٹ کر پھینک دیئے، جہاں پپوٹے گرے وہاں ایک پودا اُگ آیا جس کی پتیاں آنکھ کے پپوٹوں سے مشابہت رکھتی ہیں، یہ تحفہ تھا اس عبادت گزار کے لیے کہ وہ اس پودے کی پتیوں کو اُبال کر پیے اور نیند سے دور رہے۔

چین سے چائے برطانیہ گئی اور پھر برطانوی تاجروں نے چائے کو برصغیر میں متعارف اور مقبول بنایا۔ انہوں نے تو چائے ترک کر دی مگر ہم اس کے عادی ہو چکے ہیں۔ وہ چائے کی جگہ قہوہ پیتے ہیں البتہ وہ ''وائٹ جیسمن'' پینے کو نہ ملے جسے ابوالکلام آزاد نے ''غبارِ خاطر'' میں زندہ جاوید بنا دیا۔

دنیا بھر کے لوگ اپنے اپنے کلچر کے مطابق کھاتے ہیں لیکن چینیوں کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے کھانے کو بھی کلچر میں تبدیل کر دیا، اس لیے جلد جلد کھا کر، گویا کھانے سے گلوخلاصی کا وہاں تصور نہیں، نہایت سکون سے خوشگوار باتوں کے درمیان ڈشیں آتی رہتی ہیں، اب اس ماحول سے تضاد کے طور پر ذرا ''بوفے'' کا تصور کیجیے۔ کیا اس سے زیادہ نامعقول طریقے سے کھانا کھایا جا سکتا ہے؟

آخری دنوں میں ہمیں اس بات کا اس وقت احساس ہوا کہ چینی کھانے کو کتنی اہمیت دیتے ہیں جب ہم نے ان سے کہا کہ کھانے میں بہت وقت ضائع ہو جاتا ہے، لہٰذا ہم برگر لے کر چلتے پھرتے کھا کر وقت بچا کر کچھ شاپنگ کر لیں گے۔

ہمیں جواب ملا ''یہ چینی مہمان نوازی کے اصولوں کے خلاف ہے۔''

اب میں سمجھا کہ چینی موٹے کیوں نہیں، وہ میٹھا یا مٹھائی نہیں کھاتے (یوں نشاستہ اور شوگر سے محفوظ رہتے ہیں) زیادہ تر سبزیاں صرف ابلی ہوئی، گوشت وغیرہ بہت کھاتے ہیں لیکن کم تیل میں پکاتے ہیں (غیر ضروری چکنائی کے مضر اثرات سے محفوظ ہو گئے) ہماری مانند تیز مصالحہ میں بے حد بھنا

ہوا کھانا نہیں، لہٰذا سبزی یا گوشت کے خواص ضائع ہونے کے بجائے محفوظ رہ جاتے ہیں اور سو باتوں کی ایک بات ٹھنڈا پانی نہیں پیتے، نیم گرم پانی نظام ہضم میں اعتدال رکھتا ہے۔

میں معدے کا دائمی مریض ہوں، لہٰذا خود کو یعنی معدے کو درست رکھنے کے لیے مجھے خاصہ محتاط رہنا پڑتا ہے اور باہر جا کر تو میں خوفزدہ بھی رہتا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ویسا نہ ہو جائے۔

اسے صرف چینی کھانوں کا اعجاز سمجھنا چاہیے کہ طرح طرح کے کھانے اور مانوس اور نامانوس ڈشوں سے لذت کام ودہن کے باوجود ایک مرتبہ بھی معدے نے اظہار ناپسندیدگی نہ کیا۔

کیا تمام چینی اسی طرح دو تین درجن کورسز پر مشتمل کھانے دو تین گھنٹوں میں کھاتے ہیں؟

میرا خیال ہے ایسا نہیں، ہم جہاں بھی گئے وہ مہنگے ریستوران تھے اور ایڈوانس بکنگ کے بغیر وہاں میز ہی نہ مل سکتی تھی۔ غالباً ضیافتوں میں ہی ایسا اہتمام ہوتا ہوگا۔ عام چینی تو ابلے چاول کے پیالے اور مچھلی کے سوپ پر گزارا کرتا ہوگا۔ چاولوں سے یاد آیا کہ ہماری باسمتی چین کے چاولوں کے مقابلے میں بہت بہتر ہے۔

واپس آ کر میں نے نیم گرم پانی کا تجربہ کرنا چاہا مگر توبہ کیجیے، ٹھنڈا پانی کہاں چھوڑا جا سکتا ہے:

چھٹتا نہیں ہے منہ کو یہ کافر لگا ہوا۔

......دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے!

جس سفر کا 22 نومبر 2004ء کو آغاز ہوا، وہ 29 نومبر 2004ء کو اختتام پذیر ہوا۔ یہ ہفتہ ایسا گزرا گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا۔

دھول بھرے راستہ پر ایک شخص بیٹھا صدا بلند کر رہا ہے:

''ایک بار دیکھا دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے۔''

لوگ پاس سے گزرتے ہیں، اسے دیکھتے ہیں، صدا سنتے ہیں مگر رک کر کوئی احوال نہیں پوچھتا۔

آج کا دور اپنا حاتم گنوا چکا ہے۔

⌘⌘⌘⌘⌘⌘⌘⌘